

مے ڈے



نگہت سیما

مے، ڈے

گلاب چہروں پہ دھول کتنی مسافروں کی جی ہوئی ہے
چراغ آنکھوں میں جانے کتنے سفر کے جالے تے ہوئے ہیں
نہ چھاؤں جیسی کوئی کہانی نہ جلتی دھوپوں کا کوئی قصہ
کہاں کا ذکر سفر کہ پہلے قدم پہ ہم توڑ کے ہوئے ہیں
”تو تم نے اب کیا سوچا ہے اقتدار“۔

”میں نے کیا سوچنا ہے۔“ اقتدار نے تھکے تھکے انداز میں کہا۔ اور کروٹ بدل لی۔
وہ بان کی کھر در ی چارپائی پر آنکھیں موندے لیٹا تھا۔
”پھر بھی۔ پھر بھی کچھ تو سوچا ہو گا تم نے۔ مسعود بھائی نے تم سے کیا کہا۔“
”کیا کہہ سکتے ہیں وہ۔“ اس نے تلخی سے کہا اور ایک دم اٹھ کر بیٹھ گیا اور پاس
کھڑی بخت آور پر ایک قہر آلود نظر ڈالی۔

”اور کیا کر سکتے ہیں وہ۔ جدھر جاتا ہوں سب دروازے بند ملتے ہیں۔ جیسے میرے
لئے ہی بند کئے گئے ہوں۔“

”مگر مسعود بھائی تو کہہ رہے تھے کہ تم اس جاب کے لئے مناسب ہو اور یہ کہ نوپراہلم جب تمہارا دل چاہے تم آجانا جاب مل جائے گی۔“

”ہاں۔“ وہ تلخی سے ہنسا۔

”جب میں وہ جاب نہیں کرنا چاہتا تھا تو وہ جاب مجھے مل رہی تھی اور جب میں نے خود کو اس بات پر تیار کر لیا تو۔۔۔ پتا نہیں میرے ساتھ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ بخت آور۔ میرے انگلی رکھنے کی دیر تھی کہ حروفِ فال بکھر گئے۔ پتا ہے مسعود بھائی کہہ رہے تھے کہ صرف ایک دن پہلے مجھ سے مایوس ہو کر انہوں نے وہ جاب کسی اور کو دلوادی۔ اپنے مقدر میں تو بس ناکامیاں ہی لکھی ہیں۔“

”تم بہت جلد مایوس ہو جاتے ہو اقتدار۔“

اور پھر جاب تو تمہیں یہاں بھی مل سکتی ہے۔ ماموں کے آفس میں ایک جگہ ہے۔“

”تمہارا کیا خیال ہے بخت آور کہ میں اس لئے اس دنیا میں آیا ہوں کہ میں معمولی نوکریاں کرتا پھروں۔ نہیں بخت بی بی نہیں۔ میرا مقام یہاں نہیں ہے۔ اس چھوٹے سے شہر میں رہ کر میں اپنی منزل نہیں پاسکتا۔ مجھے آگے جانا ہے بخت آور بہت آگے۔“ اس کی آنکھیں جگمگانے لگیں اور ان میں خواب اتر آئے۔ انجانی زمینوں کو سر کرنے کے خواب۔ اور ان خوابوں سے بخت آور کو ہمیشہ ڈر لگتا تھا اُسے لگتا جیسے یہ خواب اُسے اس سے دور لے جائیں گے۔

”یہ جاب جو مجھے مسعود بھائی دلوانا چاہتے تھے یہ تو محض ایک پڑاؤ تھا میرے سفر کا آغاز۔ میں نے تو محض اس لئے ہامی بھر لی تھی کہ ابھی مجھے کچھ وقت چاہئے۔ مجھے ابھی اپنے پلان ترتیب دینے ہیں۔ ابھی۔۔۔“

”نہیں اتنی نہیں۔“ بخت آور نے بے اختیار اس کے بازو پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

”ایسے خواب مت دیکھو اقتدار جو تمہیں مجھ سے دور لے جائیں۔“

”میرے سارے خوابوں میں تم میرے ساتھ ساتھ رہتی ہو۔“ اس کے تنے ہوئے چہرے پر محبت کی نرمی اتر آئی اور آنکھوں کی جگمگاہٹ بڑھ گئی۔

”ایک بات کا یقین رکھنا بخت کہ میں جہاں بھی ہوا جس بلندی پر بھی ہوا تمہاری محبت میرے سنگ ہوگی۔“ مگر یہ کیسی محبت ہے اتنی کہ تم اس محبت سے دامن چھڑا کر بھاگ جانا چاہتے ہو۔“ اس کی آواز بھڑا گئی۔ اور اس کی بھوری آنکھوں میں نمی اتر آئی تو وہ بے قرار سا ہو گیا۔

”بخت۔“ اس نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس ہی بٹھالیا۔

”تم جانتی ہو کہ میں تمہاری آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ سکتا۔ پھر مجھے کیوں آزماتی ہو۔“

”جب تم بڑی بڑی باتیں کرتے ہو تو مجھے ڈر لگتا ہے جیسے تمہارے یہ اونچے خواب میرے اور تمہارے درمیان حائل ہو جائیں گے۔“

”دنیا کی کوئی طاقت میرے اور تمہارے درمیان حائل نہیں ہو سکتی بخت۔“

”اور تمہارے خواب۔“ بخت آور نے معصومیت سے اسے دیکھا۔

”میرے خواب۔“ اس کی آنکھوں میں پھر چراغ جلنے لگے۔ اس نے بخت کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

”میں بہت کچھ کرنا چاہتا ہوں بخت بہت کچھ حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ میں اپنا آپ منوانا چاہتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں لوگ مجھے جان لیں۔ پہچان لیں۔ میں اقتدار احمر کوئی معمولی انسان نہیں ہوں بخت آور لیکن میری بد قسمتی یہ ہے کہ میں ناقدروں میں گھرا ہوا ہوں۔ اس چھوٹے سے قصبے میں رہ کر میری صلاحیتوں کو زنگ لگ رہا ہے۔ میں جب لاہور میں تھا تو پتا ہے میرے پروفیسر ز کہتے تھے مجھے جیسے جینیئس صدیوں بعد پیدا ہوتے ہیں۔ سر ہمدانی کہتے تھے انہوں نے اتنی خوبصورت پوٹری کبھی نہیں پڑھی۔ وہ

میرے ایک ایک لفظ کو دس دس بار پڑھتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ میری شاعری میں شیلے اور کیٹس دونوں کی جھلک ہے اور پھر میرا اپنا رنگ اور ہماری مشرقیت۔۔۔ پر تم۔۔۔ اس نے مایوسی سے سر ہلایا۔

”تم نہیں سمجھو گی۔ کہ میں کیا چاہتا ہوں۔ تم بابا اور اماں سب چاہتے ہیں کہ میں کہیں کسی جگہ کلرک کی جاب کر لوں۔“

اور پھر زیادہ سے زیادہ ہیڈ کلرک تک پہنچ جاؤں۔ مگر یہ سب کچھ میرے لئے نہیں ہے بخت آور میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں لاہور یا کراچی چلا جاؤں اور وہاں رہ کر اپنی شناخت کرواؤں۔ میں ایم۔ اے انگلش لٹریچر ہو کر ایک معمولی آفس میں ایک معمولی کلرک کی جاب نہیں کر سکتا بخت آور۔“

”مگر بابا کہتے ہیں کہ ایسے بہت سے ایم۔ اے بیکار پھر رہے ہیں اور انہیں کلرک کی جاب بھی نہیں ملتی۔ اور یہ تمہاری خوش قسمتی ہے کہ۔۔۔“

”میری خوش قسمتی کیا ہے یہ میں خود بہتر سمجھتا ہوں۔“ وہ پھر تلخ ہونے لگا اور اس کے سانولے رخساروں پر سرخی دوڑنے لگی اور آنکھیں تپ گئیں۔

”تمہیں پتا ہے اقتدار۔“ بخت آور نے نگاہیں جھکائے جھکائے کہا۔

”جب تم لاہور میں پڑھ رہے تھے تو میں، مامی اور ماموں سب تمہارے بنا کتنے اُداس رہتے تھے۔ اور میں کتنی دعائیں مانگتی تھی کہ جلدی سے تمہاری تعلیم ختم ہو اور تم گھر آ جاؤ۔۔۔ اور پھر۔۔۔“

”پھر کیا؟“ اُس کی چپتی ہوئی آنکھوں میں ایک نرم کوئل جذبے نے سر اٹھایا اور اُس کے ہونٹوں پر ایک شوخ مسکراہٹ آ کر ظہر گئی۔

”کہ تمہیں دلہن بنا کر۔۔۔“

”اتی۔“ بخت آور کی پلکیں بوجھل ہو کر جھک گئیں۔

اور اس کے رخسار گلاب رنگ ہو گئے۔

”تم۔۔۔ تم کتنی خوبصورت ہو بخت۔“ اس نے جذبات سے بوجھل آواز میں کہا۔

”اور تمہیں بھی نہیں پتا بخت کہ میں وہاں لاہور میں اکثر تمہیں بہت یاد کرتا تھا اور میرا کتنا دل چاہتا تھا کہ تم میرے ساتھ میرے پاس ہو۔“

”تو پھر تم جانے کی باتیں کیوں کرتے ہو اقتدار۔“

”جانا تو مجھے ہے بخت۔“ وہ کھڑا ہو کر ادھر ادھر ٹہلنے لگا۔ وہ چارپائی پر بیٹھی اسے دیکھتی رہی۔

سانولے رنگ کا خوبصورت آنکھوں اور کشادہ پیشانی والا اس کا ماموں زاد اقتدار امر جو اسے ساری دنیا کے مردوں سے مختلف لگتا تھا۔ اس کی باتیں اس کی سوچ اس کی فکر سب دوسروں سے مختلف تھی۔ وہ بچپن سے ہی بے حد ذہین تھا اور مامی کو اس کی اس بے تحاشا ذہانت سے خوف آتا تھا۔ بہت بچپن میں اپنے بابا کی وفات کے بعد ماموں اسے اور اس کی ماں کو گھر لے آئے تھے اور بچپن میں ہی اسے اقتدار سے منسوب کر دیا تھا۔ تب سے ہی وہ اسے بہت عزیز ہو گیا تھا۔

دونوں میں بچپن سے ہی بہت محبت تھی اور یہ محبت وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتی گئی۔ پھر وہ لاہور پڑھنے کے لئے چلا گیا۔ اور اس کی آنکھیں اور طرح کے خواب دیکھنے لگیں۔ وہ ایک دنیا کو اپنی مٹھی میں کر لینا چاہتا تھا۔

وہ انگلش میں لگتا تھا۔ شاعر تھا ادیب تھا۔

اور چاہتا تھا کہ اپنا آپ تسلیم کروالے۔ لیکن یہ اتنا آسان نہ تھا۔ لوگ اس کی ذہانت کو مانتے تھے اس کی شاعری کی تعریف کرتے تھے لیکن پھر بھی۔۔۔ پھر بھی اسے وہ مقام نہیں مل رہا تھا جو وہ چاہتا تھا۔ اور اس نے اسے کچھ چڑچڑا اور تلخ کر دیا تھا لیکن بخت کے سامنے وہ پکھل جاتا تھا اس کے اندر کی ساری تلخی جھاگ بن کر بہہ جاتی تھی۔

”جانا تو مجھے ہے بخت۔“ وہ ٹپٹلتے ٹپٹلتے رک کر اسے دیکھنے لگا۔
 ”لیکن لوٹ آنے کے لئے۔“ میں کچھ بننا چاہتا ہوں بخت جو یہاں رہ کر ناممکن ہے۔
 اور پھر میں کوئی ملک سے باہر تو نہیں جا رہا۔ میرا ارادہ کراچی جانے کا ہے۔ میں
 نے مسعود بھائی سے بات کی ہے۔

اور انہوں نے کہا ہے کہ مجھے کراچی جا کر ضرور قسمت آزمائی چاہئے۔“
 ”مگر اتی۔“ بخت آور کی آنکھوں میں آنسو جلنے لگے۔

”تم کب تک وہاں رہو گے، کتنے دن؟“

”تم نے مامی سے بات کی۔“

”نہیں۔ میں شاید کسی دن یوں ہی بغیر بتائے چلا جاؤں گا۔ اماں کے آنسو میرے
 پاؤں کی زنجیر بن جاتے ہیں۔ وہ میری بات نہیں سمجھتی ہیں بخت۔ وہ نہیں جانتیں کہ مجھے
 کتنا آگے جانا ہے۔ بہت آگے بخت۔“ اس کی آنکھیں بہت دور تک دیکھ رہی تھیں۔
 ”وہ تو بس چاہتی ہیں کہ میں اب کہیں نہ جاؤں اور یہیں اسی شہر میں بقایا زندگی
 گزار دوں۔“

تم ان کی بات مان کیوں نہیں لیتے اقتدار۔“ بخت نے اپنا ہاتھ اس کے بازو پر رکھ
 دیا اور ملتی نظروں سے اسے دیکھا۔ لمحہ بھر وہ اسے دیکھتا رہا پھر اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔
 ”مت آؤ میرے قریب، وحشت ہوتی ہے مجھے تمہاری قربت سے۔ یہ۔ یہ۔ یہ
 محبتیں میرے پاؤں کی زنجیر نہیں بن سکتیں۔“

وہ اس پر ایک تیز نظر ڈالتا لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا چلا گیا۔ وہ وہیں بیٹھی نم آنکھوں
 سے اسے جاتے دیکھتی رہی اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اقتدار کو کیا ہو گیا ہے۔

پہلے تو وہ ایسا نہ تھا۔ کبھی اس سے اونچی آواز میں بات نہیں کی تھی۔ چھٹیوں میں
 آتا تو واپس جانے کو دل ہی نہیں چاہتا تھا۔ وہ دونوں گھنٹوں بیٹھے باتیں کرتے تھے۔

لہاضی کی یادیں۔ حال کی باتیں اور مستقبل کے خواب۔ وہ کتنی خوبصورت باتیں کرتا تھا۔
 مگر اب جب سے وہ تعلیم ختم کر کے آیا تھا اس کی باتوں میں تلخی بھر گئی تھی۔
 خوبصورت باتیں کرنا تو وہ بھول ہی گیا تھا۔ اسے شکوہ تھا کہ اسے اس کی قابلیت کے
 مطابق کام نہیں مل رہا اور اسے وہ مقام نہیں مل رہا جس کا وہ حق دار ہے۔

بخت کو اس کے رویے سے دکھ ہوتا تھا اور وہ اس کے اونچے خوابوں سے ڈرتی
 تھی۔ ایک انجانا سا خوف اس کے دل کو مٹھی میں جکڑ لیتا اور اسے لگتا جیسے اس کے جسم
 سے جان نکل رہی ہو۔ وہ گھنٹوں ایک ہی جگہ بے طاقتی کے عالم میں بیٹھی رہتی۔ اب
 بھی یوں ہی ہوا تھا۔ اقتدار چلا گیا اور وہ وہاں ہی بیٹھی رہ گئی تھی۔ جیسے کسی نے اس کے
 جسم سے جان نکال لی ہو اور جیسے کوئی انجانا سا خوف اس کے دل کو جکڑے ہوئے ہو۔

مامی نے دو تین بار اسے آواز بھی دی تھی لیکن وہ چپ بیٹھی رہی تھی۔ ابھی دن کا
 سارا کام پڑا تھا وہ تو ناشتہ کر کے اقتدار کو باہر چارپائی پر لیٹے دیکھ کر ادھر آگئی تھی، رات
 وہ دیر سے آیا تھا۔ اس لئے اس کی اقتدار سے بات نہ ہو سکی تھی اور صبح ناشتہ کرتے
 ہوئے کئی بار اس نے اقتدار کو دیکھا تھا۔ خاموش اور الجھا ہوا سا اور جب بابا دفتر چلے گئے
 تو وہ بغیر اس سے کوئی بات کئے صحن میں آکر لیٹ گیا تھا اور وہ بھی اس کے پیچھے ہی چلی
 آئی تھی۔ ابھی برتن کچن میں ایسے ہی پڑے تھے اس نے اٹھنا چاہا لیکن اٹھ نہ سکی۔ تب
 اپنی بے بسی پر اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور وہ گھنٹوں میں منہ چھپا کر رونے لگی۔

”تم زور ہی ہو بخت۔“ اقتدار نے اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے آہستگی
 سے کہا۔ جانے کب وہ واپس آگیا تھا۔ اس نے ہولے سے اس کا ہاتھ اپنے کندھوں
 سے ہٹا دیا اور چہرے کو جھکائے بیٹھی رہی۔

”خفا ہو مجھ سے؟“ وہ اس کے قریب ہی بیٹھ گیا۔

”مجھ سے ناراض نہ ہو اگر وہ بخت۔ میں تمہاری ناراضگی برداشت نہیں کر سکتا،

سوری بخت پتا نہیں اچانک مجھے کیا ہو جاتا ہے۔ میں اتنا غصیلا کیوں ہو گیا ہوں۔“

”تم میرے قریب نہ بیٹھو اقتدار وحشت ہوگی تمہیں اور۔ اور یہ کہ تمہیں جہاں جانا ہے جاؤ میری محبت تمہارے پاؤں کی زنجیر نہیں بنے گی۔“ اس نے اپنا منہ پھیر لیا۔

”نہیں۔“ اقتدار نے تڑپ کر اسے دیکھا۔

”اس طرح مت کہو بخت۔ میں تمہاری محبت کی زنجیر توڑنا نہیں چاہتا۔ بس اتنا چاہتا ہوں کہ تم اس زنجیر کو تھوڑا سا ڈھیلا کر دو تاکہ میں ذرا آگے تک جاسکوں لیکن اس کا سر اپنے ہاتھ میں رکھو۔ کہ مجھے لوٹنا تو ہے نا۔“

”جانے والے لوٹ کر نہیں آیا کرتے۔“ اس نے آہستگی سے کہا اور اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔

”خدا کے لئے۔ ان آنکھوں پر اتنا ظلم نہ کرو۔“ اقتدار نے انگلی کی پوروں سے اس کے آنسو پونچھے۔ ”تمہیں کیا خبر میں ان آنکھوں کو ہمیشہ ہنسا دیکھنا چاہتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ ان آنکھوں میں کبھی کوئی آنسو نہ آئے اور حتیٰ کہ اگر میں مر جاؤں تب بھی۔“

”اقتدار۔“ اس نے تڑپ کر اسے دیکھا۔

”مجھ سے ایسی بات نہ کیا کرو تمہیں پتا ہے میں۔“

”ایسی بات نہ کروں تو کیا کروں بخت۔“ اقتدار نے اس کی بات کاٹ دی۔

”تم مجھ سے خفا ہو، ناراض ہو تو پھر میں جی کر کیا کروں گا۔۔۔“

”میں تم سے ناراض نہیں ہو سکتی ہوں اتنی تم اچھی طرح جانتے ہو۔۔۔“

”اور یہ آنسو یہ موڈ۔“ اقتدار نے اس کی آنکھوں کی طرف اشارہ کیا۔

”تمہیں خود نہیں پتا کہ تم نے کتنی بری طرح میرا ہاتھ جھٹکا تھا اور کہا تھا کہ

”تم۔۔۔“

”سوری سوری۔“ وہ مسکرایا۔

”اب نہیں رونا پلینا۔“ اور وہ مسکرا دی۔

”پتا ہے تم۔۔۔ نہیں تمہاری یہ مسکراہٹ یوں لگ رہا ہے جیسے رم جہم برستے بادلوں میں روشنی کی کوئی کرن پھوٹ پڑی ہو۔ یہ کرن میرے ساتھ ہوگی نا بخت تو تاریک راستوں میں بھی اجالا ہوتا جائے گا اور میں۔۔۔“

”اچھا اب بناؤ نہیں۔“ وہ مسکرا دی اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

”بیٹھو نا کہاں جا رہی ہو۔“

”جناب اقتدار احمر صاحب۔ اتنا کام پڑا ہے۔ ابھی تک صبح کے برتن بھی نہیں دھوئے گئے اور مای دو تین بار آواز دے چکی ہیں۔“

”بخت۔“ اقتدار کی آنکھیں بجھ گئی۔ اس کے چہرے پر وہی اداس سنجیدگی اتر آئی۔

اس نے بخت کے ہاتھوں کو تھام لیا۔

”یہ ہاتھ۔ یہ نرم و نازک اور ملائم ہاتھ اس لئے نہیں بنے ہیں بخت کہ برتن مانجھتے مانجھتے کھرورے ہو جائیں۔ ان خوبصورت ناخنوں میں میل بھر جائے۔ میں۔۔۔ میں چاہتا ہوں بخت کہ تمہارے لئے اتنا کچھ ہو میرے پاس کہ تمہیں برتن نہ دھونے پڑیں۔ آٹا نہ گوند ہنا پڑے۔ کپڑے۔۔۔“

”یہ سب کام۔“ بخت نے اپنے ہاتھ چھڑا لئے۔

”یہ تو زندگی کا حصہ ہیں اقتدار اور میں ان کاموں سے کبھی نہیں تھکتی۔ تم یو نہی پریشان رہتے ہو۔ تم میرے ساتھ ہو گے اقی، تمہاری محبت میری رفیق ہوگی تو مجھے دنیا کی کسی آسائش کی ضرورت نہیں ہوگی۔ میں ہر حال میں تمہارے ساتھ خوش رہوں گی۔“

”مگر میں۔۔۔ میں تو خوش نہیں ہوں گا نا بخت۔“

”کیا میرا ساتھ تمہیں خوشی نہیں دے گا اقی۔“ اس نے حیرت سے اپنی بڑی بڑی

آنکھوں کو پھیلایا۔

”تمہارا ساتھ میری زندگی کی سب سے بڑی خوشی ہے بخت۔“ وہ جذباتی ہو گیا۔
 ”لیکن میں تمہارے سامنے اطلس و کنوَاب کے ڈھیر لگانا چاہتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں تم ایک ملکہ کی طرح۔“
 ”بس بس۔“ وہ ہنس دی۔

”اتنا بہت ہے لیکن اتنی۔“ وہ یکایک سنجیدہ ہو گئی۔

”میں نے کہیں پڑھا تھا کہ جب دولت آ جاتی ہے تو محبت رخصت ہو جاتی ہے۔ اور مجھے ایسی دولت نہیں چاہئے اقتدار تم سمجھتے کیوں نہیں ہو۔ ہم اپنی چھوٹی سی دنیا میں خوش رہیں گے۔ تم جو بھی کما کر لاؤ گے میں اسے بہت احتیاط سے خرچ کروں گی اور۔۔۔ میں تمہیں یقین دلاتی ہوں کہ میں تمہارے کام کرتے ہوئے کبھی نہیں تھکوں گی اور کبھی تم سے شکوہ نہیں کروں گی، بس تم مجھ سے دور نہ جانا۔ مجھے دولت کے ڈھیر میں دفن نہ کرنا۔“

”آل رایت۔“ وہ ہنس دیا۔

”میں تم سے دور نہیں جاؤ گا۔ تم یونہی برتن مانجھتی رہنا مجھے تمہارے یہ کھر درے ہاتھ بھی سنبل سے زیادہ نرم لگیں گے۔ مجھے خود دولت سے محبت نہیں ہے بخت۔ ذرا بھی نہیں۔ تم میرے پاس ہو گی تو مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں ہو گی۔ لیکن بخت میں اپنا آپ منوانا چاہتا ہوں۔ ایک بار۔۔۔ صرف ایک بار میں چاہتا ہوں کہ لوگ مجھے جان لیں اتنی اجازت تو دو گی ناکہ میں۔۔۔“

”میں تمہیں روکوں گی نہیں اقتدار۔ اور مجھے پتا ہے تم کو گے بھی نہیں۔ لیکن اپنا آپ ڈھونڈتے ڈھونڈتے کہیں کھو نہ جانا۔“

”نہیں بخت ایسا سوچو بھی نہیں۔۔۔“ وہ بھی کھڑا ہو گیا۔

”چلو میں تمہارے ساتھ ہی چلتا ہوں۔ تم برتن دھونا میں تمہیں دیکھوں گا اور باتیں کروں گا۔“

”نہیں تم اپنے کمرے میں جاؤ۔ مامی اور اماں کیا کہیں گی۔“

”کیا کہنا ہے یہی سوچیں گی کہ دونوں مل کر شاید مستقل کا کوئی پروگرام بنارہے ہیں۔“ اس کے گندمی رخسار دمک اٹھے اور لانی گھنی پلکیں جھک گئیں۔

”بخت۔“ اس نے سرگوشی کی۔

”تم بہت خوبصورت ہو بخت۔“

”اچھا جاؤ اپنے کمرے میں۔۔۔“ اس نے ہولے سے اسے دھکا دیا اور خود کچن کی طرف بھاگ گئی۔

دو تین دن تک اقتدار کا موڈ بہت اچھا رہا۔ وہ رات کو دیر تک بخت کے پاس بیٹھا باتیں کرتا اسے یونیورسٹی کی باتیں سناتا۔۔۔ اپنی پونٹری دکھاتا اور پھر وہ دونوں رات کھانے کے بعد گھومنے بھی چلے جاتے۔ وہ بابا اور اماں کے پاس بھی بیٹھتا اور ان کی ساری باتیں سر جھکائے سن لیتا۔ ان دو تین دنوں میں اس نے ایک بار بھی جانے کی بات نہیں کی تھی۔ اور بخت آور سوچ رہی تھی کہ شاید اس نے جانے کا ارادہ بدل دیا ہے۔ شاید اب وہ یہاں ہی بابا کے آفس میں جاب کر لے گا پھر۔

پھر دونوں کی شادی ہو جائے گی اور۔

لیکن اس نے جانے کا ارادہ ترک نہیں کیا تھا بلکہ وہ خود کو تیار کر رہا تھا۔ اور بخت کو بہلا رہا تھا۔ ایک رات وہ دونوں لمبی واک کر کے آئے تو مسعود اختر ان کے منتظر تھے۔ مسعود اس کے خالہ زاد تھے۔

”ارے مسعود بھائی آپ۔“

”آپ اچانک کیسے۔“

”یار تم ابھی یہاں ہی بیٹھے ہو میں تو سمجھ رہا تھا کہ تم کراچی چلے گئے ہو گے۔ مگر نکلے آدمی تم ہمیشہ چانس مس کر دیتے ہو۔“ انہوں نے ایک دھپ اس کی پیٹھ پر لگایا۔
”اور تم کیسی ہو بخت آور میں تو تم لوگوں سے ملنے چلا آیا تھا۔“
”ٹھیک ہوں۔“

پتا نہیں کیوں آج بخت کو ان کا آنا ذرا بھی اچھا نہ لگا۔ وہ دونوں کتنے خوش خوش گھر میں داخل ہوئے تھے۔ اقتدار کتنے دنوں بعد آج کھل کر ہنسا تھا اور اس کی آنکھوں میں کتنی چمک تھی اور وہ بار بار کیسے والہانہ انداز میں اسے دیکھتا تھا۔ مگر اب اس کی آنکھیں ایک دم بے رنگ ہو گئی تھیں اور چہرے پر ملال کے رنگ اتر آئے تھے۔
”مجھے جانا تو ہے مسعود بھائی مگر میں چند دن کے لئے رک گیا تھا۔“

”جس منزل کو تم پانا چاہتے ہو ناقتدار، اس میں رکنا خطرناک ہے۔ بڑھتے جاؤ۔ آگے ہی آگے اور پیچھے مڑ کر مت دیکھو ورنہ پتھر ہو جاؤ گے۔“
”پیچھے مڑ کر کیسے نہ دیکھوں مسعود بھائی۔ پیچھے تو سب میرے اپنے ہیں بابا پھوپھو۔ اماں اور۔ اور۔“

اس نے نظر اٹھا کر بخت آور کی طرف دیکھنا چاہا لیکن وہ چلی گئی تھی۔

”بخت۔“

”ہاں بخت۔“

مسعود نے چوہکتے ہوئے کہا۔

”بخت کی محبت تمہیں ناکارہ کر دے گی اقتدار، بلکہ ناکارہ کر رہی ہے۔ میں سمجھتا

ہوں کہ یہ بخت ہی ہے جو تمہیں روکے ہوئے ہے۔“

”نہیں بخت نے تو مجھے جانے سے منع نہیں کیا۔“

”زبان سے نہیں کہا ہو گا۔“ وہ اس کے بازو پر ہاتھ مار کر زور سے ہنسے۔

”مگر یہ محبت کرنے والیاں ہزاروں طرح سے زنجیریں ڈال دیتی ہیں۔ ان کی زبان نہیں بولتی ان کی آنکھیں بولتی ہیں۔ ان کا پور پور صدا بن جاتا ہے۔ اقتدار، اگر تمہیں کچھ بننا ہے تو اپنے آپ کو اس کی محبتوں کی زنجیر سے آزاد کر لو۔ یہ ان دیکھی زنجیریں اتار دو اقتدار۔ میں نے ہمیشہ تم سے یہی کہا ہے یہی سمجھایا ہے کہ محبتیں آدمی کو کمزور کر دیتی ہیں۔ اور اگر تم اتنے ہی کمزور اور بے بس رہے تو پھر کبھی ترقی نہیں کر سکو گے کبھی نہیں۔“

”مگر مسعود بھائی۔“

اقتدار نے پُرسوج نگاہوں سے انہیں دیکھا۔

”میں بخت آور کی محبت سے دستبردار نہیں ہو سکتا۔ اس محبت کی جڑیں بہت دور

تک میرے اندر اتری ہوئی ہیں۔“

”میں نے دستبردار ہونے کو تو نہیں کہا۔ بس وقتی طور پر اپنے آپ کو اس محبت

کے حصار سے باہر لے آؤ۔ اس دائرے میں رہ کر تمہاری تمام صلاحیتیں مرجائیں

گے۔ کیا تم نہیں چاہتے کہ دنیا تمہیں پہچان لے۔“

”چاہتا ہوں۔“

اقتدار نے ہتھیار پھینک دیئے۔

”تم میں اتنی صلاحیتیں ہیں اقتدار کہ ایک دن تم دنیائے ادب کے افق پر چاند بن

کر چکو گے لیکن اس کے لئے تمہیں تھوڑی سی قربانی تو دینی پڑے گی۔“

”کیسی قربانی؟“

اس نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا۔

”یہی بخت سے کچھ عرصہ کے لئے عارضی جدائی۔“

”کیا کراچی میں مجھے بہت دن لگ جائیں گے؟“

”تو تم کیا سمجھتے ہو کہ وہاں جاتے ہی سب تمہیں ہاتھوں ہاتھ لیں گے اور شہرت کا تاج تمہارے سر سجادیں گے۔ وہاں دن نہیں مہینے لگ جائیں گے۔“

”اچھا!“

اس نے کمرے میں آتی بخت کو دیکھا، خوبصورت بھوری آنکھوں والی دلکش بخت۔ کیا وہ اس سے جدا رہ سکے گا۔ لاہور میں تھا تو ہر پندرہ دن بعد گھر آ جاتا تھا، اب کراچی سے اس طرح آنا۔ مگر نہیں کچھ پانے کے لئے کچھ کھونا تو پڑتا ہے نا۔ اور پھر یہ ہمیشہ کے لئے تو نہیں ہو گا آخر کو اسے واپس تو آنا ہی ہو گا۔

”مسعود بھائی آپ کھانا کھائیں گے یا چائے لاؤں۔“

”میں نے رات کا کھانا نہیں کھایا اب تم جو چاہے کرو۔ کھانا کھلا دو یا چائے پلا دو۔“

کچھ ہے تو دے دو تردد نہیں کرنا۔ نہیں تو چائے ہی چلے گی۔ ”وہ ہنسنے۔“

بات بے بات ہنسنے کی انہیں عادت تھی۔

”نہیں مسعود بھائی اماں نے آج گو بھی گوشت پکایا تھا۔ بہت مزے کا میں جلدی سے دو روٹیاں ڈال لیتی ہوں۔“

ایسا کرواقتدار بخت کو بھی بیاہ کر ساتھ لے جاؤ۔ ”انہوں نے مشورہ دیا۔“

مگر کیسے۔ کس طرح۔

اقتدار نے چونک کر انہیں دیکھا۔

”یہ کس طرح ممکن ہے ابھی تو میں خود بھی کراچی میں اجنبی ہوں گا۔ ابھی تو۔“

”میں تو اس لئے کہہ رہا تھا کہ۔۔۔“

مسعود نے اس کی بات کاٹ کر بڑی دل گر فنگی سے کہا۔ ان کی آواز میں رقت پیدا ہو گئی تھی۔

”میں نہیں چاہتا کہ ایک اتنا اچھا، اتنا ذہین آدمی ضائع ہو جائے۔ میری آنکھیں

تمہارے اندر کے بڑے آدمی کو دیکھتی ہیں اقتدار۔ میں نہیں چاہتا کہ تمہاری صلاحیتیں تمہارے اندر ہی گھٹ جائیں اور مجھے ڈر ہے کہ بخت کے بغیر شاید تم۔“

”نہیں مسعود بھائی ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں نے آپ کو بتایا ہے کہ مجھے جانا تھا لیکن میں بس یونہی چند دن کے لئے رک گیا تھا۔“

”میری دعائیں تمہارے ساتھ رہیں گی اور وہاں میں نے تمہارا ڈرامہ پڑھا تھا۔“

انہوں نے زور سے اس کے کندھے پر ہاتھ مارا اور قہقہہ لگا کر ہنسنے۔

”کیا غضب کا لکھا ہے تم نے۔ آج کل شہرت حاصل کرنے کے لئے ٹی وی اچھا میڈیا ہے۔ دنوں میں لوگ جان جاتے ہیں۔ جانے سے پہلے اپنا مسودہ لے جانا۔ وہاں کراچی میں ایک صاحب ہیں میرے ملنے والے ہمدانی صاحب، ان کی واقفیت ہے ایک پروڈیوسر سے۔ تمہارا کام بن جائے گا۔“

”شکریہ مسعود بھائی۔“ وہ ایک دم ان کا ممنون نظر آنے لگا۔

”شکریہ وغیرہ چھوڑو یار، یہ غیروں والی باتیں ہیں بس میں تو تمہیں بلندی پر دیکھنا چاہتا ہوں۔ اور ہاں تمہاری پوسٹری کا کیا حال ہے۔ کوئی نئی چیز لکھی۔“

”نہیں کچھ نہیں لکھا۔“ وہ افسردگی سے مسکرایا۔

”جب سے گھر آیا ہوں کچھ لکھنے کو دل ہی نہیں چاہا۔“

”بخت سے جدا ہو کر تمہاری شاعری میں بھی نکھار آ جائے گا۔ دیکھ لینا اقتدار، جب تم اس سے دور ہو جاؤ گے تو خود بخود لکھنے کو دل چاہے گا۔ اس کی جدائی تمہیں بڑا شاعر بنا دے گی۔“

”آپ بھی کمال کرتے ہیں مسعود بھائی۔“ وہ ہنس دیا۔

”اس طرح بھی کبھی کوئی بڑا شاعر بنا ہے۔“

”بن جاؤ گے، بن جاؤ گے۔“

انہوں نے سر ہلایا اور بخت کو آوازیں دینے لگے۔ بخت کھانا لے کر آگئی تو وہ بڑی رغبت سے کھانے لگے۔ اقتدر کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا اور وہ کھانا کھاتے ہوئے ساتھ ساتھ بخت کو لطفیے بھی سناتے جا رہے تھے اور ان کے گھسے پٹے لطفیوں پر اگرچہ بخت کو بالکل بھی ہنسی نہیں آرہی تھی۔ لیکن جس طرح وہ ہر لطفیہ سنانے سے پہلے ہنستے اور پھر درمیان میں بھی ٹھہر ٹھہر کر ایک اونچا قہقہہ لگاتے اس پر وہ بے اختیار مسکراتی تھیں اور اس کی مسکراہٹ کی شہہ پا کر وہ لطفیے پر لطفیہ سناتے جا رہے تھے۔ اور نہ جانے وہ کب تک اسے بور کرتے کہ اماں نے اسے آواز دے لی اور وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”اے لطفیہ تو پورا سن لو۔“

”پھر سہی مسعود بھائی۔“

وہ تیزی سے باہر نکل گئی اور انہوں نے اپنی توجہ اقتدار کی طرف مبذول کر لی۔ اقتدار مسعود کے ساتھ ہی چلا گیا تھا اور جب وہ جا رہا تھا تو بخت نے اس کی آنکھوں میں پھر وہی خواب دیکھے تھے۔ انجانی زمینوں کو سر کرنے کے خواب اور وہ ڈر کر، خوفزدہ ہو کر ایک قدم آگے بڑھ آئی تھی۔

”کب آؤ گے؟“

”جلد ہی۔“

اس نے چلتے چلتے مڑ کر اسے دیکھا تھا۔

”کراچی جانے سے پہلے ملنے آؤ گے۔“

”ہاں آؤں گا۔“

اس نے وعدہ کیا۔ پھر وہ ملے بنا ہی مسعود بھائی کے پاس سے ہی کراچی چلا گیا۔ حالانکہ اس کا دل تو چاہ رہا تھا کہ جانے سے پہلے ایک نظر بخت کو، بابا کو اور اماں کو دیکھ لے۔ لیکن مسعود بھائی کو جلدی تھی۔

”دیکھو بھئی، میں تو کل کی ٹرین سے تمہاری سیٹ بھی بک کر اچکا ہوں۔“

”لیکن میں نے بخت سے کہا تھا کہ اس سے مل کر جاؤں گا۔“

”بھئی تم ملک سے باہر تو نہیں جا رہے۔ آجانا ایک دو مہینے تک اور میں بخت کو تمہاری مجبوری بتا دوں گا۔ ہمدانی صاحب بڑے اچھے آدمی ہیں تمہارا خیال رکھیں گے۔“ اور واقعی ہمدانی صاحب بہت اچھے آدمی تھے۔ انہوں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا تھا۔ اور جس فلیٹ میں خود رہ رہے تھے اسی کا ایک کمرہ اسے بھی عنایت کر دیا تھا۔ اکیلے آدمی تھے ان کے لئے ایک کمرہ بھی بہت تھا دوسرا کمرہ وہ اکثر کرائے پر ہی چڑھائے رکھتے تھے۔ وہ کیا کرتے تھے ان کا ذریعہ معاش کیا تھا۔ اس کے متعلق اقتدار نے کچھ جاننے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ تو بس دل سے ان کی قدر کرتا تھا۔ جس طرح انہوں نے اس کی پذیرائی کی تھی اور اس کے ہر شعر پر دل کھول کر داد دی تھی اور اسے شاندار مستقبل کی نوید سنائی تھی وہ اسے ممنون کرنے کے لئے بہت تھا اور وہ تو اسے ساتھ لئے لئے پھرتے۔ اپنے سب جاننے والوں سے ملاتے۔

”بھئی اس سے ملو اقتدار احمر، مستقبل کا ایک عظیم شاعر اور ڈرامہ نگار۔“

وہ اسے نہ جانے کس کس سے ملا چکے تھے لیکن ابھی تک اس پر ڈیوٹر سے ملاقات نہیں ہوئی تھی جس کا ذکر مسعود بھائی نے کیا تھا۔

”ہمدانی صاحب۔“ ایک روز اس نے اپنا مسودہ نکال کر ان کے سامنے رکھ دیا۔

”میری خواہش تھی کہ میرا یہ ڈرامہ ٹی۔وی سے۔“

”ہاں ہاں بھئی۔“

انہوں نے بالکل مسعود بھائی کے انداز میں ڈرامہ اس سے اچک لیا اور عینک لگا کر پڑھنے لگے۔ پڑھتے ہوئے پان کی پیک بھی مشورے پر گرتی جا رہی تھی۔

”واہ۔ واہ کیا لکھا ہے بھئی، یار سچ کہتا تھا مسعود تم تو ہیرا ہو، ہیرا۔ ایک بار تمہارا

یہ ڈرامہ آن ایئر چلا جائے میاں پھر تو وارے نیارے ہو جائیں گے۔ دیکھ لینا کیسے مشہور ہوتے ہو۔“

”توپلینز ہمدانی صاحب پھر آپ یہ مسودہ۔“

”ہاں فکر نہ کرو کل ہی چلتے ہیں وہ اپنے رب نواز کے پاس۔ ان کا نام تو یوں بھی کامیابی کی ضمانت ہے۔ جس کا ڈرامہ وہ لے لیں جس اداکار کو متعارف کروائیں وہ راتوں رات شہرت کے آسمان پر پہنچ جاتا ہے۔“

”اچھا!“

اس کی آنکھیں خواب دیکھنے لگیں۔

”تو پھر کب چلیں گے؟“

”کل۔ کل ہی چلیں گے میاں۔“

مگر وہ کل کبھی نہ آئی، اقتدار جتنے پیسے گھر سے لایا تھا وہ ختم ہو گئے اور اب کئی دنوں سے وہ صرف نان چھو لوں پر گزارا کر رہا تھا۔ اب ہمدانی صاحب سے وہ کسی قدر مایوس ہو چکا تھا اور سب سے اہم مسئلہ اب اس کے لئے کوئی جاب کرنا تھا۔ ایک دفعہ قدم یہاں تک جائیں پھر اطمینان سے کچھ کروں گا۔ مگر جاب تھی کہ مل ہی نہیں رہی تھی۔ اس روز بھی وہ کئی دفاتروں کی خاک چھان کر انتہائی دل گرفتہ سا گھر لوٹا تو ہمدانی صاحب کو اپنا منتظر پایا۔

”اے میاں کہاں چلے گئے تھے کب سے انتظار کر رہا ہوں۔“

”نو کری کی تلاش میں۔“

”نو کری۔ ہاں نو کری، پر میاں نو کری میں تو آدمی رہن ہو جاتا ہے۔ صلاحیتیں مر

جاتی ہیں۔“

”جی مگر پیٹ بھی تو بھرنا ہی ہے نا۔“ اس نے تلخی سے کہا۔

”اور میں سوچ رہا ہوں کہ اگر نو کری نہیں ملتی تو ایک دو روز تک واپس چلا جاؤں گا۔“

”واپس۔“ انہوں نے عینک اتار کر اسے گھورا۔

”کیا کرو گے واپس جا کر، اس لکھ لٹ شہر سے یوں ہی بے مراد واپس چلے جاؤ گے۔ نہ میاں میں تمہیں یوں خالی ہاتھ نہ جانے دوں گا۔ چلو میں تو تمہارا انتظار کر رہا تھا کہ آؤ تو ذرا رب نواز کے پاس چلتے ہیں۔ کیا ہیرا آدمی ہے بھئی۔ اور ہاں وہ مسودہ بھی لے لو۔“ اس نے بے یقینی سے انہیں دیکھا اور اپنی جگہ بیٹھا رہا۔ تو انہوں نے خود ہی اٹھ کر الماری میں سے مسودہ نکالا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر کھڑا کر دیا۔

”چلو۔ چلو میاں۔“ رب نواز نے مسودہ لے کر رکھ لیا تھا۔

”دیکھوں گا۔“

”سراسے پڑھئے گا ضرور۔“

”ہاں ہاں کیوں نہیں پڑھوں گا۔“ اور دل میں امید کی ایک ننھی سی شمع جلانے وہ رب نواز کے پاس سے لوٹا تو اس نے بڑے دنوں بعد بخت کو خط لکھا۔

”بخت میں لوگوں کے اس وسیع سمندر میں اپنا مقام بنانے کے لئے ہاتھ پاؤں مارتا رہا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ بہت جلد ساحل پر پہنچ جاؤں گا تم میرے لئے دعا کرتی رہنا۔“

اور بخت کا تو رواں رواں اس کے لئے دعا کرتا تھا۔ اس کی کامیابی کی اور اس کے پلٹ کے آنے کی دعائیں۔ مگر اس کی دعائیں درِ قبولیت تک پہنچ ہی نہیں رہی تھیں۔

اقتدار رب نواز کے پاس چکر لگا لگا کر تھک گیا تھا۔ مگر رب نواز اسے ٹال دیتا تھا۔ اس نے ایک پرائیویٹ کمپنی میں عارضی طور پر نو کری کر لی تھی۔ اور کسی اچھی جاب کی تلاش میں تھا۔ سیلز مین کی یہ جاب اسے ذرا پسند نہ تھی مگر مجبوری تھی۔ پیٹ بھرنے کے لئے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی تھا۔ رب نواز سے وہ بالکل مایوس ہو گیا تھا اسے یقین تھا کہ

وہ اس کا ڈرامہ بالکل نہیں پڑھے گا کہ ایک روز ہمدانی صاحب نے اسے بتایا کہ رب نواز صاحب اسے بلارہے تھے۔

”اوہ تو کیا انہوں نے میرا ڈرامہ پڑھ لیا ہے اور کیا وہ۔“

”پتا نہیں یار آج تم صبح ان سے مل لینا۔“ ہمدانی صاحب جلدی میں تھے۔ اور ان کے جانے کے بعد وہ کتنی ہی دیر تک خواب دیکھتا رہا۔ کہ اس کا پلے ٹیلی کاسٹ ہوا ہے ملک کے گوشے گوشے سے تعریفی خطوط آرہے ہیں، اس کے انٹرویوز ہو رہے ہیں اور ساری رات وہ بے چین سارہا۔ اور صبح جانے کیسے اس نے ناشتہ کیا اور رب نواز صاحب کے پاس جا پہنچا۔

”سر آپ نے بلایا تھا۔“

”ہاں بھئی! وہ تمہارا مسودہ کہیں گم ہو گیا ہے۔ بہت ڈھونڈا مایا نہیں ایسا کرو تم پھر لکھ لو۔“

”جی!“

اس نے بے یقینی سے انہیں دیکھا۔ کتنی لاپرواہی سے وہ کہہ رہے تھے کہ گم ہو گیا ہے لوگ بھی کتنے ظالم ہوتے ہیں۔ اس نے ایک نظر انہیں دیکھا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

”ہمدانی صاحب تمہاری بہت تعریف کرتے ہیں بھئی ایسا کرو کوئی لاگ پلے لکھو۔ یہ سیریز وغیرہ نہیں۔ پھر دیکھیں گے ابھی تو یہ سہ ماہی چل رہی ہے۔ اگلی سہ ماہی کے کئی پروگراموں کے پائلٹ تیار ہو گئے ہیں۔“ خدا جانے رب نواز صاحب کیا کیا کہہ رہے تھے اس نے سنا نہیں۔ اس کا ذہن تو ایک دم خالی خالی سا ہو گیا تھا۔ اس نے غیر ارادی طور پر مٹھیاں بھینچیں اور پھر انہیں خدا حافظ کہہ کر چلا آیا۔ دفتر جانے کو دل ہی نہیں چاہ رہا تھا۔

”یہاں اس دنیا میں یوں ہی ہوتا ہے شاید میں جو کچھ کرنا چاہتا ہوں کر نہیں سکتا۔“

لوگ مجھے تسلیم نہیں کرتے۔ کاش! میں سب کو بتا سکتا کہ میں کیا ہوں، میرے اندر کیا چھپا ہے۔ کتاب بڑا خزانہ۔“ وہ ٹہل ٹہل کر اپنے اندر کا غصہ کم کرتا رہا۔

شام کو حرب معمول ہمدانی صاحب قہقہے لگاتے ہنستے اور پان کی پکاریاں مارتے آگئے۔

”ہاں تو اقبال دار میاں۔ پھر کیا کہا اپنے رب نواز نے، کب آرہا ہے تمہارا ڈرامہ؟“

”انہوں نے مسودہ گم کر دیا ہے۔“ اس نے مری۔۔ مری آواز میں کہا اور بیٹھ گیا۔ صبح سے کمرے میں چکر لگا لگا کر اس کی ٹانگیں دکھنے لگی تھیں۔

”اوہ ویری سیڈ بہت برا۔“ ہمدانی صاحب کا ہاتھ اس کے کندھے پر اپنی مخصوص قوت سے لگا۔

”ہمدانی صاحب۔“ اس نے پر خیال نظروں سے انہیں دیکھا۔

”کسی پبلشر سے آپ کی واقفیت ہے۔“

”ہاں ہاں کیوں نہیں میاں، کئی لوگوں کو جانتا ہوں۔“

”میں اپنی کتاب چھپوانا چاہتا ہوں، اپنی انگلش پوسٹری کا مجموعہ۔“

”ضرور ضرور چھپواؤ میاں ہاتھوں ہاتھ لیں گے لوگ۔“ انہوں نے اسے خوب سبز باغ دکھائے، لیکن جب وہ ان کے ساتھ کئی پبلشروں سے ملا تو اسے احساس ہوا کہ کتاب چھپوانا اتنا آسان نہیں ہے جتنا وہ سمجھ رہا تھا۔ پیسہ اس کے پاس تھا نہیں اور کوئی پبلشر رسک لینے کو تیار نہیں تھا۔

”ایسا کرو میاں۔“ ہمدانی صاحب نے اسے مشورہ دیا۔

”یہ انگریزی شاعری چھوڑو۔ اپنی زبان میں شاعری کرو۔ اپنی زبان میں، پھر دیکھو لوگ کیسے تمہیں تسلیم کرتے ہیں۔ ایک آدھ مجموعہ اردو میں آجائے تو پھر اس کے

بعد انگریزی کی کتاب چھپواتے رہنا۔“

”جی۔“ اس نے ہمدانی صاحب کی بات پر دھیان تو نہیں دیا تھا لیکن غیر شعوری طور پر دو تین اردو غزلیں لکھ ڈالیں تھیں اور ہمدانی صاحب کے ایک شاعر دوست نے اس کی غزلوں کی بہت تعریف کی تھی اور اسے مشورہ دیا تھا کہ ابھی جو لکھتے ہو اسے ادبی پرچوں میں چھپواؤ لوگ تمہیں جاننے لگیں گے تو پھر مجموعہ وغیرہ چھپوانا۔

اسے ان کی بات پسند تو آئی تھی۔ لیکن وہ تو راتوں رات مشہور ہونا چاہتا تھا۔ ایک دم سے آسمان کی بلندیوں کو چھو لینا چاہتا تھا۔ اور یہ تو ایک لمبا پر اس تھا ادبی پرچے چھ ماہ بعد چھپتے تھے اور کیا وہ ایک غزل چھپنے کے انتظار میں چھ ماہ انتظار کرتا رہے اور پھر اردو شاعری اس کی منزل نہیں تھی۔ وہ تو ادب کی ہر صنف پر چھا جانا چاہتا تھا۔ اور بہت جلد اسے ادراک ہو گیا تھا کہ یہ سب کچھ یوں نہیں ہو سکتا۔ اس کے لئے پیسہ چاہئے بہت سا پیسہ۔ کہ اگر وہ کتاب چھپوائے تو بڑے بڑے ہوٹلوں میں اس کی تعارفی تقریب منعقد کرائے۔ بڑے ادیبوں سے اس پر تنقیدی مضامین لکھوائے۔ اور ایسی ہی دو چار تقاریب کے بعد لوگ اسے جاننے لگیں گے۔

بلاشبہ اس کے پاس صلاحیت تھی لیکن صلاحیت کو منوانے کیلئے پیسہ نہیں تھا۔ جس جگہ وہ کام کر رہا تھا وہاں سے تو بمشکل اتنا ملتا تھا کہ ہمدانی صاحب کو کمرے کا کرایہ دے کر دو وقت کی روٹی پوری ہوتی تھی۔ اور پھر یہ ملازمت بھی عارضی تھی۔ جیسے ہی پرانا سیزمین چھٹی سے واپس آیا اسے جواب مل گیا۔ جیب ایک بار پھر خالی ہو گئی تو ایک روز ہمدانی صاحب دو طالب علموں کو پکڑ لائے۔

”یہ دو بچے ہیں اس مصرعہ طرح پر ایک غزل اور ایک نظم لکھ دو اس موضوع پر ان کے کالج میں مشاعرہ ہے۔ سو روپے دونوں چیزوں کے دیں گے۔“

”جی۔“ وہ حیرت سے انہیں دیکھتا رہ گیا۔

”میری غزلیں یہ اپنے نام سے پڑھیں گے۔“

”ہاں میاں سب چلتا ہے، کالجوں میں اسی طرح ہوتا ہے۔ بڑے بڑے شاعروں سے بچے لکھوا کر لے جاتے ہیں۔“

”نہیں“

اس کا چہرہ سرخ ہو گیا اور آنکھیں جلنے لگیں۔

”میں اس طرح لفظوں کی تجارت نہیں کر سکتا۔ میں اپنے جذبات و احساسات کو بیچ نہیں سکتا۔ میں جو لکھتا ہوں وہ میری اپنی شناخت ہے آپ چاہتے ہیں میں اپنی شناخت بیچ دوں۔“

”ہاں۔“ ہمدانی صاحب زور سے قہقہہ لگا کر ہنسے۔

”میاں اس دنیا میں بہت کچھ بکتا ہے۔ اور یہ تو بڑی معمولی بات تھی اور ہم نے تو تمہارے ہی بھلے کی بات کی تھی۔ تم نہیں لکھو گے تو اور کوئی لکھ دے گا۔“

”مگر ہمدانی صاحب میں ایسا نہیں کر سکتا۔“ وہ غصے میں مٹھیاں بھیجتا ہوا اپنے کمرے میں چلا گیا۔

”شاید میں نے یہاں آکر غلطی کی ہے بخت۔“ اس نے کمرے میں آکر قلم اٹھا لیا۔ جب بھی اس کے دل پر بوجھ ہوتا تو وہ بخت کو خط لکھ کر دل کا بوجھ کم کرنے کی کوشش کرتا۔

”مگر مجھے ایک بات بتاؤ بخت لوگ کیوں نہیں سمجھتے۔ کیوں نہیں پہچانتے آخر انہیں وہ بینائی کب ملے گی کہ وہ کھوٹے کھرے کی پہچان کر سکیں۔ وہ گھٹیا مال مہنگے داموں خرید لیتے ہیں اور اچھے مال کی انہیں پہچان ہی نہیں ہے، میں تھک گیا ہوں لیکن ہارا نہیں ہوں بخت۔ ایک حقیقت بہر حال میں نے جان لی ہے۔ کہ پیسہ اس دنیا کی سب سے بڑی حقیقت ہے اور یہ مینا کو نابینا کر دیتا ہے اور آدمی مہنگے داموں گھٹیا چیز بھی خرید لیتا ہے۔“

اور جب بخت کو اس کا خط ملا تو وہ بے چین ہو گئی، وہ وہاں تنہا ہو گا اور اس ہو گا اور کوئی اسے تسلی دینے والا بھی نہیں ہو گا۔

”مسعود بھائی آپ ہی اقتدار کو سمجھائیں۔ وہ سایوں کے پیچھے بھاگ رہا ہے۔“
مسعود آئے تو بخت آور نے التجا کی۔ جب سے اقتدار گیا تھا مسعود باقاعدگی سے ہر ہفتے چکر لگاتے تھے۔

”میں نے تو پہلے ہی سمجھایا تھا کہ بخت پر وہ سنتا ہی نہیں۔ اس پر تو بھوت سوار ہے۔ اپنا آپ منوانے کا۔ راتوں رات شہرت کی بلندیوں پر پہنچ جانے کا۔“

”پہلے تو اس نے ایسے خواب کبھی نہیں دیکھے تھے۔“ وہ روہانسی ہو گئی۔
”اسے تمہارا خیال بھی نہیں بخت۔ میں نے کہا تھا لاہور میں اسے اچھی سے اچھی

جاب دلوادوں گا۔ پر وہ۔“

”نہیں نہیں مسعود بھائی میرا تو۔“ وہ کچھ کہتے کہتے چپ ہو گئی۔

”خط تو آتے ہوں گے اس کے۔“

”ہاں۔“ اس نے آہستگی سے کہا۔

”کیا لکھتا ہے وہ۔“ انہوں نے پوچھا۔

”جاب نہیں ملی۔ لکھا ہے کہ چند دن اور دیکھوں گا پھر لوٹ آؤں گا۔“ مسعود نے

چونک کر اسے دیکھا۔

”ہاں لکھا تو ہے۔ کیا فائدہ وہاں رہنے کا۔“

”ہاں۔ ہاں ٹھیک کہہ رہی ہو تم کیا فائدہ وہاں رہنے کا۔ میں دو تین روز تک دفتر کے ایک کام سے کراچی جا رہا ہوں۔ دیکھوں گا اس کے لئے کیا کر سکتا ہوں۔ کراچی جس کو اس آجائے اس کے لئے توپا رس ہے پارس۔“

”میرے خیال میں مسعود بھائی آپ ان کو سمجھائیے گا کہ بہتر ہے ادھر پنجاب

میں ہی کوئی جاب وغیرہ تلاش کریں۔“

”اچھا اچھا بتاؤں گا اسے کہ بخت تمہیں بہت یاد کرتی ہے۔ بہت مس کرتی ہے تمہیں۔ لیکن ایک بات ہے بخت اسے تمہارا اتنا خیال نہیں ہے۔ اب دیکھو نا کراچی جا رہا تھا تو میں نے اتنا کہا کہ بخت۔۔۔ سے مل کر جاؤ۔ وہ اداس ہو جائے گی۔ پر اس لڑکے کو تو اپنی ذات سے عشق ہے۔ لوگ اسے جان لیں، اسے پہچان لیں بس۔“

”نہیں مسعود بھائی۔ اچانک ہی جانا پڑا اسے، ورنہ تو میں جانتی ہوں کہ وہ۔“

اور اس کی پلکیں جھک گئیں۔ رخساروں پر سرخی دوڑ گئی۔ مسعود کی نظریں اس کے چہرے پر جمی تھیں۔ ان کی نظروں سے بچنے کے لئے وہ کھڑی ہو گئی۔

”اچھا مسعود بھائی! آپ اخبار دیکھیں، میں ذرا کچن میں جاؤں گی۔ ابھی بابا آجائیں گے۔“

”بے چارے خالو۔“

مسعود نے ایک گہری سانس لی۔

”اس عمر میں بیٹے کھاتے ہیں اور اقتدار میاں کو بس اپنے علاوہ کسی کی پروا ہی نہیں۔“ انہوں نے جیسے اپنے آپ سے کہا اور اخبار اٹھا کر دیکھنے لگے۔ بخت نے ان کی بات سنی لیکن وہ جواب دینے کے لئے رکی نہیں۔ بس ایک نظر مڑ کر انہیں دیکھا اور باہر نکل گئی۔



حقائق ہاتھوں میں دکھ کے

بھالے لئے میری سمت بڑھ رہے ہیں

میں ڈر رہا ہوں

میں ان سے نظریں چرا کے

اور سوچتا رہا کہ کیا شہرت کی خواہش، اپنا آپ منوالینے کی چاہت بخت کی محبت سے زیادہ قوی ہے۔ اور اسے لگا جیسے بخت کی محبت کا پلڑا زمین سے جا لگا ہے۔

”نہیں۔ بخت کی محبت اس سے زیادہ قوی ہے اور اس کے لئے اس کی خاطر میں بخت کی محبت سے دستبردار نہیں ہو سکتا۔“ اس نے کاغذات اٹھائے اور ٹکڑے ٹکڑے کر کے باسکٹ میں پھینک دیئے۔ اس کی دن رات کی محنت کا ثمر، اس کے سچے جذبات و احساسات ایک دم اسے لگا جیسے اس کے اندر دھواں سا پھیل گیا ہو اور اس کا دم گھٹنے لگا۔ اس نے آنکھیں میچ لیں۔

اور شاید یہ بہت مشکل ہے اپنی تخلیق کو اس طرح اپنے ہاتھوں سے تباہ کرنا۔ لیکن بخت آور تمہاری محبت اس درد پر حاوی ہے اس سب پر۔

اس نے اپنے ہاتھوں سے میز کے کنارے کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ دنیائے اسے جانا نہیں تھا۔ کوئی اسے اپنا مقام دینے کے لئے تیار نہ تھا۔ یہ دکھ بہت گہرا اور شدید تھا۔ یوں جیسے کسی نے اس کا دل چیر دیا ہے۔

”یہ دکھ شدید ہے مگر مجھے یقین ہے۔“

اس نے اپنے آپ کو تسلی دی۔

”ہولے ہولے یہ دکھ کم ہو جائے گا۔ درد کی شدت اتنی نہیں رہے گی۔ بخت کی محبت کی ٹھنڈی چھاؤں اس کرب کو کم کر دے گی۔ دنیا میں بہت سارے لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کو ان کا صحیح مقام نہیں ملتا۔ پھر بھی وہ زندگی بسر کرتے ہیں۔ بہت خوش اور بہت مطمئن۔ تو کیا میں ان لوگوں کی طرح نہیں ہو سکتا۔ یقیناً ہو سکتا ہوں اور شاید میں ان بہت سارے لوگوں سے کہیں زیادہ خوش قسمت ہوں گا کہ مجھے بخت کی محبت بھی حاصل ہوگی۔ سچی، بے ریا محبت۔“

وہ اٹھا تو اس کے ہونٹوں پر آسودہ سی مسکراہٹ تھی۔ ایک نظر اس نے کمرے میں

سپینوں کے بازوؤں میں چھپ رہا ہوں لکھتے لکھتے اس نے قلم رکھ دیا۔

حقیقت تو یہ ہے کہ یہ سب کچھ بے معنی اور فضول ہے۔ اور ہی جو میں تین چار ماہ سے یہاں پڑا ہوا ہوں تو یہ قطعی بے فائدہ ہے اور بے کار۔ ان چند ماہ میں۔ کچھ بھی میں نے حاصل نہیں کیا۔ میرے اندر ایک سمندر موجزن ہے لیکن دنیا اس سے بے خبر ہے۔ میں تو پتھر کے نیچے اگنے والی خشک گھاس ہوں جس کے دل میں لہلہانے کا ارمان ہی رہ جاتا ہے اور میں اقتدار احمر مجھے اب اس حقیقت کو تسلیم کر لینا چاہئے کہ ہر آدمی کے مقدر میں بلندیاں نہیں ہوتیں اور میں جو گھر کی نرم و گرم محبتوں سے دامن چھڑا کر ایک موہوم سی امید کے سہارے یہاں اجنبی سرزمین پر لوگوں کی بے مہریاں سہہ رہا ہوں تو کیوں؟

یہ محض حماقت نہیں تو اور کیا ہے مگر یہ جو شہرت کی، نامور ہونے کی خواہش میرے اندر بالکل چپاتی ہے، میں اس خواہش کا گلا کیسے گھونٹوں۔ آخر میں اس بات کو کیوں نہیں سمجھ رہا کہ اس عزت، شہرت اور بلندی سے بالاتر ایک اور چیز بھی ہے اور وہ ہے بخت آور کا محبت بھرا دل۔

اس کی آنکھوں کے سامنے جیسے بخت آنکھڑی ہوئی ناراض ناراض اور خفا خفا سی۔ دلکش بھوری آنکھوں اور گندی رنگت والی بخت جس کا دل شاید اس دنیا میں سب سے قیمتی شے تھا۔ محبت بھرا دل۔

”پاگل۔“ وہ ہولے سے مسکرایا۔

جانتا ہوں کہ راتوں کو چھپ چھپ کر روتی ہوگی۔“

مگر۔۔

اس نے میز پر پڑے ہوئے کاغذ کے پلندے کو دیکھا توڑی دیر تک یوں ہی دیکھتا رہا

چاروں طرف بکھری ہوئی چیزوں کو دیکھا اور پھر انہیں اکٹھا کرنے لگا۔
 ”کل صبح۔۔ کل صبح یہاں سے چلا جاؤں گا۔ اور اچانک مجھے دیکھ کر بخت کتنی بے
 تحاشا خوش ہو گی۔“ بیگ میں کپڑے رکھتے ہوئے اس نے سوچا۔
 تب ہی دروازہ دھڑام سے کھلا اور ہانپتے کانپتے مسعود بھائی دھم سے آکر بستر پر
 گر پڑے۔

”ارے مسعود بھائی آپ۔!“ وہ انہیں دیکھ کر حیران رہ گیا۔
 ”بہت۔۔ بہت سیڑھیاں ہیں بھائی۔“ مسعود نے اس کی بات کا جواب دینے کے
 بجائے پھولے پھولے سانسوں سے کہا۔
 ”مسعود بھائی۔ آپ اچانک کیسے آگئے؟“
 ”بس یونہی۔“ انہوں نے تنقیدی نظروں سے کمرے کا جائزہ لیا۔
 ”آفس کا ایک کام تھا۔ سوچا تم سے بھی ملتا چلوں گا۔ اور تم کیا کر رہے ہو آج کل۔
 کچھ کام بنا؟“
 ”کچھ نہیں مسعود بھائی۔ میں تو واپسی کا سوچ رہا ہوں۔ بلکہ ابھی آپ کے آنے
 سے پہلے میں نے واپسی کا پکا پروگرام بنالیا تھا۔“
 ”مگر کیوں اقتدار۔ واپس جا کر کیا کرو گے۔“

”کچھ نہ کچھ تو کروں گا ہی۔ مقامی کالج سے ایک باریکچر رشپ کے لئے آفر ہوئی
 تھی۔ دیکھوں گا اگر وہ آفر برقرار ہوئی تو۔۔ نہیں تو بابا کے آفس میں تو جاب مل
 جائے گی۔“

”لیکن وہ جاب تمہارے قابل تو نہیں اقتدار۔“

”یہاں کسی کو اس کی قابلیت کے مطابق کب کچھ ملا ہے مسعود بھائی۔“

”اور وہ تمہارے خواب۔۔؟“

خواب پورے ہونے کے لئے تو نہیں ہوتے مسعود بھائی۔“ وہ افسردگی سے
 مسکرا دیا۔

”اور پھر خوابوں کا کیا ہے؟“

”بہت جلدی مایوس ہو گئے ہو اقتدار۔“ انہوں نے شفقت سے اس کے کندھے پر
 اپنا ہاتھ رکھا۔

”مجھے بہت دکھ ہو رہا ہے۔ میں تمہیں اتنا کم حوصلہ نہیں سمجھتا تھا کہ تم لڑے بغیر
 ہی ہتھیار ڈال رہے ہو۔“

”میں زندگی کے آخری لمحے تک اپنی جنگ لڑنے کا قائل ہوں مسعود بھائی لیکن
 میں نے جو سوچا ہے اسی میں بہتری ہے۔“

”اور وہ تمہارا ٹیلنٹ، تمہاری صلاحیتیں۔؟“ مسعود بھائی کھڑے ہو کر ٹہلنے لگے۔
 ”کیا سب مٹی میں مل جائیں گی۔ ایسا نہیں ہونا چاہئے اقتدار ایسا نہیں ہونا چاہئے۔
 ہمت مت ہارو۔ اپنا آپ منواؤ اقتدار۔ دنیا کو احساس دلاؤ کہ تم کیا ہو۔ تمہارے اندر کیسا
 بے بہا خزانہ چھپا ہے۔“

”نا ممکن ہے، مسعود بھائی۔“ اس نے کندھے اچکائے۔

”یہ دنیا بڑی عجیب جگہ ہے یہاں جب تک آپ کے پاس کھنکھتے سکے نہ ہوں لوگ
 آپ کی طرف دیکھتے بھی نہیں۔“ اس نے وضاحت سے چار ماہ کی تگ و دو کا حال سنایا۔
 ”میں۔۔ میں تمہارے لئے کیا کروں اقتدار۔“ وہ ٹہلتے ٹہلتے رک کر اسے دیکھنے لگے۔
 ”میری کتنی خواہش تھی۔ کتنا دل چاہتا تھا میرا کہ تم اس دنیا میں اپنا مقام بنا لو مگر یہ

ظاہر دار دنیا۔۔ یہ۔۔ اوہ۔۔۔“

انہوں نے بات نا مکمل چھوڑ کر چٹکی بجائی۔

”تم امریکہ کیوں نہیں چلے جاتے؟“

”امریکہ --! وہاں جا کر کیا کروں گا مسعود بھائی۔“ اپنے وطن میں لوگوں نے نہیں پہچانا تو ایک اجنبی دیس میں اپنا مقام کیسے بنایاؤں گا۔“

”مقام نہیں میرے بھائی -- ڈالر -- ڈالر کمانا۔“ انہوں نے قہقہہ لگایا۔ اونچا زور دار قہقہہ۔

”تمہارے پاس ڈالر ہوں گے تو پھر سب کچھ آسان ہو جائے گا۔ تم اپنے آپ کو منوا سکو گے۔ ابھی تم نے کہا تھا کہ جیب میں کھٹکتے ہوئے سکے ہوں تو تب ہی۔“

”ہاں مگر۔ یہ ڈالر کمانا آسان تو نہیں ہوتا۔ جو لوگ امریکہ جاتے ہیں وہ کہتے ہیں -- کہ وہاں زندگی بہت مشکل ہے۔“

”ارے جھوٹ بولتے ہیں وہ لوگ۔ خود تو جیسیں بھر بھر کر ڈالا کرتے ہیں وہاں سے اور چاہتے ہیں کہ دوسرے نہ کمائیں۔“

”اور پھر مسعود بھائی اس کا فائدہ بھی کیا کہ لوگ مجھے اس لئے تسلیم کریں کہ میرے پاس پیسہ ہے۔ بات تو جب ہوتی جب وہ میری شخصیت، میرے ٹیلنٹ --“

”میری جان۔“ مسعود بھائی نے اس کے کندھوں پر تھپکی دی۔ ”وقت کے تقاضے کو سمجھو۔“

”مگر امریکہ جانا آسان بھی نہیں ہے۔ سنا ہے ویزا مشکل سے ملتا ہے۔“ اس کا ارادہ کمزور سا پڑنے لگا۔

”مل جاتا ہے۔ مل جاتا ہے بھئی۔ بس کوشش شرط ہونی چاہئے۔ ابھی بچھلے دنوں ہی تو وہ گئے ہیں۔ اپنے ہاشمی صاحب نہیں تھے وہ ہیڈ کلرک میرے آفس میں۔“

”ہاں ہاں، منور ہاشمی۔“

”وہی ان کے تینوں بیٹے امریکہ پہنچ گئے ہیں اور اب بوریاں بھر بھر کر پیسے بھیج رہے ہیں۔ ہاشمی صاحب نے لاہور میں پندرہ لاکھ کی کوٹھی خریدی ہے اقبال ٹاؤن میں۔“

”اچھا۔ مگر ویزا کیسے ملا؟“

”پوچھ لیں گے۔ تم پہلے ارادہ تو کرو جانے کا۔“

”کیا حرج ہے اگر قسمت آزمائی جائے۔“ اس نے سوچا۔ ”روپیہ میرے پاس ہوگا تو پھر اپنی شناخت کروانا مشکل نہیں ہوگا میں اپنی کتابیں اپنے خرچ پر چھپواؤں گا اور ان کی تعارفی تقاریب فائو اشارز ہوٹلوں میں منعقد کراؤں گا۔ اور ملک کے بڑے بڑے ادیب اور نقاد ان محفلوں میں شرکت کریں گے۔ اور۔“ خواب پھر اس کی آنکھوں میں آجے۔ مسعود بھائی نے کچھ اس طرح ڈالروں کی چمک دکھائی تھی کہ اس نے اپنا بندھا ہوا سامان کھول دیا اور امریکہ جانے کے لئے بھاگ دوڑ کرنے لگا۔ مسعود بھائی بڑے مطمئن مطمئن واپس لوٹ آئے۔

”سنو بخت۔ وہ تو امریکہ جا رہا ہے۔“ انہوں نے بخت کو آکر بتایا۔

”نہیں -- بخت کو یقین نہ آیا۔“

”اس نے تو دیکھا ہے، وہ بہت جلد واپس آجائے گا۔“

”یقین کرو بخت۔ اس کی آنکھوں کے رنگ بدل گئے ہیں۔ وہ دولت کمانا چاہتا ہے۔“

”دولت --؟“

بخت نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا۔

”دولت سے تو اسے کبھی محبت نہیں رہی۔“

”آدمی ہمیشہ ایک سا تو نہیں رہتا بخت اور اور پھر دولت سے کسے محبت نہیں ہوتی۔“

مسعود بھائی نے اسے یقین دلانے کی بہت کوشش کی لیکن اسے یقین نہیں آیا تھا کہ اقتدار دولت کی چاہ میں اتنی دور جاسکتا ہے۔ مگر ایک شام اچانک وہ آگیا اور اس نے مسعود بھائی کی بات کی تصدیق کر دی تو وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھنے لگی۔

”تم اتنی دور چلے جاؤ گے اتنی!“

”کیا کروں بخت یہاں رہ کر میں کچھ پا نہیں سکتا۔ چند ہزار روپے تنخواہ اگر مجھے ملے بھی تو میرے خواب پورے نہیں ہو سکتے۔“

”تم ایسے خواب دیکھتے ہی کیوں ہو اقتدار، جن کا پورا کرنا ممکن نہ ہو۔“

”بہت سی باتیں اپنے اختیار میں نہیں ہوتی ہیں بخت۔ میری ہتھیلیوں پر کوچ کا ستارہ ہے اور میرے پاؤں میں چکر ہے۔“

”اتی! ان چند ماہ میں تمہاری صحت کتنی خراب ہو گئی ہے۔ تمہاری آنکھوں کے گرد حلقے پڑ گئے ہیں۔ کیوں اپنے آپ کو تھکاتے ہو اقتدار۔“ اس کی آنکھیں گیلی ہو گئیں۔

”رونا نہیں بخت۔“ اس نے نرمی سے اس کے ہاتھوں پر تھپکی دی۔

”تمہارے آنسو میرے ارادوں کو کمزور کر دیں گے۔ مجھے کمزور نہ بناؤ بخت۔ مجھے جانے دو مجھے مت روکنا۔ میں جہاں بھی ہوا ہمیشہ تمہارا رہوں گا۔ بس ایک بار میں وہ سب کچھ پالوں جو میں چاہتا ہوں تو پھر میں تمہارے پاس لوٹ آؤں گا۔ کہیں نہیں جاؤں گا۔ ہم دونوں ایک چھوٹا سا خوبصورت گھر بنائیں گے۔“

”اتی۔ تم کب۔ کب لوٹو گے؟“ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔

”جلد، بہت جلد۔ میں تو خود جانا نہیں چاہتا لیکن میرے خواب مجھے بلاتے ہیں اور ان خوابوں کی تعبیریوں ہی نہیں مل سکتی ایک دشتِ مسافت ہے جو مجھے طے کرنا ہے۔ اور میں جانتا ہوں کہ یہ راہ بڑی پر خار ہوگی۔ لیکن میں راستے کی صعوبتوں سے ڈر کر اپنے خواب اپنی ہی آنکھوں سے نہیں نوچ سکتا۔“

”مگر تم یہاں رہ کر بھی تو اپنے خوابوں کی تعبیر پاسکتے ہو۔“

”نا ممکن ہے بخت۔ کراچی میں رہ کر اس کا ادراک ہوا ہے مجھے اور مسعود بھائی کہتے ہیں کہ مجھے امریکہ جا کر اپنی قسمت آزمائی چاہئے۔ اور جب ڈالروں سے جیب بھری ہو تو بیٹا بھی نابینا ہو جاتا ہے۔“

”مسعود بھائی۔؟“ اس کی آنکھوں میں حیرت اتر آئی۔

”کیا مسعود بھائی نے تمہیں امریکہ جانے کے لئے کہا؟“

”ہاں۔ میں تو مایوس ہو کر واپس آ رہا تھا کہ مسعود بھائی کراچی آ گئے۔ اور انہوں نے امریکہ جانے کا مشورہ دیا۔“

”مسعود بھائی بہت۔۔ بہت غلط آدمی ہیں۔“

اس کی آنکھوں میں چنگاریاں سی بھر گئیں۔

”نہیں نہیں بخت۔ ان کے خلوص پر شک نہ کرو۔ وہ بہت مخلص اور ہمدرد ہیں اور انہوں نے بالکل صحیح مشورہ دیا ہے۔ کیا تم مجھے بامراد دیکھنا نہیں چاہتیں۔ کیا تم نہیں چاہتیں کہ میں وہ سب کچھ پالوں جو میں نے چاہا، جو میں نے سوچا اور جس کے خواب دیکھے۔“

”میں کیا چاہتی ہوں۔ تم نہیں جانتے اتی۔ تم مرد کبھی بھی عورت کو نہیں جان سکتے۔ کبھی بھی نہیں۔ اگر میرے اختیار میں ہو تو میں تمہاری مسافتوں کے سارے دکھ خود لے لوں۔ تمہاری راہ کے سارے کانٹے اپنی پلکوں سے چن لوں۔“

”بخت۔ بخت تم کتنی اچھی ہو۔“ اقتدار نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

”میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ سچی اور بے لوث محبت ایسی محبت جس میں کوئی کھوٹ، کوئی ریا نہیں۔ ہمیشہ ہمیں مجھ پر یقین اور اعتماد رکھنا۔“ بخت کی بھوری آنکھوں میں رنگ اتر آئے اور وہ جلنے بجھنے لگیں جیسے قہقہے۔

”مجھے تم پر خود سے زیادہ یقین ہے اتی۔“

”اور تم کبھی بدگمان نہ ہونا۔ کوئی خواہ تم سے کچھ بھی کہے میں بہر حال تمہارا ہوں۔“

”تم کب جاؤ گے اتی؟“

”کب؟“ وہ ہنس دیا۔

”پنگی، جانا آسان تو نہیں ہے۔ پورے ایک ماہ سے بھاگ رہا ہوں۔ مگر ویزا نہیں

مل رہا۔ نوفل دینے کا پروگرام بھی ہے اور ایک صاحب بھی ملے ہیں۔ انہوں نے پچاس ہزار روپے میں ویزا دلانے کا وعدہ کیا ہے۔“

”پچاس ہزار روپے۔!“ بخت نے حیرت سے پوچھا۔

”ہاں۔ یہ تو اس نے کم بتائے ہیں۔ مسعود بھائی کی وجہ سے رعایت کی ہے۔ ورنہ تو اسی ہزار لے رہا ہے۔“

”اور یہ پچاس ہزار روپے کہاں سے آئیں گے؟“

”ہو جائے گا انتظام۔ کچھ رقم بابا کے پاس ہے اور کچھ اماں کے پاس زیور ہے۔ وہ فروخت کر دوں گا۔ اور پھر پچاس ہزار روپے وہاں جا کر امریکہ میں تو میری ایک ماہ کی تنخواہ ہوگی۔“

”تمہیں وہاں جاتے ہی کام مل جائے گا؟“

”ہاں مسعود بھائی کہتے ہیں وہاں ان کے کئی دوست ہیں اور پھر وہاں کام کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔“

”اچھا۔“ اس نے بے یقینی سے کہا۔

”پتا نہیں کیوں مسعود بھائی کی باتوں پر یقین کرنے کو دل نہیں چاہتا۔ وہ تو بس یونہی بے پرکی اڑایا کرتے ہیں۔“

”نہیں بخت۔ مسعود بھائی غلط نہیں کہتے وہ ہاشمی صاحب تھے نا ان کے تینوں بیٹے یکے بعد دیگرے امریکہ چلے گئے ہیں اور پتا ہے ہاشمی صاحب نے پندرہ لاکھ کی کوٹھی خریدی ہے اقبال ٹاؤن میں۔“

”اچھا تو یہ ہاشمی صاحب تو بابا کے بھی جاننے والے ہیں تم ان سے خود مل کر کیوں نہیں پوچھ لیتے کہ انہوں نے بیٹوں کے لئے امریکہ کا ویزا کیسے حاصل کیا۔“

”پوچھو لوں گا لیکن اب تو میرا انتظام بھی ہو گیا ہے۔ پچاس ہزار روپے دوں گا تو

بس ویزا مل جائے گا۔“

”لیکن پچاس ہزار روپے دینے کے باوجود ویزا نہ ملا۔۔۔ مختار صاحب نے چھ ماہ کے بعد رقم لوٹادی۔“

”بہت مشکل ہو گیا ہے امریکہ کا ویزا۔ تمہاری قسمت اقتدار جانے کیوں رہی جیکٹ کر دیا انہوں نے تمہارا کیس۔“

وہ بہت دل گرفتہ سا کراچی سے واپس آیا۔

”اب کیا کروں۔؟“ اس نے مسعود بھائی سے پوچھا اور مسعود بھائی نے اسے بہت سے راستے بتائے لیکن اقتدار کو ہر در بند ملا۔

جعلی پاسپورٹ پر سفر کرنے کے گر۔ امریکہ میں ناجائز طریقے سے اسمگل ہونے کے طریقے لیکن جانے کیوں اقتدار کو کوئی طریقہ بھی راس نہ آسکا۔ کسی نے اسے بتایا کہ ہانگ کانگ چلے جاؤ وہاں ایسے اسمگل مل جائیں گے جو اس جیسے لوگوں کو امریکہ کی طرف اسمگل کرتے ہیں اور وہ ہانگ کانگ چلا گیا لیکن ایک ماہ تک دھکے کھا کھا کر واپس پلٹ آیا۔

”دیکھو یار، کسی گرین کارڈ ہولڈر سے شادی کر لو مطلب نکل جانے کے بعد طلاق دے دینا۔“ مسعود بھائی نے اسے مشورہ دیا۔

”نہیں مسعود بھائی۔“ اس نے صاف انکار کر دیا۔

”میں اتنا گر نہیں سکتا کہ محض اپنی مقصد براری کے لئے کسی لڑکی کو استعمال کروں۔“

”تو پھر بیٹھے رہو ساری زندگی اور گھن لگا دو اپنی ساری صلاحیتوں کو۔“ مسعود بھائی کو غصہ آ گیا۔

”میں یہ سب نہیں کر سکتا چاہے آپ جو بھی کہیں۔“ وہ اتنی ناکامیوں کے بعد

بھی مایوس نہیں ہوا تھا، بس ایک لگن تھی جو اسے ہر اس مقام پر لے جا رہی تھی جہاں ذرا بھی اسے امید کی کرن نظر آتی۔

”اتنی بھاگ دوڑ، اتنی تھکن، اقتدار، تم یہ خیال چھوڑ کیوں نہیں دیتے؟“

”کیسے چھوڑ دوں بخت، یہ احساس تو میری روح میں رچ بس گیا ہے کہ مجھے لوگوں کے اس ہجوم میں اپنی شناخت کروانی ہے اور یہ پیسے کے بغیر ناممکن ہے۔“

”تم یہاں ہی بزنس کر لو۔ کہتے ہیں آدمی بزنس میں بہت کماتا ہے۔“

”میں بزنس مائنڈ نہیں ہوں بخت۔ مجھے یقین ہے کہ میں نے اگر کوئی بزنس کیا تو خسارے میں ہی رہوں گا، اصل بھی لٹا دوں گا۔ لگتا ہے بخت تم نے میرے لئے دل سے دعا نہیں کی ورنہ۔۔۔“

”اقتدار۔“ بخت نے تڑپ کر اسے دیکھا۔

”میں نے تو دن رات تمہارے لئے دعائیں کی ہیں۔ یہ جاننے کے باوجود کہ میری دعائیں خود میرے لئے تمہاری جدائیاں خرید لائیں گی پھر بھی۔ پھر بھی اقتدار اور تم کہہ رہے ہو۔“

”سوری۔ بخت۔“ وہ شرمندہ ہو گیا۔

”میں تو یوں ہی کہہ رہا تھا۔ تم نے سچ مان لیا۔ مجھے پتا ہے، مجھے خبر ہے میری بخت کو میری خوشیاں اپنی خوشیوں سے زیادہ عزیز ہیں۔“

”اقتدار“ تم ہاشمی صاحب کے پاس گئے تھے نا، انہوں نے کیا کہا؟“

”انہوں نے ایک شخص کا پتا دیا ہے۔ فیصل آباد میں رہتا ہے۔ دو ایک روز تک اس سے ملنے جاؤں گا۔“

”خدا کرے کہ اب تمہارا کام بن جائے۔“

”ہاں یہ آخری امید ہے۔“ اس کی آنکھوں میں خواب جاگ اٹھے۔ اجنبی زمینور

کو سر کرنے کے خواب اور وہ خلا میں نگاہیں جمائے جانے کیا سوچنے لگا۔ بخت نے ایک نظر اسے دیکھا اور پھر کھڑی ہو گئی۔

”اچھا اتنی میں ذرا کچن میں جا رہی ہوں۔“

لیکن اقتدار نے سنا نہیں۔ اس کی آنکھیں تو خواب دیکھ رہی تھیں۔ اس کے پاس ڈالر تھے۔ اقبال ٹاؤن میں پندرہ لاکھ کی کوٹھی۔ فائیو اسٹارز ہوٹل میں تعارفی تقاریب، دھڑا دھڑا تصویریں بن رہی تھیں۔ آٹو گراف لئے جا رہے تھے اس نے بے حد آسودہ ہو کر آنکھیں موند لیں اور دیوار سے ٹیک لگالی۔

وہ فیصل آباد سے واپس آیا تو بہت خوش تھا۔ اسے یقین تھا کہ اب کام بن ہی جائے گا۔ اور پھر کئی دن تک وہ بے حد مصروف رہا، اسلام آباد کے کئی چکر لگانے پڑے تھے۔ پاسپورٹ پر کئی ممالک کے ویزے لگ گئے تھے۔ ایک بار پھر وہ سفر کی تیاری کر رہا تھا۔ پیسہ تو کافی خرچ ہو رہا تھا لیکن اس بار امید واثق تھی کہ کام ہو جائے گا۔

”کیا یہاں سے سیدھے امریکہ جاؤ گے اتی؟“

”ہاں۔۔۔ میں تو۔۔۔“ وہ گڑبڑا گیا۔ اسے سیدھا تو نہیں جانا تھا۔ ہالینڈ، کینیڈا جانے کہاں کہاں کے ویزے لگوا کر دیئے تھے اس نے ہر ملک میں اس کے آدمی تھے اور اس نے وعدہ کیا تھا کہ وہ جہاں بھی جائے گا اس کے آدمی کسی نہ کسی طرح اسے امریکہ بھجوا دیں گے مگر اس نے بخت کو کچھ نہ بتایا کہ اسے کہاں جانا ہے اور پھر کیسے اسے اسمگل کیا جائے گا اور زندگی کو کتنا خطرہ ہے۔

”کوئی پرابلم تو نہیں ہو گا اتی؟“ وہ پریشان تھی۔

”نہیں بابا، کیسا پرابلم۔“ وہ ہنس دیا۔

”بس ذرا دو تین ممالک کی مزید سیر کر لوں گا۔“ اس نے اسے تسلی دی۔

”اور دیکھو میرے بعد اماں اور بابا کا بہت خیال رکھنا اور اپنا بھی۔ رونا بالکل نہیں۔“

ہوں ٹھیک ہے نا۔ تم روئیں نا تو پھر میرے اور تمہارے درمیان آنسوؤں کی جھیلیں حائل ہو جائیں گی اور کیا پتا میں ان نمکین جھیلوں کو عبور کر کے تم تک پہنچ ہی نہ سکوں۔“

”نہیں روؤں گی۔“ اس نے وعدہ کیا اور بڑے ضبط سے اسے ایک ایک کر کے جہاز کی سیڑھیاں چڑھتے دیکھتی رہی۔ وہ روئی نہیں تھی لیکن آنسو جیسے اس کے دل پر منجمد ہو گئے تھے۔

وہ جلے پاؤں کی بلی کی طرح تپتی دو پہروں میں سارے گھر میں گھومتی پھرتی اور راتوں کو جاگ جاگ کر اس کی خیریت کی دعائیں مانگتی۔ پورا ایک ماہ ہو گیا تھا اور سوائے ایک دیوکارڈ کے اس نے کچھ نہیں لکھا تھا۔ نہ کوئی خط نہ کوئی اطلاع، اس پر مسعود بھائی کی باتیں اسے دہلا دیتیں۔

”وہ رات کے اندھیرے میں کشتیوں میں سفر کرتے ہیں دلدلی علاقوں میں پیدل بھی سفر کرنا پڑتا ہے اور کئی دفعہ اس طرح چھپ کر داخل ہونے والے گولیوں کا شکار بھی ہو جاتے ہیں۔“ اور وہ ساری رات جاگ کر گزار دیتی۔

”اللہ! اسے اپنے حفظ و امان میں رکھنا۔“ وہ دعائیں مانگتی رہی اور یوں ہی تین ماہ بیت گئے۔ جیسے تین صدیاں گزر گئی ہوں۔

اس شام وہ بے حد دل گرفتہ اور اس سی گلاب کے پودوں کو پانی دے رہی تھی کہ اچانک وہ آگیا گلے میں بیگ لٹکائے، بے حد تھکا اور نڈھال سا۔

”اقتدار۔“ پانی کا پائپ وہاں ہی پھینک کر وہ تیزی سے اس کی طرف لپکی۔

”اقتدار تم۔ ٹھیک تو ہونا۔ بغیر اطلاع کئے آگئے ہو۔“

اقتدار نے کچھ نہیں کہا۔ بیگ زمین پر رکھ کر وہ وہیں صحن میں بچھی چار پائی پر بیٹھ گیا۔

”تم ٹھیک تو رہے ہو۔ بولتے کیوں نہیں۔ بولونا۔“

”ٹھیک ہوں۔“ اس نے آہستگی سے کہا۔ ”اماں، بابا، اور پھوپھو سب ٹھیک ہیں نا؟“

”ہاں سب ٹھیک ہیں لیکن بابا بہت پریشان تھے۔ تم نے اتنا عرصہ کوئی خط بھی تو نہیں لکھا تھا۔“ اس کی آواز بھرا گئی اور اسے لگا جیسے اس کے اندر جے آنسو پگھل رہے ہوں قطرہ قطرہ کر کے۔

”تم رورہی ہو۔“ اقتدار نے نرمی سے کہا۔

”نہیں۔ ہاں۔ قسم لے لواتی تمہارے بعد میں ایک دن نہیں روئی، ایک دن بھی نہیں۔ میں نے اپنے سارے آنسو بر قاب کر کے اپنے اندر اتار لئے تھے۔ تم نے کہا تھا کہ میرے آنسوؤں کی جھیلیں تم شاید عبور نہ کر سکو۔ تو میں نہیں روئی اور آج، آج تو تم آگئے ہونا تو یہ آنسو بس یوں ہی نکل آئے ہیں۔“

اس نے جلدی سے آنسو پونچھ کر اسے دیکھا۔

طویل مسافتوں کی دھول اس کی پلکوں پر جمی ہوئی تھی اور آنکھیں بہت سی تھکاؤٹوں اور ناکامیوں کی کہانیاں سن رہی تھیں۔

”اتی!“

اس نے ہولے سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

”تم وہاں امریکہ میں سیٹ نہیں ہو سکے کیا۔ کیوں لوٹ آئے ہو۔ کیا پھر واپس جانا ہے۔“

”میں ابھی آتی ہوں۔“

بخت آور نے اس کی بات کاٹ دی۔

”بابا کو اور اماں کو تمہارے آنے کا بتا آؤں، پھر تم سے ان تین ماہ کی روداد سنوں گی۔“

”کیا سناؤں گا تمہیں۔۔۔“

اس نے افسردگی سے کہا اور سوچا۔

میں تو راستے سے ہی پلٹ آیا ہوں بخت کیا سنوں گی تمہیں کیا بتاؤں گا میں۔۔۔
 ”نہ چھاؤں جیسی کوئی کہانی نہ جلتی دھوپوں کا کوئی قصہ۔۔۔

کہاں کا ذکر سفر کہ پہلے قدم پہ ہم تو۔

کہ پہلے قدم پہ ہم تو۔۔۔

”تم امریکہ نہیں جاسکے اقتدار؟“ وہ جاتے جاتے پلٹ آئی۔

”ہاں!“ اس نے آہستگی سے کہا۔

”میری ہر کوشش ناکام ہو گئی۔“

”تو تمہاری ساری بھاگ دوڑ اور ساری کوشش بیکار رہی۔ لوگ کیسے آرام سے

چلے جاتے ہیں اور پھر تمہارے لئے۔“

”میرا اپنا مقدر اور لوگوں کا اپنا مقدر ہوتا ہے۔“

شاید اسی میں بہتری ہو۔ تم پریشان نہ ہو۔ بخت نے اسے تسلی دی۔

”ہاں شاید اسی میں بہتری ہو یہی سوچ کر تو واپس پلٹ آیا ہوں بخت۔“

”اچھا کیا تم نے اتنی! وہاں پڑے رہنے کا کیا فائدہ تھا۔“ اور پھر بابا اور اماں کو اس کے

آنے کا بتا کر جب وہ کچن میں گئی تو اسے یوں لگ رہا تھا جیسے اس کے دل پر دھرا کوئی

بوجھ خود بخود اتر گیا ہو۔ وہ ایک دم ہلکی پھلکی ہو گئی تھی اور چائے بناتے ہوئے وہ خوشی

سے گنگنا رہی تھی اس بات سے بے خبر کہ کوچ کا ستارہ اتنا اب بھی اس کے ہاتھوں کی

لیکروں میں دمک رہا تھا اور اس کی آنکھوں میں اس کے خواب اسی طرح لودے رہے

تھے اور ان میں طویل مسافتوں کی ان کہی کہانیاں رقم تھیں۔

بے سمت

سبھی زخم زخم سے مرحلے سبھی بے یقین سے سلسلے

کوئی اور تخت اسے ملا، اسے پوجتا کوئی اور ہے

کہیں چاندنی کے غبار میں تجھے چھوڑ کر کوئی آگیا!

کہیں جگنوؤں کی قطار میں تجھے ڈھونڈتا کوئی اور ہے

پاک جرمن گوسٹے انسٹیٹیوٹ نے کرسس ایونگ کا اہتمام بہت شاندار طریقے

سے کیا تھا۔ پورا ہال بھرا ہوا تھا۔ مسلمان لڑکے اور لڑکیاں اپنی خوبصورت آواز اور

مخصوص لے میں مذہبی گانے گارہے تھے۔ چودہ لڑکوں اور سات لڑکیوں نے مل کر

”دی سائیکل نائٹ“ گایا۔

روی نے جواگلی نشست پر بیٹھا ہوا تھا۔ رازی کے کان میں سرگوشی کی۔

”تم نے دیکھا کیتی آج کتنی پیاری لگ رہی ہے۔“

ہاں! رازی نے کھوئے کھوئے انداز میں کہا۔

”وہ ہمیشہ ہی پیاری لگتی ہے۔“

”اے کہیں تم۔۔۔“

رازی نے چونک کر اسے دیکھا۔

”ارے نہیں۔“ وہ ہنس دیا۔

”بھلا میں کہاں اور وہ کہاں۔ میں ایک غریب فوٹو گرافر اور وہ شیخ نصیر الدین کی

اکلوتی بیٹی۔“

”لیکن تمہیں پتا ہے وہ بھی۔۔۔ شاید وہ بھی تمہیں پسند کرنے لگی ہے۔“ رازی نے

کوئی جواب نہ دیا اور، دھیان سے سننے لگا۔

اب گھنٹیاں بج رہی تھیں اور مشہور نظم ”ڈنگ ڈانگ“ گائی جا رہی تھی۔
ڈنگ ڈانگ کے بعد گیتی، نیلی، ڈیزی اور پنکو نے مل کر ”سیس گاوری ٹودی نیو
بورن کنگ اور۔

ادہ بی آل فیٹھ فل۔“ گائی۔

کوئٹہ سے سردی کی لہر آگئی تھی اور رازی پر ہلکی سی کپکپاہٹ طاری تھی لیکن نیلی،
ڈیزی اور پنکو سیلو لٹس بلاؤز پہنے بہت بشاش چہروں کے ساتھ نہ جانے کس بات پر ہنس
رہی تھیں۔

”ہیلو رازی!“ گیتی نے ان کے پاس آکر کہا۔

”مجھے یقین نہیں تھا کہ تم آؤ گے۔“

”کیوں یقین کیوں نہیں تھا۔“

”یوں ہی تم کہہ رہے تھے ناکہ تم اس طرح کی محفلوں میں کبھی نہیں گئے۔“

”ہاں لیکن یہ کیسے ممکن تھا گیتی کہ تم بلاؤ اور میں نہ آؤں۔“

گیتی نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا وہ بڑی وار فنگی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ گیتی کی نظریں

جھک گئیں اور دل بے ساختہ دھڑک اٹھا۔

”اب کیا پروگرام ہے؟“ نیلی نے پوچھا۔

پروگرام۔ آج۔“

ڈیزی نے اپنی گول گول آنکھیں منکائیں۔ اور رازی کی طرف دیکھا۔

”آج کرسمس ڈے کی خوشی میں مسٹر رازی ہمیں ڈنر کھلائیں گے اور وہ بھی

”تایو“ میں۔“

”مگر۔ میں۔“ وہ بوکھلا گیا۔

”ہاں جناب آپ۔“ ڈیزی نے شوخی سے کہا۔

اتنے دن ہو گئے آپ کو ہماری محفل میں آتے لیکن آج تک آپ نے کبھی۔

”رازی کی طرف سے میں ”تایو“ میں سب کو ڈنر کھلاتی ہوں۔“

”مگر یہ بے ایمانی ہے، آج کا ڈنر رازی کے نام۔“

”یہ میرا اور رازی کا معاملہ ہے۔ کیوں رازی۔“ گیتی نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں

ڈال دیں۔ ”ہاں جیسے تم کہو۔ میں جلد ہی تمہیں اس ڈنر کے چار جزے کر دوں گا۔“

”حساب دوستانہ دردل۔“ رومی نے قہقہہ لگایا۔

”کم آن۔“

اور پھر وہ سب ہنستے مسکراتے رومی کی گاڑی میں گھس گئے۔

”آئندہ میں کبھی اس رومی کے بچے کی باتوں میں نہیں آؤں گی اور اپنی گاڑی

ساتھ لایا کروں گی۔“

گیتی کا دم گھٹ رہا تھا۔

”بے آنا بے شک۔“ رومی نے اجازت دے دی۔

”لیکن پھر انجوائے نہیں کر سکو گی۔“

”یہ شامی اور مونی کہاں گئے ہیں۔ انہوں نے تو پچھلے کئی سالوں سے ”کرسمس

ایوننگ“ کا یہ پروگرام مس نہیں کیا تھا۔“

”شامی نے ایک نئی گرل فرینڈ بنالی ہے۔“

”رینی۔“ نیلی اچھلی۔

”ہمیں بتائے بغیر۔“

”احتیاط سے، ابھی تمہاری کہنی میری آنٹیں باہر نکالنے والی تھی۔“

”ایک تو تمہیں ہر وقت اپنی ٹوٹ پھوٹ کی فکر رہتی ہے۔“

نیلی نے الجھ کر ڈیزی کو دیکھا اور تھوڑا سا آگے جھک گئی۔

”ہاں تو رومی شامی کی یہ نئی فرینڈ کون ہے کیسی ہے؟“

”ڈاکٹر مہیش چند کی بیٹی کرن کماری۔“

”کیسی ہے؟“

اس نے اشتیاق سے پوچھا۔

”خوبصورت ہے؟“

”مجھ سے بھی زیادہ رومی۔“

اس نے روہانسی ہو کر کہا۔

”خیر، تم سے زیادہ نہیں۔“

”پھر ٹھیک ہے۔“

اس نے مطمئن ہو کر کہا۔

”کیا مطلب ہے؟“ رازی نے مڑ کر اسے دیکھا۔

”مطلب یہ کہ نیلی کا خیال ہے کہ دنیا میں کوئی اس سے زیادہ خوبصورت نہیں

ہو سکتا۔“

”اوہ اچھا! رازی ہنس۔“

”میں کچھ اور سمجھا تھا۔“

”غلطی ہے تمہاری۔“ پتکو نے کہا۔

”نہیں، اس کی غلطی نہیں ہے، اس نے جس ماحول میں پرورش پائی ہے اس ماحول

کا قصور ہے۔“

رومی نے وضاحت کی۔

بھائی رازی! ہم لوگ Possessive ہیں اور نہ ہی جلیس سمجھے، اگر مجھے پتا چلے

کہ تم میری محبوبہ کو پسند کرنے لگے ہو اور وہ بھی تمہیں تو میں بغیر کسی ناگواری کے

تمہارے راستے سے ہٹ جاؤں گا، سمجھے۔“

”ہوں! رازی نے سر ہلایا۔“

”آدمی کو اتنا براڈمانڈڈ نہیں ہونا چاہئے رومی۔“ گیتی نے آہستگی سے کہا۔

”اپنی چیز کو اس طرح دوسرے کے حوالے کر دینا بزدلی اور بے غیرتی ہے۔“

”اوہ نان سنس گیتو۔۔۔ یہ تم نہیں۔ تمہاری اس بوڑھی آیا اماں کی روح بول رہی

ہے جس نے تمہیں دودھ پلایا تھا۔“

”ہاں رومی! صحیح کہتے ہو کبھی کبھی گیتی ہم میں سے نہیں لگتی جیسے اس کا سیرہ کوئی

اور ہو۔“

ڈیزی نے بھی اس کی تائید کی اور پوچھا۔

”شامی تو اپنی گرل فرینڈ کو پیارا ہو گیا مگر وہ موئی کا بچہ۔ تم نے اس کے متعلق

نہیں بتایا۔“

وہ آج کل انٹلکچوئل بننے کی کوشش کر رہا ہے اور بڑی باقاعدگی سے اکرام الحق

صاحب کی محفل میں حاضری دے رہا ہے۔“

”یہ اکرام الحق صاحب کیا بلا ہیں۔“

رازی نے پوچھا۔

”ہیں ایک بلا۔ کسی دن لے چلوں گا۔“

”مجھے بھی رومی۔ مجھے انٹلکچوئل لوگوں سے ملنے کا بہت شوق ہے۔“

نیلی نے اشتیاق سے کہا۔

”ویسے یہ صاحب کرتے کیا ہیں۔“

”یہ ہر فن مولا قسم کی چیز ہیں۔“ رومی نے بتایا۔

”کبھی شاعر نظر آتے ہیں۔ کبھی ادیب دکھائی دیتے ہیں۔ کبھی موسیقار اور کبھی

”کہیں ان کا تعلق جنات سے تو نہیں۔“

پنکو نے ڈرنے کی ایکنگ کی۔ اور اسی لمحے گاڑی ”تایوا“ کے سامنے تھی۔ ”تایوا“ میں بے حد رش تھا۔ لوگ باہر کھڑے تھے۔ اضافی ٹیکسٹ لگانے کے باوجود جگہ نہیں تھی۔

”اب کیا کریں۔“

”بے فکر رہو۔ منیجر سے دوستی ہے۔“

روی گاڑی پارک کر کے انہیں وہیں انتظار کرنے کا کہہ کر اندر چلا گیا۔ رازی بھی اس کے ساتھ ہی تھا۔

”سنو گیتو۔۔ تم رازی کے لئے سیریس ہو۔“ نیلی نے پوچھا۔

”شاید۔“

”مگر گیتو رازی اور تم دونوں کے طبقوں میں فرق ہے۔ دوستی الگ چیز ہے مگر۔“

”تم کہنا کیا چاہتی ہو نیلی۔“ گیتی نے پوچھا۔

”میں یہ کہہ رہی تھی گیت کہ تمہاری ماما اور پاپا شاید رازی کو اس حیثیت میں قبول

نہ کریں جو تم اسے دینا چاہتی ہو۔“

”کیوں؟“ گیتی نے بھنویں اچکائیں۔

”اس لئے کہ رازی ایک غریب فوٹو گرافر ہے۔ اس کا خاندانی پس منظر کیا ہے۔ تم نہیں جانتیں اور وہ مبینے میں شاید اتنا بھی نہیں کماتا جتنی تمہارے شو فر کی تنخواہ ہے۔“

”وہ غریب ہے تو میں تو غریب نہیں ہوں نا۔“

”تمہارے پاپا مان جائیں گے گیتو۔“ ڈیزی نے پوچھا۔

”نہ ماننے کی کوئی وجہ۔ وہ کون ہوتے ہیں میرے پر سئل معاملات میں دخل دینے والے۔ یہ میری زندگی کا مسئلہ ہے اور زندگی میں نے گزارنی ہے۔ اور تمہیں غلط فہمی

ہے ڈیزی کہ وہ مجھے روکیں گے۔ زندگی بھر تو انہوں نے مجھے کسی کام سے روکا نہیں اور اب میری زندگی کے سب سے اہم مسئلے میں وہ مجھے روکیں گے۔ نان سنس۔ وہی ہو گا جو میں چاہوں گی۔

اور پھر مجھے تو یہ بھی یقین ہے کہ مجھے صرف انہیں اطلاع دینی ہو گی کہ میں شادی کر رہی ہوں۔ ماما یہ کریں گی کہ جیولرز کو اور کلاتھ مرچنٹس کو اور ٹیلرز کو فون کر دیں گی بہت ہوا تو شاپنگ کے لئے ایک چکر جاپان اور ہانگ کانگ کا لگا آئیں گی تاکہ بعد میں فخر سے یہ کہہ سکیں کہ وہ تو بے بی کی شادی کی شاپنگ کے لئے جاپان اور ہانگ کانگ گئی تھیں اور پاپا۔“ اس نے زور سے قہقہہ لگایا۔

”ہوٹل میں شادی کی دعوت کے لئے آرہنجٹ کر دیں گے۔ بس انہیں یہ تک خبر نہیں ہو گی کہ میں جس سے شادی کر رہی ہوں وہ کنگلا ہے یا لکھ پتی ہے عیسائی ہے یا یہودی۔“

”تم بہت سینٹی مینٹل ہو گیت۔“

نیلی نے اس کے کندھے پر تھپکی دی۔

”یہ جذباتیت ہمیں سوٹ نہیں کرتی جاناں۔ یہ تو متوسط طبقے کی لڑکیوں کو سوٹ کرتی ہے۔ اب دیکھو نا میری ماما چھ ماہ سے یورپ کے ٹور پر گئی ہوئی ہیں۔ حالانکہ جس دن وہ جا رہی تھیں مئی اتنا بیمار تھا ڈاکٹر نے ٹائیفائیڈ ڈانگنوس کیا تھا۔ اگر ماما متوسط طبقے کی ماؤں کی طرح سنی کے لئے رک جاتیں تو خواہ مخواہ ٹور مس ہو جاتا اور سنی ٹھیک بھی ہو گیا چند دنوں میں۔ مگر تم بھی پتا نہیں کیوں اپنے سنی کی طرح یہ چاہتی ہو کہ تمہاری ماما اور پاپا متوسط طبقے کے والدین کی طرح ہر وقت تمہیں گھٹنوں سے لگائے بیٹھے رہیں اور تم بوڑھے ہونے تک ان کی انگلی پکڑ کر چلتی رہو۔“

”نہیں، میں ایسا تو نہیں چاہتی۔“

”ضروری تو نہیں بس ذرا رعب و عبا ڈالنے کے لئے۔ مونی ایک بار بتا رہا تھا نا کہ وہ کوئی شاعر قسم کی چیز ہے۔“
 ”وہ روی آرہا ہے۔“
 گیتی نے کہا تو پتلی نے کھڑکی میں سر باہر نکال کر اسے آواز دی۔
 ”کیا صورت ہے؟“
 ”آ جاؤ۔“

روی نے وہیں سے اشارہ کیا اور وہ تینوں باہر نکل آئیں۔

وہ سب دوست تھے بچپن سے ہی اکٹھے تھے ایک ہی اسکول میں، ایک ہی کالج میں سب نے پڑھا تھا اور یونیورسٹی میں بھی سب اکٹھے ہی تھے آج کل امتحان کے بعد وہ فارغ تھے اور ان کے پاس کرنے کو کوئی کام نہ تھا سوائے فلمیں دیکھنے، گھومنے پھرنے اور ہلکا گلا کرنے کے وہ سب زندگی کو پوری طرح انجوائے کرنے کے قائل تھے۔ گیتی ابتداء میں کچھ خاموش طبع سی تھی اور ان سب سے قدرے مختلف۔ اس کے اندر واقعی کسی متوسط طبقے کی لڑکی کی روح گھسی ہوئی تھی اس کا دل چاہتا تھا کہ ماما اور پاپا سے وقت دیں اور اس کی چھوٹی چھوٹی خوشیوں کو شیئر کریں۔ وہ بیمار ہو تو ماما اس کے لئے پریشان ہوں اپنے سارے پروگرام کینسل کر کے اس کی چارپائی سے لگ کر بیٹھ جائیں۔ اس کے دوستوں اور اس کی مصروفیات پر کڑی نظر رکھیں۔ اور روی کہتا تھا۔
 ”یہ اس کا قصور نہیں ہے، بلکہ اس کی آیا اماں کا قصور ہے جس نے بچپن میں اسے دودھ پلایا تھا۔“

مگر اب وہ کافی بدل گئی تھی اور اس نے خود کو اس بات کا عادی بنا لیا تھا کہ اس کا تعلق جس طبقے سے ہے اس طبقے میں اسے محض جذباتیت کہا جاتا ہے۔ سو اسے اب ماما اور پاپا کی توجہ کی اتنی پروا نہیں رہی تھی اور اکثر تو کئی کئی دن تک اس کی پاپا اور ماما

گیتی شرمندہ ہو گئی۔

”تم یہی چاہتی ہو ڈار لنگ بچپن سے ہی میں تمہیں اچھی طرح جانتی ہوں اور اب جو یہ تم رازی کی طرف مائل ہو رہی ہو نا۔ یہ بھی محض جذباتیت ہے اور اپنے ماحول سے فرار کی خواہش۔ جانو اگر انکل اور آنٹی تمہیں خالی ہاتھ اس ٹپ پونچے فو نو گرافر کے ساتھ رخصت کر دیں تو تم اس کے گھر میں ایک دن بھی رہ سکو۔“
 ”یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو۔ میں گاؤں میں رہنا پسند کرتی ہوں۔“

”اس لئے کہ تم نے گاؤں کو صرف فلموں میں دیکھا ہے۔ حقیقت میں نہیں۔“
 ”نیل! ڈیزی نے اسے پکارا۔“

”کہیں تم بھی تو اس بہرہ دہیے اکرام الحق کی محفلوں میں نہیں جانے لگی ہو۔ قسم سے تمہارا لیکچر سن سن کر کانوں میں درد ہونے لگا ہے۔“
 ”اگر وہ ایسی حقیقت پر مبنی باتیں کرتا ہے تو میں کسی دن ضرور جاؤں گی اس کی محفل میں۔“

”ہم سب چلیں گے ڈیزی۔“

پتلی نے کہا۔

”اس میں بڑی تھرل ہے اور بڑا گلیمر۔“

”روی سے کہتے ہیں، ہمیں کل ہی لے چلے۔“

”نہیں کل نہیں، میں ذرا شعر وغیرہ یاد کر لوں۔ ایک تو یہ کمبخت شعر حافظے میں بیٹھے ہی نہیں۔ قسم سے تینتیس سے جو ایک نمبر کبھی زیادہ لیا ہو اردو کے پیپر میں۔“

”مگر شعر یاد کرنا کیا ضروری ہے۔“

نیل نے پوچھا۔

”خدا خدا کر کے غالب و میر نے جان چھوڑی ہے۔“

سے ملاقات نہ ہوتی تھی اور کئی بار تو ایسا ہوا تھا کہ وہ رات کو نیلی یا ڈیزی کے ہاں ہی رہ گئی تھی اور ماما کو شاید خبر بھی نہ ہو کہ وہ گھر نہیں آئی اور نہ ہی اس نے اطلاع دینے کی کوئی ضرورت سمجھی تھی۔ مگر اب چونکہ وہ بہت دنوں کے لئے جا رہے تھے، اس لئے اس نے ماما کو انفارم کر دیا کہ وہ سوات جا رہی ہے۔

سوات کا پروگرام رومی نے بنایا تھا۔ اس کے پاپا کے ایک دوست کا بنگلہ تھا وہاں۔ وہ زندگی کی یکسانیت سے بڑی جلدی آتا جاتا تھا اور ایسے تمام پروگرامز اس کے دماغ کی اختراع ہوتے تھے۔

ممانے کوئی اعتراض نہیں کیا تھا حسب معمول وہ ذرا سا مسکرائی تھیں (وہ زیادہ کھل کر نہیں ہنستی تھیں کہ چہرے پر لکیریں نہ پڑ جائیں) ”ضرور جاؤ جاننا۔ یہی تو دن ہیں زندگی انجوائے کرنے کے۔“ نہ انہوں نے پوچھا تھا کہ وہ کس کے ساتھ جا رہی ہے اور کتنے دنوں کے لئے اور نہ ہی اس نے بتانے کی ضرورت محسوس کی تھی۔

”اور کچھ۔“

انہوں نے ٹیوٹر سے اپنی بھونٹیں بناتے ہوئے اسے دیکھا۔

”نوماما!“

وہ باہر نکل گئی۔ اور سیدھی نیلی کے ہاں پہنچی۔ وہاں سوائے شامی کے سب ہی تھے۔ ڈیزی رومی کے پیچھے پڑی ہوئی تھی کہ انہیں اکرام الحق کی طرف لے چلے۔

”تم کیوں مری جا رہی ہو، اس سے ملنے کے لئے۔“ نیلی نے چڑ کر کہا۔

پنکو اسے دیکھ کر ہنسی۔

”در اصل اسے بھی انگلیکچو نل بننے کا خط ہے۔“

”اور یہ کوئی مشکل تو نہیں ہے۔“

رومی نے اسے سمجھایا

”ایک چادر لپیٹ لو۔ کھدر کا سوٹ پہن لو، ہونٹوں پر ایک اداس سی مسکراہٹ سجالو، آنکھوں میں ذرا سا خمار ہو کچھ مندی مندی کچھ کھلی کھلی آنکھیں۔ دھیمے دھیمے کچھ سوچتے ہوئے خلا میں نگاہیں جمائے ٹھہر ٹھہر کر بات کرو۔ کچھ معنی خیز، علامتی مشکل باتیں جنہیں مخاطب سمجھ ہی نہ سکے تو بس تمہاری انگلیکچو نل ہو۔“

”بکواس نہ کرو۔“

ڈیزی نے اس کی پیٹھ پر مکہ مارا۔

”اکرام الحق بڑی اونچی چیز ہے۔ مذاق مت اڑاؤ اس کا۔

مانی سنجیدہ ہو گیا تھا۔

”بیعت کر لی ہے اس کے ہاتھ پر۔“

”یہی سمجھ لو۔“ مانی سچ بچہ برامان گیا تھا۔

”اچھا بابا دیکھیں گے کسی دن تمہارے ان اکرام الحق صاحب کو۔ اس وقت تو ذرا

پروگرام سیٹ کر لو۔ کہ کب روانہ ہونا چاہئے۔“

”شامی کو بھی کسی نے بتایا؟“

پنکو نے کاجو کھاتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں اس کی کرن کماری بھی چلے گی ساتھ۔“

”رنیلی!“

ڈیزی ایک دم خوش ہو گئی۔

”بہت پیاری ہے۔“

”مجھ سے بھی زیادہ۔“

نیلی نے ہونٹ لٹکائے۔

”ہاں تم سے بھی زیادہ۔“

”پھر اسے ہم ساتھ نہیں لے کر جائیں گے۔“

”وہ شامی کی فرینڈ ہے۔“

روی نے اسے اطلاع دی۔

”اور رازی بھی جائے گا ہمارے ساتھ۔“

”رازی! پنکو نے برا سامنہ بنایا۔“

”پتا نہیں، کیوں یہ شخص مجھے ذرا اچھا نہیں لگتا جیسے پوز کر رہا ہو۔ جیسے اس میں اصلیت نہ ہو۔“

”ہاں تم بڑی قیافہ شناس ہونا۔“

”دیکھ لینا ایک دن تمہیں پتا چلے گا کہ یہ شخص بہت بڑا بہر و پیا ہے۔ اور اس کے ظاہر اور باطن میں بڑا فرق ہے۔“

”نہیں بھئی، معصوم سا بندہ ہے۔ ہماری محفل میں گھبراہٹ سا رہتا ہے۔ گاؤں کا ہے

نا۔ اور پھر اس کے اور ہمارے ماحول میں بہت فرق ہے۔“

”بور باتیں نہ کیا کرو، یار و چلو کوئی اچھی سی فلم لگاؤ۔“

نیلی اٹھ کر فلم لینے چلی گئی اور وہ سوات کی باتیں کرنے لگے۔

سوات میں سب نے خوب انجوائے کیا تھا وہ تقریباً پندرہ دن وہاں رہے تھے اور ان پندرہ دنوں میں رازی گیتی کے بے حد قریب آ گیا تھا گیتی بھی اس سے متاثر ہوئی تھی۔ وہ سب کی موجودگی میں اسے وار فگی سے سکتا، وہ شرماتا تھا تو جذباتی ہونے لگتا۔

”گیتو! تم نے مجھ پر جادو کر دیا ہے۔ میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔ مگر یہ فاصلے جو میرے اور تمہارے درمیان ہیں کیا انہیں پانا جاسکتا ہے گیتو۔“

خدا کے لئے گیتی کچھ کرو۔ میں تمہارے بنا جی نہیں پاؤں گا۔“

گیتی سے کبھی کسی نے ایسی باتیں نہیں کی تھیں۔ وہ ہر گزرتے دن کے ساتھ اس

کی باتوں کے سحر میں جکڑی جا رہی تھی اور سوات سے واپس آ کر اس نے محسوس کیا کہ وہ رازی کے بغیر نہیں رہ سکتی۔ چند دن وہ رازی سے نہیں ملی تھی تو اسے زندگی بڑی پھینکی پھینکی اور بے رنگ لگنے لگی تھی۔ تب اس نے ایک شام ماما سے کہا۔

”ماما! میں رازی سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔“

”ارے نصر سن رہے ہو، بے بی بڑی ہو گئی ہے۔“ ماما نے اس کے بجائے پاپا کو مخاطب کیا تھا اور آئینے کے سامنے کھڑے ٹائی باندھتے ہوئے شیخ نصیر الدین نے مڑ کر اسے دیکھا۔

”اوہ گاڈریلی از رین! ہمارا بیٹا بڑا ہو گیا ہے۔“

”آل رائیٹ جانو کسی دن ملو اونار رازی سے۔“

انہیں کلب کے سالانہ ڈنر میں شرکت کرنا تھی۔ اس لئے وہ جلدی میں تھیں انہوں نے پوچھا تک نہیں کہ وہ کون ہے، کیسا ہے۔ کیا کرتے ہے ہو لے سے اس کا گال تھپتھپا کر اپنے اوپر اسپرے کرتی وہ باہر نکل گئیں۔ البتہ پپانے اس کے متمنائے ہوئے چہرے اور اس کی چمکتی ہوئی آنکھوں کو دیکھا۔

”رازی! ہماری بیٹی کا انتخاب ہے تو اچھا ہو گا۔ مگر اس کے ڈیڑی کیا کرتے ہیں۔“

”اس کے والدین کا انتقال ہو چکا ہے۔“

”اوہ ویری سیڈ۔ اور وہ خود کیا کرتا ہے۔ بزنس۔“

”نو پپا! اس نے گھبراہٹ میں انگلیاں مروڑیں۔“

”وہ ایک فوٹو گرافر ہے۔“

”اوہ نو۔“ انہیں شک لگا۔

”فوٹو گرافر۔“

”جی پپا۔“

”نیتی! تمہاری ایک فوٹو گرافر سے شادی نہیں ہو سکتی۔“

”آئی لو۔ ہم ہوا!“

”اوہ نان سنس! کیا بچپن ہے یہ۔“

”یہ بچپن نہیں ہے۔“

اس نے ضدی لہجے میں کہا۔

”اچھا جاؤ پھر بات کریں گے ابھی مجھے ایک میننگ میں جانا ہے۔“

پھر ماما اور پاپا۔۔ دونوں نے ہی اسے سمجھایا تھا لیکن اسے کسی بات کی پروا نہ تھی نہ طبقاتی اونچ نیچ کی اور نہ زمانے کی۔

”آل رائیٹ!“ ماما نے ہتھیار ڈال دیئے۔

”لوگ کیا کہیں گے ڈارلنگ۔“ نصیر الدین نے کہا۔

”لوگوں کے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ دوسروں سے کہتے پھریں۔ خوبصورت

لڑکا ہے۔ اسے تم سپورٹ کرو۔ ڈیزر دو چار پارٹیاں دو۔ اسے بلاؤ۔ اپنے حلقہ احباب میں

انٹرویو کرو۔ اس کی شخصیت میں اٹریکشن ہے۔ اسے اپنی فرم میں کوئی جاب دو۔

شیئر رکھ دو اس کا۔ اور پھر گیتی کی انگیجمنٹ کا اعلان کر دیں گے۔“

”ٹھیک ہے۔“

اور یوں ایک چھوٹی سی تقریب میں رازی نے گیتی کو انگوٹھی پہنادی۔

روی اور شامی کو اس کا یہ فیصلہ کچھ زیادہ پسند نہیں آیا تھا۔

”گیتو! تم نے کچھ جلدی نہیں کی! ابھی تو ہم نے اسے اچھی طرح جانا بھی نہیں

تھا۔ ایسے آدمی ذرا دیر سے کھلتے ہیں۔“

”میں تو صرف ایک بات جانتی ہوں روی کہ وہ مجھ سے محبت کرتا ہے اور مجھ سے

کبھی کسی نے محبت نہیں کی نہ ماما نے، نہ پاپا نے۔ میں نے ہمیشہ اپنے آپ کو اکیلا اور تنہا

محسوس کیا ہے۔“

اس نے ادا سی سے کہا۔

”ہو سکتا ہے میرا انتخاب غلط ہو اور زندگی کے کسی موڑ پر مجھے پچھتاوا ہو۔ شاید میں

ابھی اتنی بڑی نہیں ہوئی ہوں کہ اپنے لئے بہتر فیصلہ کر سکوں۔ مگر میں اس خوشی سے

محروم نہیں ہونا چاہتی تھی روی تھوڑے عرصہ کے لئے ہی سہی اپنے اندر ایک انوکھی

سی خوشی محسوس کر رہی ہو۔ یہ خوشی دو طرح کی ہے ایک رازی کی محبت پانے کی خوشی

اور دوسری یہ خوشی کہ میں نے ماما، پاپا کو اپنی طرف متوجہ کیا ہے۔ وہ زندگی میں پہلی بار

میرے لئے پریشان ہوئے۔ انہوں نے میرے لئے سوچا۔ مجھے وقت دیا اپنی روٹین

سے ہٹ کر میرے پاس بیٹھے۔ مجھے سمجھایا۔ میرے لئے پلان بنائے۔ یہ سب بہت

اچھا۔ روی، بہت اچھا تھا۔“

”تم بھی بس عجیب ہو گیتو۔ ہم سب سے قدرے مختلف۔“

روی ہنس دیا۔

”اگر تم فیصلہ کرنے میں جلدی نہ کرتیں تو۔“

”تو کیا؟“

”کچھ نہیں۔“

”ہم ہمیشہ اچھے دوست رہیں گے روی۔ ہم سب۔“

”یہ جو متوسط طبقے کے لوگ ہوتے ہیں، اندر سے بڑے تنگ نظر ہوتے ہیں۔“

شامی نے پہلی بار گفتگو میں حصہ لیا۔

”اور تم کیا سمجھتی ہو کہ رازی سے شادی کے بعد بھی تم ہمارے ساتھ یوں ہی اتنی

بے تکلفی کے ساتھ ملا کرو گی۔“

”ہاں کیا حرج ہے۔ میں نے زندگی کے بے شمار سال تم لوگوں کے ساتھ گزارے

ہیں بہت سی شامیں بہت سی صبحیں۔ میں نے اپنے اندر اداسیوں کو تمہارے ساتھ شیئر کیا ہے اور تم نے میری بقول تمہارے خود ساختہ اداسیوں کو دور کرنے کی کوشش کی ہے۔“

”تم بہت سادہ دل ہو گیتی۔ چلو کوئی اور بات کرو۔ بلکہ آؤ ذرا ڈیزی کے ماں چلیں۔ اسے فلو ہو رہا تھا۔“

”نہیں، مجھے ذرا رازی کی طرف جانا تھا۔ ہمارا پروگرام تھا ذرا لاگ ڈرائیو پر جائیں گے پھر اکٹھا ڈنر کریں گے۔“

”یہ رازی نے تو ابھی سے ہی تمہیں ریزرو کر لیا ہے۔“ روی ہنسا۔

”ویسے ایک بات تو بتاؤ گیبتو۔“

شامی نے جاتے جاتے پوچھا۔

”تمہاری منگنی کو دو ماہ ہو گئے ہیں۔ تقریباً اس دو ماہ کے عرصہ میں یقیناً تمہاری رازی سے کافی انڈر اسٹینڈنگ ہو گئی ہوگی۔ رازی نے کبھی تمہیں اپنے عزیزوں کے بارے میں کچھ بتایا۔ ماں، باپ، بہن، بھائی کسی سے ملوایا۔“

”نہیں۔ اس نے بہت پہلے بتایا تھا کہ اس کے والدین حیات نہیں ہیں اور باقی عزیزوں کا کبھی ذکر نہیں کیا۔“

”اچھا اس کے رویے میں کوئی فرق۔“

”نہیں!“

اس کی محبتوں کی شدتوں کو یاد کر کے اس کے رخسار دمک اٹھے تھے۔ اس کی وار فنگی تو پہلے سے زیادہ بڑھ گئی تھی۔

”مگر تم یہ سب کچھ کیوں پوچھ رہے ہو شامی۔“

”در اصل۔ دراصل۔“

وہ کہتے کہتے کچھ جھجک گیا۔

”مونئی بتا رہا تھا کہ اسے کسی نے بتایا ہے کہ رازی کے والدین گاؤں میں رہتے ہیں اور یہ کہ اس کا باپ کافی عرصہ سے بیمار ہے۔ اور مجھے یہ بات کھٹک رہی ہے کہ اس نے جھوٹ کیوں بولا۔“

”نہیں تو بھلا اس میں جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت تھی۔ شامی، مونئی کو غلط فہمی ہوئی ہوگی۔“

”ہاں شاید۔“

شامی نے کہا اور وہ دونوں اسے خدا حافظ کہہ کر چلے گئے۔ مگر وہ کچھ الجھ سی گئی۔ شامی کو تو اس نے کہہ دیا تھا کہ اسے غلط فہمی ہوئی ہوگی۔ مگر خود وہ تھوڑی اپ سیٹ ہو گئی تھی اس نے سوچا وہ رازی سے مونئی کی بات کا ضرور تذکرہ کرے گی ورنہ خواہ مخواہ ذہن میں الجھن رہے گی۔ رازی نے اسے چھ بجے کا وقت دیا تھا لیکن وہ کچھ پہلے ہی اس کے فلیٹ پر پہنچ گئی۔ ایک کمرے کا یہ فلیٹ سیڑھیاں چڑھ کر تھا۔ آخری سیڑھی پر پہنچ کر وہ لمحہ بھر رکی۔ اندر سے رازی کی آواز آرہی تھی۔

”شاید کوئی اور بھی ہے اندر، رازی کا کوئی دوست۔“

اس نے پوچھا اور دستک دیتے دیتے ٹھٹک گئی۔ رازی کے دوست کی آواز بہت اونچی اور واضح تھی۔

”تو گویا مچھلی جال میں پھنس گئی۔“

”ہاں یار! پھنس ہی گئی۔“

رازی کا قہقہہ بہت بلند تھا۔

”اور بھابھی۔ کیا بھابھی کو پتا ہے سب؟“

”ہاں یار، اسی کی خاطر تو سب کچھ کر رہا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ میرے شہزادوں

”کیا ہوا ہے تمہیں گیت جان طبیعت تو ٹھیک ہے نا تمہاری۔ اندر آ جاؤ۔ ایسے کیوں کھڑی ہو۔“

اس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے چمکنے لگے تھے۔
گیتی نے ایک قدم آگے بڑھایا۔

اس کا چہرہ سخت ہو رہا تھا۔ اس نے انگلی سے انگوٹھی۔۔ اتار کر میز پر رکھ دی۔
”کبھی کبھی کوئی بڑی مچھلی جال میں پھنسنے کے بعد بھی نکل جاتی ہے رازی۔“
وہ مڑی اور تیزی سے سیڑھیاں اترتی چلی گئی۔



اس حادثے نے گیتی آر کو توڑ کر رکھ دیا تھا۔ کاش! وہ ایک غریب لڑکی ہوتی۔
اور رازی نے دولت کے لالچ میں اس سے محبت نہ کی ہوتی۔ ”میں گیتی آر
نصیر الدین کیا اس قابل نہیں تھی کہ کوئی مجھ سے محبت کرتا۔ سچی اور بے ریا محبت۔“
وہ گھنٹوں آئینے کے سامنے کھڑی ہو کر اپنے آپ کو کتنی رہتی۔
یہ آنکھیں، یہ ہونٹ، یہ رنگت، یہ قامت! کیا کسی میں بھی رازی کے لئے
اٹریکشن نہ تھی وہ آئینے پر کئے برسائے لگتی۔ ہاتھ زخمی کر لیتی اور پھر چیخ چیخ کر روتی
دھاڑیں مار مار کر۔ وہ شدید ڈیپریشن کا شکار تھی۔ ماما نے اسے ہسپتال میں داخل کر دیا۔
رازی نے اپنے چار آنے شیئر کے لئے کیس کر دیا تھا۔
”گھٹیا، کبخت، ذلیل!“

نصیر الدین اسے گالیاں دیتے۔

رازی کے اس حادثے نے ماما کو بھی ڈپریشن کر دیا تھا۔ وہ ریلیکس ہونے کے لئے
امریکہ چلی گئیں۔ گیتی جب ہسپتال سے گھر آئی تو گھر میں وہی سناٹے اور خاموشی تھی۔
پاپا سے کبھی کبھار ہی ملاقات ہوتی۔ وہ گاڑی لے کر ساحل کی طرف نکل جاتی اور گھنٹوں

جیسے بیٹے میری طرح گاؤں میں ”رل“ کر پللیں۔ میں انہیں اعلیٰ اسکولوں میں تعلیم
دلوانا چاہتا ہوں اور میں چاہتا ہوں کہ ان کے سارے خواب پورے کروں اور انہیں
میری طرح ترسانہ پڑے۔“

”تو کیا تم گیتی کو طلاق دے دو گے۔“

”ہاں دے دوں گا۔ لیکن اس کے لئے کچھ انتظار تو کرنا ہی پڑے گا نا۔ تمہیں پتا ہے
اس کے پپانے ایک کمپنی میں میرا چار آنے شیئر رکھا ہے لیکن یہ میری منزل نہیں ہے۔
میں تو تمام کاروبار کا مالک بننا چاہتا ہوں۔ نصیر الدین گروپ آف انڈسٹریز کا تہا مالک۔“
اس نے قہقہہ لگایا اونچا اور زوردار قہقہہ۔ گیتی آر آنے کرنے سے بچنے کے لئے
دیوار کا سہارا لے لیا۔

”مگر یار! سنا ہے، وہ خوبصورت لڑکی ہے۔ کہیں سچ مچ محبت نہ کر بیٹھنا۔“

”خوبصورت اور محبت۔“ وہ ہنسا۔

”ان بورڈ والوں کی خوبصورتی تو بیوٹی کلینک کی مرہون منت ہوتی ہے۔ اور
میں تو اندر سے بڑا دقیانوسی آدمی ہوں۔ میں تو چاہتا ہوں کہ میری بیوی کو کوئی دیکھے
تک نہ۔ اور گیتی۔ رات دو دو بجے تک دوستوں کے ساتھ گھومتی ہے۔ گیتی محض ایک
ذریعہ ہے۔ کچھ پانے کا۔ اور محبت تو میں نے صرف شمی سے کی ہے۔ شمی میرے بچوں
کی ماں، میرے بچپن کی محبت۔“

اور گیتی آر آنے بڑی ہمت کر کے دروازے پر ہاتھ رکھا تو وہ کھلتا چلا گیا۔ شاید
وہ اندر سے بند نہیں تھا۔

”گیتی! ارے تم آ بھی گئیں چھ بچ گئے۔“

رازی کھڑا ہو گیا۔ گیتی دروازے میں کھڑی اسے دیکھتی رہی۔ اس کی آنکھوں میں
آنکھیں ڈالے۔ رازی گھبرا گیا۔

ساحل پر بیٹھی گیلی ریت کو مٹھیوں میں بند کر کے نیچے گرائی رہتی اور سوچتی رہتی۔
روی کہتا ہے۔

”میں خوبصورت ہوں۔“

مانی نے ایک بار کہا تھا۔

”گیتو! تم کسی سے نفرت نہیں کر سکتیں تمہارا دل بڑا گداز ہے۔“

شامی کہتا ہے۔

”تم سچ مچ کسی شاعر کا خوبصورت گیت ہو۔“

پر کون جانے میں کیا ہوں۔

”میں گیتی آرا شیخ نصیر الدین کی اکلوتی بیٹی۔“

مما ڈار لنگ کی لاڈلی شہزادی۔

بے حساب جائیداد کی تہاوار۔

مگر کتنی تنہا۔ کتنی اکیلی۔ میرے ارد گرد لوگوں کا جھوم ہے۔ بظاہر مجھے چاہنے والے
مجھ پر جان چھڑکنے والے۔

پر کیا پتا یہ بھی اندر سے رازی کی طرح ہوں۔ فریبی، دھوکے باز، دولت کا بھوکا۔
کنگلا فونو گرافر۔

محبت کے سراب دکھا کر میری جائیداد پر قبضہ کرنا چاہتا تھا اور میں اس بھری دنیا
میں کتنی تنہا ہوں۔

کیا ہوتا جو ماما امریکہ نہ جاتیں اور میری خاطر رک جاتیں۔ میرے پاس بیٹھ کر
میرا سر سینے سے لگا کر میرے دکھ کو شیر کرتیں۔

اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آتے اور گیلی ریت پر اس کے آنسو قطرہ قطرہ کر کے
گرتے۔

اس شام بھی وہ ساحل پر تنہا بیٹھی تھی۔ کہ وہ سب روی کی راہنمائی میں اسے
کھوجتے ہوئے آگئے۔

”یہ کیا بوریت ہے گیتو۔“

پنکی نے پیچھے سے آکر اس کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔ ”اب بھول بھی جاؤ اس
کینے کو۔“

”تمہیں کس نے کہا کہ وہ مجھے یاد آتا ہے آئی۔ ہیٹ ہم (مجھ نفرت ہے اس سے)

”تو پھر یہ سب کیا ہے؟“

ڈیزی نے پوچھا۔

”لوٹ آؤ واپس، نہیں تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔“

نیلی نے غصے سے کہا۔

”اور خبردار جواب تم نے اس کینے کو سوچا بھی۔“

”دیکھو نا تمہاری وجہ سے مما کتنی اپ سیٹ ہو گئی تھیں۔“

”میری وجہ سے۔“ اس نے حیرت سے اسے دیکھا۔

ہاں تمہارے حادثے نے انہیں ڈپریشن کر دیا تھا۔ جیسی تو وہ دل بہلانے کے لئے
گئی ہیں۔“

”اوہ ہاں!“ وہ ہنسی۔

”مما مجھ سے اتنی محبت کرتی ہیں اتنی شدید اور میں سمجھ رہی تھی کہ انہیں مجھ سے

محبت ہی نہیں ہے۔ اتنی شدید محبت کہ انہیں ڈپریشن ہو گیا اور وہ امریکہ چلی گئیں۔“

پھر وہ ہنستی چلی گئی عجیب مجنونانہ سی ہنسی تھی۔

”تم صحیح کہتے ہو روی!“

اس نے ہنستے ہنستے کہا۔

”میرے اندر اپنی بوڑھی آیا کی روح حلول کر گئی تھی۔ میں چاہ رہی تھی کہ مجھے دلا سادیں اور میں ان کی گود میں سر رکھ کر رو دوں۔ اور پتا مجھے ڈانٹیں کہ وہ تمہارا انتخاب تھا اور پھر گلے سے لگا کر شفقت سے سمجھائیں۔ ہاؤسٹوپڈ آئی۔ ایم۔
در اصل۔ اس نے بے تحاشا ہنسنے کی وجہ سے آنکھوں سے نکل آنے والے آنسوؤں کو پونچھا۔

”مجھے محبت کی کچھ صحیح پہچان نہیں ہے۔“

”پر آج رومی مائی فرینڈ میں نے اپنے اندر سے اپنی بوڑھی آیا کی روح کو باہر نکال دیا ہے۔“

ایڈناؤ آئی۔ ایم۔ آ۔ ڈیفرنٹ گرل۔ (اب میں بالکل مختلف لڑکی ہوں)۔
وہ ہاتھ جھاڑ کر کھڑی ہو گئی۔

”آؤ، خوب گھومیں۔ تم آج مجھے والز سکھانا۔ اور تم بہت اچھا رقص کرتے ہو۔ اور ہاں آج رات کو ڈنر کے بعد تمہارے اس انفلکچوئل دوست کی طرف بھی جائیں گے۔“
سب نے حیرت سے لمحہ بھر اسے دیکھا۔ اور پھر سر جھٹک کر ہنس دیئے اور ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے قہقہے لگاتے۔ ہنسنے اپنی گاڑیوں کی طرف بڑھ گئے۔

”روشنی ایک تھی روشنی کی تفسیر کی گئی۔ ہر عہد میں، ہر دور میں ثابت صرف اسے ہی تھا۔“

اکرام الحق صاحب بول رہے تھے ان کی آواز میں بڑا تاثر۔ بڑی گھمبیر تا تھی۔
محفل میں موجود افراد سب دم بخود تھے، ساکت تھے اور گیتی آراء میں ہاتھ کی ہتھیلی پر ٹھوڑی ٹیکے انہیں تکتے جا رہی تھی اور ان کا لفظ لفظ دھیان سے سن رہی تھی۔
”پھر آخری آدمی آیا اور صدیاں اس کے سامنے سرنگوں ہو گئیں۔“

”کیا روشنی حوالوں اور ذریعوں کی محتاج تھی؟“
محفل میں سے کسی نے سوال کیا۔

اکرام الحق نے کھوئی کھوئی نظروں سے اسے دیکھا ان کی شریقی آنکھوں میں سرخ ڈورے تیر رہے تھے اور وہ دور کہیں خلا میں دیکھ رہے تھے۔ گیتی کو لگا جیسے کوئی چشمہ چلتے چلتے بہتے بہتے رک گیا ہو۔ ان کے لہجے میں، ان کی گفتگو میں ندیوں کی سی روانی اور ترنم تھا۔ لمحہ بھر مخاطب کو دیکھنے کے بعد ان کے ہونٹوں پر ایک مدہم سی مسکراہٹ ابھری۔
”نہیں ذریعہ صرف ذریعہ ہے مقصد نہیں، حاصل نہیں۔ ذریعے کی شکست مقصد کی شکست نہیں۔“

اور۔

انہوں نے حاضرین مجلس پر ایک نظر ڈالی۔
”روشنی موجود ہے، آنکھیں بھی ہیں پھر ذریعے کی کیا ضرورت ہے۔ راستہ کھلا ہے۔ دیدار کر لو۔“

”ہاں! تو میں کیا کہہ رہا تھا۔“

انہوں نے سوال کرنے والے کو مطمئن کر کے ٹوٹا ہوا سلسلہ جوڑا۔

”روشنی بے حجاب نہ تھی، پھر آخری آدمی آیا اور اس نے آخری قانون کہہ دیا۔“
گیتی کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اکرام الحق کیا کہہ رہے ہیں۔ لیکن پھر بھی وہ متاثر ہو رہی تھی۔ ان کا لہجہ انکی گفتگو کا انداز سب کچھ متاثر کرنے والا تھا۔ مانی صحیح کہتا تھا کہ وہ بہت اونچے آدمی ہیں۔

آج انہوں نے بہت انجوائے کیا تھا۔

رومی نے اسے والز سکھایا تھا۔ پھر وہ مانی کے ایک دوست نوید الحسن کے ”سنگر کلب“ گئے تھے۔ وہاں صرف اچھل کود تھی۔ این۔ وی۔ ٹی گروپ کے اوٹ پانگ

اور یہ احتشام، شامی

اور یہ گیتی اور ڈیزی اور پنکو۔

وہ تینوں کے سامنے یوں ہی ہاتھ باندھ کر تھوڑا سا سر خم کر کے واپس پلٹ گئے۔

”ہندوؤں کا سا اسٹائل ہے۔“

پنکی نے ڈیزی کے کان میں کہا۔

گاؤ تکے سے ٹیک لگا کر بیٹھتے ہوئے انہوں نے باری باری سب کی طرف دیکھا اور

پھر ان کی نگاہیں گیتی پر ٹھہر گئیں۔

”کیا بات ہے بھی مانی میاں، تمہارے دوست کچھ پریشان ہیں کیا؟“

گیتی نے گھبرا کر نظریں اٹھائیں۔

ان کی نگاہیں گیتی کے چہرے پر تھیں اور سونوں پر بدھم ی مسکرات تھی۔ گیتی

نے آج خوب انجوائے کیا تھا۔ اتنی ہنسی تھی، اتنے قہقہے لگائے تھے کہ اس کے جڑوں میں

درد ہو رہا تھا۔ پھر۔ پھر بھی شاید کہیں اس کے چہرے پر ملال کے رنگ باقی رہ گئے تھے۔ یا

اس کی آنکھوں میں کوئی اضمحلال تھا کہ اکرام الحق صاحب نے یہ بات کی تھی۔ بلا کے

قیافہ شناس تھے وہ۔ اس نے ان کی کھوجتی نظروں سے بچنے کے لئے نگاہیں جھکا لیں۔

”ہاں سر گیتی کچھ اپ سیٹ ہے۔“ مانی نے بتایا۔

”دراصل اس کے ساتھ ایک ٹریجڈی ہو گئی ہے۔“ اس نے مختصر آساری بات

بتائی۔

”آپ اسے سمجھائیں۔ زندگی میں ایسے حادثے تو ہوتے ہی رہتے ہیں۔“ شامی

نے کہا۔

”وہ بڑا گھٹیا شخص تھا سر، آپ تو جانتے ہیں نارازی کو۔ یہاں ہی پہلی بار وہ مجھے ملا تھا۔“

”دراصل ہم سب ہی اندر سے کسی حد تک گھٹیا، کینے اور بزدل ہوتے ہیں۔“

گانے سنے تھے۔ اور پھر واپسی پر ”تاپوا“ میں ڈنر لے کر وہ اکرام الحق کی قیام گاہ پر آ گئے تھے یہاں کچھ لوگ جمع تھے۔ زمین پر درری بچھی تھی۔ ایک خاتون اور سات آٹھ مرد بیٹھے تھے اور اکرام الحق صاحب گاؤ تکے سے ٹیک لگائے بول رہے تھے اور سب دم بخود سن رہے تھے۔ مانی نے سرگوشی میں انہیں بھی بیٹھنے کو کہا تھا۔ ”تم تو کہہ رہے تھے مانی کہ وہ کوئی شاعر ادیب قسم کی چیز ہیں۔ مگر یہ تو کوئی مولوی ٹائپ چیز لگ رہے ہیں۔“

پنکی کو شاید مایوسی ہوئی تھی۔

”ہش۔“

مانی نے اسے خاموش کرادیا۔

”وہ ہر موضوع پر اتھارٹی ہیں۔ ویسے اس طرح کی گفتگو کرتے ہوئے میں نے بھی

پہلی بار سنا ہے۔“

”اوپر سے گزر گئی ہے۔“

شامی نے بھی سرگوشی کی۔

بات ختم کر کے انہوں نے ہاتھ اٹھایا۔ تو لوگ ایک ایک کر کے اٹھنے لگے۔ پھر وہ

مانی کی طرف مڑے۔

”کیا حال ہے مانی میاں، بڑے دنوں بعد آئے۔“

”جی بس یوں ہی مصروفیت۔“

مانی بہت مؤدب نظر آ رہا تھا۔

”یہ میرے دوست ہیں، بہت اشتیاق تھا انہیں آپ سے ملنے کا۔“

وہ مسکرائے، اپنی جگہ سے اٹھے، گرم شال بغل سے نکال کر کندھے پر پڑی تھی۔ وہ

ایک ایک کے پاس جا کر رکتے ذرا سا جھک کر دونوں ہاتھ جوڑتے۔ مانی تعارف کروا رہا تھا۔

”یہ راجیل ہے۔ روی۔“

انہوں نے نرمی سے کہا۔ اور گیتی سے مخاطب ہوئے۔ ”یہ سوچ کر اسے معاف کر دو اور اپنے دل کے بوجھ سے فراغت پالو۔ قصور وار وہ بھی نہیں ہے۔ قصور تو اس کی غربت کا ہے جس نے بچپن سے اسے جکڑ رکھا تھا۔ ذرا اسی خواہشوں نے اسے ترسایا ہوگا، تڑپایا ہوگا اور اب جب تم اس کے سامنے آئیں تو اس نے سوچا کہ شاید تم وہ ذریعہ بن جاؤ جس سے وہ اس غربت سے نجات پالے۔ اور اس کے بچے اس طرح نہ ترسیں جیسے وہ ترسا ہے۔“

پنکو، ڈیزی اور وہ حیران سی انہیں دیکھ رہی تھی۔

کچھ دیر پہلے وہ کسی عالم مولوی کے لبادے میں تھے اور اب یہ لبادہ اتار کر انہوں نے ایک سوشلسٹ کا لبادہ اوڑھ لیا تھا۔ وہ غربت کے خلاف بول رہے تھے، لیکن ان کے لہجے میں وہی حلاوت، وہی شیرینی، وہی دھیماپن اور وہی اثر تھا۔ اور جب ایک گھنٹے بعد وہ سب اٹھے تو کافی حد تک متاثر ہو چکے تھے۔

”میرا خیال ہے کبھی کبھی زبان کا ذائقہ بدلنے کے لئے ان کی محفل سے مستفید ہوا جاسکتا ہے۔“

شامی نے کہا اور سب نے اس کی تائید کی۔

گیتی نے اپنے آپ کو مکمل طور پر بدل ڈالا تھا۔ وہ بقول پنکو کے زندگی سے صحیح انجوائے کر رہی تھی۔ وہ سب مل کر خوب گھومتیں، بونے، ڈنر، پارٹیاں، سنگرز، کلب، رقص پارٹیاں وہ سب میں گرجوشی سے حصہ لیتی ممانیریکہ سے واپس آئیں تو وہ دیکھ کر بہت خوش ہوئیں۔

”گڈ گرل! مجھے خوف تھا کہ تم کہیں اس کمینے فوٹو گرافر کا خیال دل سے نہ لگالو۔“ وہ بے حد فریض اور یگ لگ رہی تھیں۔

”جی ڈار لنگ میں تمہاری وجہ سے بہت اپ سیٹ ہو گئی تھی۔“

”سوری ماما میں نے آپ کو پریشان کیا۔“

اس نے ان کی پیشانی کو چوما۔

اور پرس جھلاتی کھڑی ہو گئی۔

”کہاں جا رہی ہو بے بی؟“

”وہ نیلی کے ہاں آج گید رنگ ہے۔“

وہ جو ماما کے قرب کے بہانے ڈھونڈتی تھی ان کے آنے پر بس ہیلو ہائے کر کے چلی آئی تھی۔

نیلی اسے دیکھ کر حیران ہوئی۔

”میرا خیال تھا تم آج نہیں آؤ گی۔“

”کیوں؟“

”تمہاری ماما جو تین ماہ بعد آئی ہیں۔“

”اوہ نان سنس میں کوئی دودھ پیتی بچی ہوں۔“

”ویری گڈ گیتو تمہاری یہ تبدیلی اچھی لگی۔“ وہ مسکرائی۔

”اور تمہارے پاپا کا کیا حال ہے؟“

”فائن! گیتی نے ادھر ادھر دیکھا۔“

”باقی لوگ کہاں ہیں، کیا ابھی نہیں آئے۔“

”مائی اور شامی آئے تھے اور پھر وہ کرن کو لینے چلے گئے۔ پنکو اور ڈیزی ادھر ہوں گی کیٹیش دیکھ رہی ہیں۔“

”یہ تمہارے پپا کو ہوا کیا تھا گیتو؟“

اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے نیلی نے پوچھا۔

”میرے پاپا کل شام ماما کو بتا رہے تھے کہ وہ ہسپتال میں تھے۔“

”ہاں!“ گیتی نے کندھے اچکائے۔

”چند دن ہاسپٹل میں رہے ہیں؛ شاید بلند پریش رہائی ہو گیا تھا۔“

”تم نے بتایا نہیں، ہم ہاسپٹل جاتے دیکھتے۔“

”کیا ضرورت تھی بھی بہترین نرسیں تھیں وی آئی پی روم تھا۔ میں بھی کیا کرتی

جا کر۔ مجھے یوں بھی اُن کی بیماری سے گھبراہٹ ہو رہی تھی۔ تمہیں پتا ہے، مجھے کتنی

شدید محبت ہے پایا سے، بس میں ذرا ڈپریشن دور کرنے کے لئے اکرام الحق کے ہاں چلی

گئی تھی۔“

”اکیلی گئی تھیں؟“

”ہاں۔ بہت مزہ آیا۔ بہت اچھی گفتگو کرتے ہیں۔“

”بہرہ روپیئے!“ نیلی نے برا سامنہ بنایا۔

”جو بھی کہو بہر حال دلچسپ آدمی ہیں۔ اس روزان کے ہاں ایک عجیب مخلوق

دیکھی۔“

مثلاً کیسی مخلوق۔

”ایک خاتون تھیں شاعر بننے کا شوق تھا اور غالباً کسی ادیب کی محبت میں گرفتار

تھیں۔ سچی نیلی کیا جھرجھر آنسو بہتے تھے۔ اسکی آنکھوں سے گھر سے بھاگ کر آئی تھی

اس ادیب کی محبت میں اور اب اس کا پتا ڈھونڈتی پھر رہی تھی۔“

”یہ ادیب بھی بس یونہی۔“

”ارے نہیں نیلی ڈیر۔“

گیتی نے اس کی بات کاٹ دی۔

”اس بے چارے ادیب کو تو پتا ہی نہیں ہو گا کہ کوئی پردہ دار بی بی اس کی محبت میں

دریا عبور کر آئی ہے۔“

”ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں دنیا میں۔“ نیلی کو حیرت ہوئی۔

”ہاں ڈیر یہ دنیا ہے۔“

”اور تمہارے اس بہرہ روپیے نے کیا کہا اس سے۔“

”اسے سمجھایا اور بتایا کہ جس ادیب کی تحریریں پڑھ کر وہ اسے کھوجتی، تلاشتی

یہاں تک آ پہنچی ہے، وہ تو سات بچوں کا باپ ہے۔“

”نیلی!“ نیلی نے قہقہہ لگایا۔

”ہاں۔ پھر اکرام الحق صاحب نے اسے دارالامان بھجوا دیا تھا۔ کیوں کہ وہ واپس

اپنے گھر جانے کے لئے تیار نہ تھی۔ حالانکہ اکرام الحق صاحب نے بہت کہا کہ وہ خود

اسے چھوڑ آئیں گے لیکن وہ تو مانتی نہیں تھی بس روئے چلی جاتی۔“

”بہرہ روپیے تو ہیں، لیکن پھر بھی کوئی بات ہے ان میں اٹریکٹ کرنے والی۔“

نیلی نے اعتراف کیا۔

”ہاں کچھ ہے جیسی تو جھگڑ لگا رہتا ہے۔“

گیتی نے کہا اور ہنسنے لگی۔

”کیوں ہنس رہی ہو؟“

”ادھر دیکھو۔“

پنکو اور ڈیزی آنکھیں بند کئے دیوار سے ٹیک لگائے جھوم رہی تھیں۔

”یہ کیا ہو رہا ہے۔“

نیلی نے پنکی کا کندھا پکڑ کر ہلایا۔

”ہوں!“

پنکی نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا، دیکھتی رہی اور پھر کھڑے ہو کر ہاتھ جوڑ کر

سر جھکا لیا۔

”اسٹوڈنٹ!“ گیتی نے اس کے کندھے پر ہاتھ مارا۔

”تم اس طرح ہاتھ جوڑ کر نمستے کر کے اکرام الحق نہیں بن سکتیں۔“

”میں مراقبے میں تھی، تم نے آکر ڈسٹرب کر دیا۔“

وہ بدستور سنجیدہ تھی۔

”بہت دن ہو گئے اکرام الحق صاحب کے ہاں گئے آج چلیں گے۔“

”ہاں چلیں گے۔“ ڈیزی نے بھی آنکھیں کھول دیں۔

”پہلے فلم دیکھیں گے، فرینک سناترا کے گانے سنیں گے۔ پھر کھانا کھا کر اور کوئی

ڈرنک لے کر خوب ناچیں گے۔“

ذرا آنکھوں میں خمار آجائے گا اور پھر چادریں لے کر ذرا سا بال بکھر کر جھومتے

جھامتے اکرام الحق صاحب کے ہاں جا پہنچیں گے اور پھر ان کی فلسفیانہ، مفکرانہ،

مولویانہ، شاعرانہ اور ادیبانہ باتیں سنیں گے۔“

”ہاں آج چلیں گے۔“

گیتی نے کہا اور قالین پر بکھری ہوئی کیٹیشیں دیکھنے لگی۔ کچھ ہی دیر بعد۔ روی، شامی

اور مانی آگئے۔۔

”کرن نہیں آئی۔“

”نہیں!“

شامی دھپ سے صوفے پر گر پڑا۔

”انڈیا سے اس کا کوئی کزن آیا ہوا ہے۔ اس کے ساتھ گھومنے چلی گئی ہے۔“

”اوہہ ریری سیڈ شامی۔“

ڈیزی نے ہمدردی سے اسے دیکھا۔

”اے مت چھیڑو۔ کرن کماری سے اسے سچ مچ محبت ہو گئی ہے سچی محبت۔“

روی نے ڈیزی کو بتایا۔

”یہ سچی محبت اور سچ مچ محبت کیا ہوتی ہے روی۔ اور جھوٹ موٹ محبت؟“

گیتی نے پوچھا

روی نے کیسٹ کی سائیڈ تبدیل کرتے ہوئے اسے دیکھا۔

”سچی محبت، سچی محبت ہوتی ہے جیسے ہیر رانجھے کی محبت اور جیسے سسی پنوں، اور

جھوٹی محبت، جیسی۔“ اس نے بات نامکمل چھوڑ دی۔

”جیسی رازی نے مجھ سے کی تھی۔“ وہ زور سے ہنسی۔

”نہیں بھائی محبت۔ صرف محبت ہوتی ہے نہ جھوٹ نہ سچ، وہ کچھ اور ہوتا ہو گا

محبت نہیں۔ محبت، محبت محبت ہے کیا؟“

ڈیزی نے لہک لہک کر گایا تو سب اس کے ساتھ شامل ہو گئے۔

”محبت زندگی ہے۔“

مانی نے تان لگائی۔

”محبت بندگی ہے۔“

اور وہ سب تالیاں بجا بجا کر کورس میں گانے لگے۔ البتہ شامی چپ بیٹھا نہیں

دیکھتا رہا۔

”پور بوائے۔“ (غریب لڑکا) گیتی نے آہستگی سے کہا۔

”مجھے تم سے ہمدردی ہے شامی اور وہ کرن کماری بھی اندر سے گھٹیا ہے، اس کنگے

فوٹو گرافر کی طرح، شامی کو وہاں ہی سوتا چھوڑ کر کھانا کھا کر وہ اکرام الحق صاحب کی قیام

گاہ پر آگئے خلاف معمول آج وہ اکیلے تھے۔ شاید لوگ آکر چلے گئے تھے یا آئے ہی نہیں

تھے۔ گیتی نے چاروں طرف دیکھا تو ایک طرف کونے میں کوئی بیٹھا تھا، ٹھوڑی گھٹنوں

پر ٹکائے دنیا دماغیہا سے بے، خبر جانے دري پر کیا دیکھ رہا تھا،

”آؤ آؤ بھی!“

اکرام الحق صاحب انہیں دیکھ کر خوش ہو گئے، گیتی نے غور کیا، اس شخص پر ان کا آمد کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا وہ اسی طرح سر جھکائے بیٹھا تھا وہ سب درری پر بیٹھ گئے۔ آرام الحق صاحب کے ہونٹوں پر وہی دلکش مسکراہٹ تھی، اور آنکھوں میں روشنی اور چمک۔ انہوں نے سر اٹھا کر اس بے خبر شخص کی طرف دیکھا۔

”ادھر آؤ میاں۔“ وہ سر جھکائے ان کے قریب چلا آیا۔ گیتی نے غور سے دیکھا۔

کشادہ پیشانی سانولے نگ اور خوبصورت آنکھوں والا یہ شخص بڑا مضمحل اور بڑا اداس سالگ رہا تھا۔ شاید اس نے ساتھ بھی کسی نے جھوٹ موٹ کی محبت کی ہے۔ یا پھر شامی کی کرن کماری کی طرح اس کی کرن کماری کا بھی کوئی کزن ہے جو ’نڈیا سے آگیا ہے۔

”یہ ہمارے نئے دوست ہیں۔“

انہوں نے محبت سے اس کی پیٹھ پر ہاتھ رکھا۔

”بے حد ذہین، بے حد ٹیلیٹڈ۔ خوبصورت لفظوں کے مالک۔ مستقبل ان کا ہے، شعر کہتے ہیں انگلش اردو دونوں میں اور نثر لکھنے میں بھی ان کا جواب نہیں۔“ مانی نے ہاتھ آگے بڑھایا۔

”بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔“

اس نے کھوئے کھوئے انداز میں ہاتھ آگے بڑھایا۔

”شکریہ، یہ محض ان کی خوش گمانی ہے۔ ورنہ نہ حال میرا ہے اور نہ مستقبل، اور میں نے تو اپنا ماضی بھی گنوا دیا ہے۔“

اس کے ماتھے پر شکنوں کا جال سا بن گیا تھا۔ اور خوبصورت آنکھوں میں دھند سی

چھاگئی تھی۔

”جس کے پاس نہ ماضی ہو نہ حال، مستقبل اس کا کیسے ہو سکتا ہے، میں تو بڑا تہی دست شخص۔ وں۔“ اس کے لہجے میں کوئی دکھ کوئی گہرا دکھ، رگوں کو کاٹنے والا دکھ بول رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں چھائی دھند کے پیچھے کئی خواب رو رہے تھے۔ شاید کسی کو نہ پاسکنے کا دکھ۔

کسی کرن کماری کو کھونے کا ملال۔

یا پھر کسی رازی کے فریب کا پردہ اچاک ہونے کا دکھ، گیتی نے سوچا۔

”ما۔۔۔ نہیں ہوتے جوان۔“

اکرام الحق کا ہاتھ اب بھی اس کی پیٹھ پر تھا جو گزر گیا۔ وہ مر گیا۔ اور مرے ہوؤں پر زیادہ افسوس کرنا بریکار۔ آگے دیکھو پیچھے کیا دیکھنا اور میری آنکھیں تمہاری پیشانی پر بلندی کا تاج دیکھ رہی ہیں۔ تم بہت نامور ہو گے میاں بہت نام کماؤ گے۔ یہ سب۔“ انہوں نے سب کی طرف دیکھا۔ ”یہ سب پیارے اور مخلص لوگ ہیں سچے اور بے ریا لوگ ان سے باتیں کرو۔

اور تم لوگ بھی ہمارے اس نئے دوست کو کمپنی دو، یہ یہاں اس شہر میں اجنبی ہے اور اسکے دس پر گزری باتوں کا بوجھ ہے، مانی میاں اسے ساتھ رکھا کرو۔ میں اس کے بخت کے ستارے کو بہت بلندی پر دیکھ رہا ہوں۔“

”آپ کہاں ٹھہرے ہوئے ہیں؟“ روی نے پوچھا۔

”میں!“ اس کی نگاہیں اکرام الحق کی طرف اٹھیں۔

”میں بے ٹھکانا تھا اکرام الحق صاحب نے یہ چھت مہیا کر دی ہے، یہاں ہی رہتا

ہوں۔“

نبھے میں بڑی تھکن تھی جیسے زندگی کا سارا سفر پُر خار۔ راہوں پر طے کیا ہو۔

”آج میرے یہ نوجوان دوست بہت دنوں بعد آئے ہیں کچھ سناؤ۔ کوئی نئی کوئی پرانی چیز۔“

وہ بغیر کچھ کہے اٹھا اور تیزی دیر بعد ایک سرخ رنگ کی ڈائری اٹھائے پلٹ آیا۔ ڈیزین کو وہ بالکل ایک روبوٹ کی طرح لگا۔ اکرام صاحب کی باتوں پر عمل کرتا ہوا کوئی مشینی آدمی۔

I am alone in this city of Pain every moment I keep melting with in.

اس کے لہجے میں سوز تھا اور آنکھوں میں ایک عجیب سی کیفیت تھی، یوں جیسے کوئی گہرا درد اندر ہی اندر اس کے دل کو چھیل رہا ہو۔ وہ سب خاموش بیٹھے سن رہے تھے اور انہیں لگ رہا تھا جیسے کوئی چیز ان کے سینوں میں پگھل رہی ہو۔

اس رات اس اجنبی نے انہیں بہت سی نظمیں غزلیں سنائیں، اردو میں بھی اور انگلش میں بھی۔ جب وہ واپس پلٹے تو سب ہی اس سے بے حد متاثر ہو چکے تھے۔ اور اتول ڈیزین کے وہ انجینی سے 99.99% متاثر ہو چکی تھی۔

”سو فیصد کیوں نہیں۔“

روی نے پوچھا۔

”سو فیصد میں اس سے متاثر ہوں گی جس سے عبت کروں گی اور پھر شادی کروں گی۔“

”تو کیا وہ میں ہوں؟“

مانی نے اس سے پوچھا۔

”ہرگز نہیں“ ڈیزین چیخنی۔

”اس روز ڈانس کرتے ہوئے تم نے تیس بار میرا پاؤں پکڑا تھا حق۔“

”کیا تمہاری زندگی کے ساتھی کے لئے ضروری ہے کہ وہ رقص میں ماہر ہو۔“

”ہاں۔“

”اور تمہیں پتا ہے مانی میں بہت اچھا رقص کرتا ہوں“

روی نے ڈیزین کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”لیکن تم کھاتے بے تحاشا ہو اور مجھے اس طرح کھانے والے مرد زہر لگتے ہیں،

جنہیں بیوی بھی کوئی مزیدار کھانے کی ڈش محسوس ہو۔“

”ہم کو تو بابا یہ نظر آتی ہیں روٹیاں۔“

پنگو کو اردو پرچے میں ہمیشہ تینتیس نمبر لینے کے باوجود اکثر شعر یاد رہتے تھے۔

وہ سب باتیں کر رہے تھے ہنس رہے تھے۔ خوش ہو رہے تھے اور گیتی آرا اس کے متعلق سوچ رہی تھی۔

وہ جس کے لہجے میں سوز تھا۔ آنکھوں میں تپش تھی۔

اور کشادہ پیشانی پر شکون کا جال سا بنا تھا۔ جیسے زندگی کی کوئی بڑی بازی ہار بیٹھا ہو۔

اور گاڑی بڑی سبک روی سے سڑک پر رواں تھی۔



”میں اپنی ذات کا اظہار چاہتا تھا گیتی اپنے بندر جلنے والی روشنیوں کو ساری دنیا کے

سامنے لانا چاہتا تھا سو میں وہاں سے چلا آیا۔“

اس نے گیتی آرا کے شاندار ڈرائیونگ روم میں اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے اس کے

بے حد اصرار پر بتایا۔

”مگر تمہارے اس شہر میں مجھے کانچ کے پلوں پر چلنا پڑا ہے۔ بڑا ظالم شہر ہے، لہو

لہو ہو گیا ہوں۔ تمہارے شہر نے میرے پاؤں کاٹ ڈالے ہیں اور اب ان کٹے ہوئے

پاؤں کے ساتھ میں واپس نہیں جاسکتا اور نہ ہی اپنا سفر جاری رکھ سکتا ہوں سو اکرام

ان کو دیکھتا اور سنتا رہتا۔ شامی نے کئی بار اپنی جیب سے چپٹی شیشی نکال کر اسے پیش کی تھی۔ روی نے ڈانس سکھانے کی کوشش کی تھی۔

مگر وہ بالکل چپ بیٹھا نہیں دیکھا کرتا۔ اور گیتی کن اکھیوں سے اسے دیکھتی، اس کی آنکھوں کا حزن اس کے چہرے کا مال، اس کے لہجے کا سوز اسے ڈسٹرب کر دیتا اور وہ گھنٹوں اس کے متعلق سوچتی رہتی۔

کون ہے یہ شخص

کیسا عجیب اور مختلف

رازی کے طبقے سے تعلق رکھنے والا۔

لیکن کتنا بے نیاز اور لا پرواہ۔

ایک بار بھی اس نے گیتی کی طرف نہیں دیکھا تھا ایک بار بھی رازی کے انداز میں بات نہ کی تھی، نہ اس کے بارے میں کوئی تجسس نہ کھوج۔

بس اپنے آپ میں گم اور تنہا۔

وہ کئی بار اکیلی ہی اس سے ملنے چلی گئی تھی۔

اکرام الحق صاحب دن کو گھر پر نہیں ہوتے۔ کسی دفتر میں کام کرتے تھے۔ وہ اکیلا ہوتا۔ خاموش بیٹھا کچھ سوچتا ہوا یا قلم ہاتھ میں لئے کچھ لکھتا ہوا۔

آج بھی وہ اکیلا تھا۔

وہ اسے زبردستی لے آئی تھی۔ اور اب اس کے ڈرائیونگ روم میں بیٹھا ہو لے ہو لے مدھم لہجے میں وہ اپنے دل کی گرہیں کھول رہا تھا۔

”اکرام صاحب اچھے آدمی ہیں، ہر ایک کی مدد کرتے ہیں۔ کیا انہوں نے تمہاری مدد نہیں کی۔“

”وہ بہت اچھے ہیں لیکن وہ اس طرح میری مدد نہیں کر سکتے۔“ اس نے تفصیل

الحق کی دہلیز پر پڑا ہوں۔“

گیتی بڑے دھیان سے اس کی باتیں سن رہی تھی۔

”وہاں تمہارا کون ہے؟“

”سب۔“ اس نے دور خلاؤں میں تکتے ہوئے کہا۔

”میرے سب اپنے۔“

”تمہارے ماں باپ۔“

”ہاں۔“

اس نے سر ہلایا۔

”تم واپس جانا چاہتے ہو۔“

”نہیں۔“ اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔

”میں نے کہا تھا۔ اب میں کچھ بن کر ہی لوٹوں گا جب دنیا مجھے پہچان لے گی۔“

”اور اب کیا لوگوں نے تمہیں پہچانا نہیں۔ وہاں اکرام صاحب کے ہاں جو لوگ

آتے ہیں سب تمہیں سراہتے ہیں تمہاری تعریف کرتے ہیں۔“

”یہ تو کچھ نہیں ہے گیت۔ میں کچھ اور چاہتا ہوں۔ کچھ اور۔“ وہ پر خیال نظروں سے اسے دیکھتی رہی۔



پچھلے تین چار ماہ میں ان سے ان سب کی اچھی خاصی دوستی ہو گئی تھی۔ روی کو وہ بہت اچھا لگا تھا۔ شامی کو اس کی شاعری پسند تھی۔ اسے اس کے شعروں میں کرن کماری کی یاد جھلکتی نظر آتی تھی۔ کرن کماری شادی کر کے اپنے کزن کے ساتھ انڈیا چلی گئی تھی۔

مافی اسے زبردستی اکرام صاحب کے ہاں سے لے آتا۔ اور پھر ایک طرف بیٹھا وہ

سے بتایا کہ آج کل ادب کو بھی روشناس کرانے کے لئے ایڈورٹائزمنٹ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اکرام صاحب بہت دولت مند آدمی نہیں ہیں۔ البتہ اس کا ایک پلے ان کے توسط سے جلد ہی ٹی وی پر آرہا ہے۔

”اوہ ریکی ا کے۔“

گیتی نے خوشی سے پوچھا تو اس نے سر ہلادیا۔

”تم ایسا کرو، اپنی کتاب چھپوا لو، جو خرچ ہو گا میں دوں گی اور۔“

”نہیں۔“ اس نے سختی سے کہا۔

”نہیں گیت! تھینکس جُج۔ میں اس طرح۔“

”پوری بات تو سنو۔ میں بزنس مین کی بیٹی ہوں گھانے کا سودا نہیں کروں گی۔

تمہاری کتاب جب بکے گی تو پرافٹ برابر برابر تقسیم ہو گا۔ صحیح“

”مگر گیت تمہیں یقین ہے کہ میری کتاب بکے گی۔ مجھے تو ڈر ہے۔ ردی میں بیچنا

پڑے گی۔“

”مجھے یقین ہے تمہاری کتاب سال کی سب سے زیادہ بکنے والی کتاب ہو گی، تم

کتاب ترتیب دو اور کچھ مت سوچو۔ اٹ از مائی بزنس۔“

”گیت!“ اس کی آواز بھرا گئی۔ مگر اس کی آنکھوں میں خواب پھر زندہ ہو گئے۔ اور

ہونٹوں پر مسکراہٹ رقص کراٹھی۔

”تم بہت اچھی دوست ہو گیت اور میں ہمیشہ تمہارا ممنون رہوں گا۔“

”دوستوں کے دوستوں پر بہت حق ہوتے ہیں اینڈ ناؤ چیچنگ دی ٹاپک۔ کم آن ذرا

ردی وغیرہ کی طرف چلیں۔“

اکرام الحق صاحب اسے گائیڈ کر رہے تھے اور پیسہ گیتی کا خرچ ہو رہا تھا۔ کتاب

چھپ کر آگئی تھی، بہت خوبصورت گٹ اپ کے ساتھ، اکرام الحق صاحب کے

مشورے سے گیت نے اس کتاب کی تعارفی تقریب ایک بہت بڑے ہوٹل میں ارنج کی تھی، خوبصورت کارڈز چھپوائے گئے تھے۔ اور شہر کے بڑے بڑے ادیب اور نقاد مدعو تھے۔ شہر اس کے دروازے پر دستک دے رہی تھی۔

”کیا یہ محبت ہے؟“

اس کو اس طرح اس معاملے میں انوالو دیکھ کر روی نے پوچھا۔

”نہیں!“ اس نے بڑے یقین سے کہا۔

”یاد رکھنا کہ اس کا تعلق بھی رازی کے طبقے سے ہے۔“

”جانتی ہوں۔“

اس کے چہرے پر اداسی کا غبار سا چھا گیا۔

”روی! میں نے اپنی محبت کا ڈھنگ بدل لیا ہے اور میں بھی ماما کی طرح محبت کرنا

سیکھ گئی ہوں۔“ وہ ذرا توقف سے بولی۔

”اور یہ محض ہمدردی ہے۔“

”اچھا!“ روی اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔

”تمہیں یاد ہے ایک بار اکرام صاحب نے کہا تھا کہ ہم جو فارغ پھرتے ہیں تو ہمیں

کچھ کرنا چاہئے، اس بیکار وقت کا کچھ مصرف ہونا چاہئے سو مسٹر راجیل عرف روی

صاحب میں نے اس بیکار وقت کا ایک اچھا مصرف تلاش کیا ہے اور یہ ا کے کی مدد بھی

ہے اور ایک طرح کا بزنس بھی۔“

”یعنی رند کے رند رہے، ہاتھ سے جنت نہ گئی۔“ روی نے کہا۔

”تو پھر تشویش کی کوئی بات نہیں نا۔“

”نہیں، یوں بھی وہ رازی سے بہت مختلف ہے، اسے میری دولت کا لالچ نہیں،

اس نے ایک بار بھی مجھ سے نہیں پوچھا کہ میرے پپا کون ہیں اور ان کا بزنس کیا ہے۔“

”یہ تو ہے۔“ روی مطمئن ہو گیا۔

کتاب کا دوسرا ایڈیشن چھپ رہا تھا۔ اکرام الحق صاحب اور گیتی آر آنے مل کر اس کے مقدر کو جگا دیا تھا۔ اکرام الحق نے اپنے حلقے میں آنے والے رائیٹروں سے مضامین لکھوائے تھے۔ اور مختلف پرچوں میں چھپوائے تھے، گیتی نے اس کے اعزاز میں ڈنڈیے تھے۔ ادیبوں کو صحافیوں کو بلایا تھا اور ہر مکتبہ فکر کے لوگوں سے اسے ملوایا تھا یہ سب بڑا خوش کن تھا اور وہ اس کا ممنون تھا احسان مند تھا۔

”گیت! میں تمہارا کس طرح شکریہ ادا کروں۔“

”نہیں“ شکریے کی ضرورت نہیں دوست۔“

اس روز وہ بہت ادا اس تھی۔

ماما اور پاپا یورپ کے نور پر چلے گئے تھے، اس سے ملے بغیر۔

شاید وہ گھر پر نہیں تھی، اس کی میز پر چٹ پڑی تھی ایک اطلاع، اس نے چٹ پھاڑ

دی تھی اور یونہی بستر پر اوندھی لیٹی اداس گانے سن رہی تھی کہ وہ آگیا۔

”تمہارے می ڈیڈی کبھی نظر نہیں آئے گیت۔“

”وہ یورپ گئے ہوئے ہیں۔“

”اور تمہارے بہن بھائی۔“

”میں اکیلی ہوں۔“

”تمہاری اس خوبصورت نظم کے پہلے مصرعے کی طرح (I am alone in this

city of pain every moment) (میں اس درد کے شہر میں تنہا ہوں)

”تم۔ تمہیں کیا دکھ ہو سکتا ہے گیت۔“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”کیا نہیں تمہارے پاس خوبصورت گھر، آسائشیں، دولت، اطمینان، سکون۔“

”ہوں!“ وہ ہولے سے ہنسی۔

”تم ایک حساس شاعر ہو۔۔۔ پھر بھی۔ پھر بھی۔“ اس نے غور سے دیکھا۔

اس کی آنکھوں میں کہیں خواب رو رہے تھے۔

”کیا تمہارے بھی کوئی خواب ہیں جو پورے نہیں ہوئے گیت۔“

”ہاں میرے بھی بہت سے خواب ہیں اکے۔ بہت سے خواب، جو کبھی پورے نہیں ہوئے، جن کی تعبیر کبھی نہیں ملی، میں نے تنہائی کا کرب سہا۔ اکیلے پن کا دکھ چکھا۔ پھر وہ مجھے ملا۔ مگر اس کی محبت فریب تھی، دھوکا تھی۔ وہ محبت نہیں تھی جھوٹ تھا۔“

”کوئی کس طرح کسی سے جھوٹی محبت کر سکتا ہے۔“ اس نے جیسے اپنے آپ سے کہا۔

”ہاں میں بھی یہی کہتی ہوں کوئی کس طرح کسی سے جھوٹی محبت کر سکتا ہے۔ سو وہ

محبت نہیں تھی محض فریب تھا۔“

”سوری گیت! میں تمہیں ایک بے فکری لڑکی سمجھتا تھا۔ لیکن تم نے تو اپنے اندر

آگ جلا رکھی ہے۔“

”اور کیا خبر کسی دن یہ آگ مجھے ہی بھسم کر ڈالے۔“

گیتی آر آنے سوچا۔ اور اس کی طرف دیکھا، جو بات کرتے کرتے کہیں کھو گیا تھا۔

گم ہو گیا تھا۔ اور ایسا اکثر ہوتا تھا، جانے وہ کہاں کھو جاتا تھا۔ گیتی نے اسے گم دیکھا تو اٹھ

کر ڈیک لگا دیا۔

اکرام الحق صاحب اکیلے تھے وہ ان کے سامنے بیٹھا کچھ سوچ رہا تھا۔

”کیا سوچ رہے ہو بھائی۔“

”کچھ نہیں۔“

”میں نے تم سے کہا تھا کہ تمہارے بخت کا ستارا میں بہت بلندی پر دیکھ رہا ہوں۔“

”میرے بخت کا ستارا۔“

اس نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا اور منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔ ”کیا جانے کس

پھر اس نے ہتھیار ڈال دیئے اور کھڑا ہو گیا۔

”میں نے سوچا ہے اے شادی کر لوں۔“ گیتی آرانے نیلی سے کہا۔

”کیا اس نے تمہیں پرپوز کیا ہے۔“

”نہیں، وہ رازی کی طرح لالچی اور حریص نہیں ہے۔“

”پھر تم۔“

”میں نے سوچا ہے نیلی! مجھے اس کی ضرورت ہے۔ میں زندگی کی اس روٹین سے تھک گئی ہوں، چیخ چاہتی ہوں میرے بیدروم کا سناٹا اور خاموشی میرے وجود کو کاٹتی ہے۔“

”لیکن اس نے تمہیں پرپوز نہیں کیا۔“

”میں۔ میں اُس سے کہوں گی کہ مجھے اس کی محبت کی ضرورت ہے۔ اس کی چاہت کی تمنا ہے وہ بڑا دیالو ہے بڑے ظرف والا ہے، مجھے مایوس نہیں کرے گا اور پھر میں نے اس کے خوابوں کو تعبیر دی ہے نیلی وہ میرا ممنون ہے۔“

”سوچ لو، کہیں پچھتاوانہ پڑے۔“ نیلی نے سمجھایا۔

”سوچ لیا ہے۔“ وہ کھڑی ہو گئی۔

وہ جانتی تھی کہ وہ بے سمت چل رہی ہے۔ لیکن پھر بھی چل رہی تھی۔ جب آدمی پیاسا ہو تو اسے صحیح سمت کا تعین نہیں ہوتا۔ سو وہ غلط راستے پر چل پڑی تھی۔

اور وہ چلتے چلتے رُک گیا۔

اس کی آنکھوں میں سوچ کی لکیریں ابھریں۔ اسے لگا جیسے وہ بے سمت ہو گیا ہو۔

اس نے ادھر ادھر دیکھا لیکن راستے شاید دھند میں کھو گئے تھے اور وہ غلط سمت میں چل

پڑا تھا دونوں پیاسے تھے۔

اگرچہ دونوں کی پیاس اور طرح کی تھی۔ سو دونوں بے سمت چل رہے تھے۔

آسمان پر کھو گیا ہے۔“

”گیتی آرا! چھی لڑکی ہے جو ان! محبت کرنے والی پر خلوص۔“

”جی!“ اس نے آہستگی سے کہا۔

”تم اس سے شادی کر لو۔ تمہارا ستارا جگمگاٹھے گا۔ وہ تمہیں، وہ بلند مقام دلوا سکتی ہے جس کی تمہیں خواہش ہے اور میں نے اس کی آنکھوں میں تمہارے لئے طلب کے دیئے جلتے دیکھے ہیں۔“

”شادی!“ اس نے اپنے خشک لبوں پر زبان پھیری۔

”مگر۔“

”اگر مگر کچھ نہیں میاں سوچ لو۔ یہ شہرت جو تم نے پائی ہے تمہارا نقطہ آغاز ہے۔

ابھی پہلی میٹر ہی پر ہو اور آخری میٹر ہی تک جانے کے لئے تمہیں جس سہارے کی ضرورت ہے، وہ گیتی آرا کے علاوہ کوئی اور نہیں ہو سکتا۔“

”اور وہ جو اس نے کہا تھا میں تمہارا انتظار کروں گی۔“ اس نے سوچا۔ ”اور وہ

خواب جو میں نے دیکھے ہیں اور میری منزل تو بہت دور ہے، کہیں آگے ابھی تو میں بیچ راہ میں کھڑا ہوں۔“ کوئی اس کے اندر دھیرے دھیرے سرگوشیاں کر رہا تھا۔ سمجھا رہا تھا اسے دلیلیں دے دے کر۔

کسی منزل پر پہنچنے کے درمیانی راستے اور تپتے صحراؤں میں کوئی تو شجر سایہ دار ہو کہ دھوپ کی تمنا سے دماغ کی نسیں نہ پھٹیں اور گیتی اس درمیانے راستے میں شجر سایہ دار ہے اور کیا ہو اگر میں ذرا دیر کے لئے اس شجر سایہ دار تلے بیٹھ جاؤں گا اور یہ تو محض پڑاؤ ہو گا واپس تو جانا ہی ہے اس نے خود کو تسلی دی۔

وہ اندر سے کمزور پڑتا جا رہا تھا۔

اکرام الحق صاحب اٹھ کر چلے گئے تھے وہ بڑے ہال کمرے میں دری پر تنبا بیٹھا تھا۔

میرے اندر سے مجھے اکساتی ہے، کوئی مجھے بلاتا ہے بخت۔ شاید میرے خواب۔ یہ بے آواز پکار مجھے اس طرح اپنی طرف کھینچتی ہے جیسے مقناطیس لوہے کو کھینچتا ہے۔
 ”میں سمجھتی ہوں اقتدار تمہیں مسعود بھائی اکساتے ہیں۔ وہ نہیں چاہتے کہ تم یہاں رہو۔ پتا نہیں کیوں میں نہیں سمجھ سکی لیکن میں نے اتنا ضرور جان لیا ہے کہ۔“
 ”نہیں بخت!“ اس نے اس کی بات کاٹ دی۔
 ”تم یونہی ان سے بدگمان ہوتی ہو۔“

وہ تو میرے سچے ہمدرد ہیں اور سمجھتے ہیں کہ یہاں رہ کر میرے اندر کی روشنیاں بجھ جائیں گی۔ یہ ستارے ماند پڑ جائیں گے۔ بخت جو میرے اندر جھلملا رہے ہیں۔ کیا فائدہ بخت جب قیمتی لکڑی کو بند گوداموں میں پڑے پڑے دیمک کھا جائے۔
 میرے اندر جو خزانہ پھپھا ہے بخت اسے بھی دیمک لگ رہی ہے اور اس سے پہلے کہ یہ خزانہ دیمک چاٹ جائے میں اسے ظاہر کرنا چاہتا ہوں۔“
 ”اُتی! تمہاری باتیں میری سمجھ میں نہیں آتیں، میں تو اتنا جانتی ہوں کہ ہمارا خزانہ تم ہو۔ تم چلے گئے تو ہم بے امان ہو جائیں گے۔ تہی دست ہو جائیں گے۔“
 ”پگلی! میں لوٹ آؤں گا۔“
 ”پتا نہیں کیوں اُتی۔“

اس کی آنکھوں میں موتی چمکنے لگے۔
 ”پتا نہیں کیوں میرے اندر ایک خوف سایہ گھیا ہے جیسے اب کے تم گئے تو پھر لوٹ کر نہیں آؤ گے۔ کھو جاؤ گے۔ بابا بوڑھے ہیں اور میں ایک کمزور لڑکی ہوں۔ ہم تمہیں کہاں تلاش کریں گے کہاں ڈھونڈیں گے اس اتنی بڑی دنیا میں۔“
 ”تم وہی ہو بخت۔ اور وہم کا کیا علاج۔“
 ”ہاں شاید میں وہی ہوں۔ تم جانتے ہو محبت انسان کو وہی بنا دیتا ہے۔“

اور غلط راستوں پر چلتے چلتے وہ ایک راہ پر آکر آئے سامنے کھڑے ہو گئے۔
 اگرچہ دونوں کے راستے جدا تھے پھر بھی وہ ایک راستے پر کھڑے تھے۔ لمحہ بھر ایک دوسرے کو دیکھنے کے بعد دونوں نے ایک دوسرے کا ہاتھ تھام لیا۔ دونوں کی آنکھوں میں ایک دوسرے کے لئے ہمدردی تھی۔ جیسے دو راستہ بھٹک جانے والوں کو ایک دوسرے سے ہوتی ہے۔

نارسانی

درختِ جاں پہ عذابِ رت تھی نہ برگِ جاگے نہ پھول آئے
 بہارِ وادی سے جتنے پیچھی ادھر کو آئے ملول آئے
 وہ ساری خوشیاں جو اس نے چاہیں اٹھا کے جھولی میں اپنی رکھ لیں
 ہمارے حصے میں عذر آئے، جواز آئے، اصول آئے
 اور پھر وہ چلا گیا
 ابھی تو اس کی پلکوں سے پچھلی مسافتوں کی دھول بھی نہیں ہٹی تھی کہ اس نے
 پھر پر تول لئے تھے۔ شاید اس کے پاؤں میں چکر تھا۔
 ”اُتی۔ مت جاؤ اب۔“ بخت نے التجا کی۔
 ”بابا بوڑھے ہو گئے ہیں اور انہیں تمہاری ضرورت ہے۔“
 ”جانتا ہوں مگر ہمیشہ کے لئے تو نہیں جا رہا! اور پھر میری جڑیں تو یہاں ہی ہیں۔
 میں تعلق توڑ کر نہیں جا رہا۔ میں کراچی جا کر کسی اچھی جاب کی تلاش کروں گا اور پھر تمہیں بلا لوں گا۔“
 ”تم تھوڑے پر قانع کیوں نہیں ہو جاتے اقتدار۔“
 ”میں نے سوچا تھا۔ سوچا تھا بخت کہ میں اب کہیں نہیں جاؤں گا مگر کوئی چیز

بخت کی ہر کوشش ناکام ہو گئی۔

بابا موم نہ ہو سکے۔ اور وہ جانے کے لئے تیار ہو گیا۔

”کیا کرو گے اتی۔ بغیر پیسوں کے۔“

”کچھ نہ کچھ کر لوں گا۔“

وہ سخت خفا اور ناراض تھا۔

بابا اس کا موقف نہیں سمجھتے تھے۔۔

”میں تمہاری جوان منگیتر کو اور تمہاری بوڑھی ماں اور پھوپھی کو لے کر فٹ پاتھ

پر نہیں بیٹھ سکتا۔“

”کرائے کا گھر لے لیجئے بابا۔“

”اور اگر کل میں مر جاؤں تو کرایہ کون ادا کرے گا۔“

”بابا! میں امریکہ جاتے ہی۔۔“

مگر وہ قائل نہیں ہوئے تھے۔

”میں بابا کو دکھا دوں گا کہ میں بہت کچھ کر سکتا ہوں اور اب میں تب ہی لوٹوں گا

جب کچھ بن جاؤں گا۔“

”اتی! مت جاؤ اس طرح سب کو ناراض کر کے۔“ وہ رو پڑی تھی۔

”رونا نہیں بخت۔ میں نے تمہیں کہا تھا نا۔“

”ہاں“ اس نے آنسو پونچھ ڈالے۔

”اور میرا انتظار کرنا زیست کے آخری لمحے تک۔“

ممکن ہے میں کچھ لیٹ ہو جاؤں لیکن میں لوٹوں گا ضرور۔۔۔ یہ یقین رکھنا اور

میں تمہیں خط بھی لکھتا رہوں گا۔“

اور پھر وہ چلا گیا۔

”میں تمہیں کمزور نہیں دیکھنا چاہتا بخت۔ میں تمہیں بہادر اور حوصلہ مند دیکھنا چاہتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں تم میرے ساتھ میری اس جنگ میں شریک ہو جاؤ۔ یہ جنگ جو میں اپنے آپ کو منوانے کے لئے لڑ رہا ہوں۔ تم نے ہمیشہ میرا ساتھ دیا ہے بخت۔ بچپن سے لے کر اب تک مجھے یاد ہے بچپن میں کئی بار تم نے میرے حصے کی مار کھائی ہے اور کئی بار میری ضدوں کو منوایا ہے۔ اب بھی۔ اب بھی بابا سے تم ہی منوا سکتی ہو۔“

”تم کیا چاہتے ہو اقتدار؟“ اس نے افسردگی سے پوچھا۔

وہ جانتی تھی کہ وہ اس سے کتنی ہی شدید محبت کیوں نہ کرتا ہو پھر بھی وہ اسے روک نہیں سکتی کہ وہ جادوئی آواز اسے بلارہی تھی اور اس نے زنجیریں ڈھیلی کر دی تھیں اتنی کہ وہ جتنی دور تک جانا چاہے جاسکے۔

”تم بابا سے کہنا یہ گھر بیچ دیں۔ میں ایک بار پھر قسمت آزمانا چاہتا ہوں۔ ایک بار میں امریکہ پہنچ گیا نا بخت تو ایسے دس گھر خرید لیں گے۔ مسعود بھائی نے مجھے بتایا ہے کہ ان کے دفتر کے ایک بندے نے ایک لاکھ میں امریکہ کا ویزا لگوا دیا ہے۔ وہ مجھے بھی ویزا لگوا دیں گے۔“

”مسعود بھائی!“

بخت نے ایک نظر اسے دیکھا اور اٹھ کر بابا کی طرف چلی گئی۔ مگر بابا نے گھر فروخت کرنے سے انکار کر دیا۔

”اس کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔“

انہیں غصہ آ گیا تھا۔

”وہ ہمارے پاؤں تلے سے زمین اور سر سے چھت چھین لینا چاہتا ہے۔ میری زندگی میں ناممکن ہے۔ مر جاؤں تو جو جی چاہے کرے۔“

بخت روئی نہیں۔

لیکن اس کی آنکھوں میں ہر وقت دھند سی چھائی رہتی تھی۔ مسعود بھائی اسے سمجھاتے۔

”وہ اب لوٹ کے نہیں آنے کا بخت بی بی!“

اس نے جا کر کوئی خط نہیں لکھا تھا۔ جانے کیسا تھا وہ کیا کر رہا تھا۔

”مسعود بھائی! آپ ہی کچھ کریں۔“

اس نے ایک روزان سے التجا کی۔

”آپ کے تو کراچی میں کئی دوست ہیں اور پھر وہ صاحب جن کے پاس پچھلی بار اقتدار ٹھہرا تھا ان سے پتا کریں نا۔“

”اچھا۔!“

مسعود بھائی نے وعدہ کر لیا۔

اور پھر کئی دن بعد وہ آئے تو انہوں نے بتایا کہ اقتدار تو ہمدانی صاحب کے پاس گیا ہی نہیں اور ہمدانی نے اپنے طور پر اسے وہاں بہت تلاش کیا ہے لیکن اتنے بڑے شہر میں ایک بندے کا ڈھونڈنا کوئی آسان کام نہیں ہے بخت۔

اور اس کی آنکھوں میں چلتے امید کے چراغ بجھ سے گئے اور اس بار اس نے مسعود بھائی کا کتنا انتظار کیا تھا۔ پتا نہیں کیوں اسے یقین سا تھا کہ مسعود بھائی ضرور اقتدار کے متعلق کوئی اچھی خبر دیں گے۔

”بخت!“

مسعود بھائی کے لہجے میں جانے کیا تھا کہ بخت نے چونک کر انہیں دیکھا۔ وہ بڑی وارفتگی سے دیکھ رہے تھے۔

”بھول جاؤاں اب شاید وہ نہ آئے۔“

”نہیں۔“ بخت نے تڑپ کر انہیں دیکھا۔

”وہ ضرور آئے گا مسعود بھائی۔“

”تم بہت بھولی ہو بخت! جو پیچھی اڑنا سیکھ جائیں وہ پلٹ کر نہیں آتے۔ اس نے اڑنا سیکھ لیا ہے اور اب گھونسلے میں پلٹ کر نہیں آئے گا۔“

”آپ اسے اتنا نہیں جانتے مسعود بھائی جتنا کہ میں اسے جانتی ہوں۔ اس کے خواب ہم سے مختلف تھے۔ ممکن ہے اسے اپنے خوابوں کی تعبیر پانے میں کچھ وقت لگ جائے لیکن وہ آئے گا ضرور۔ مجھے اس کے نہ پلٹنے کا خوف نہیں ہے میرے خوف اور طرح کے ہیں۔ مجھے صرف یہ ڈر ہے کہ کہیں اسے کچھ ہونہ گیا ہو۔ کہیں وہ بیمار نہ ہو۔“

”دیکھو بخت۔“ مسعود بھائی کچھ کہتے کہتے رک گئے ایک نظر اسے دیکھا اور پھر کھڑے ہو گئے۔

”خالو اور خالہ کیسے ہیں، میں ذرا ان سے مل لوں۔“

اور تم اپنا خیال رکھا کرو بخت۔ اتنی اداس اداس اتنی دل گرفتہ مت رہا کرو۔ دیکھو اگر تمہیں کچھ ہوا تو میں اقتدار کو کیا جواب دوں گا۔ اس نے مجھ سے کہا تھا کہ تمہارا خیال رکھوں۔“

”مسعود بھائی! آپ کا بہت شکریہ۔ آپ تو بہت خیال کرتے ہیں ہمارا۔ ہم سب کا۔ ماموں اور مامی تو آپ کو بہت دعائیں دیتے ہیں۔ بہت تعریفیں کرتے ہیں آپ کی۔“

مسعود کی آنکھیں چمکنے لگیں اور وہ ایک نظر اس پر ڈال کر اندر چلے گئے۔ وہ وہیں بیٹھی سوچتی رہ گئی۔

اقتدار کہاں چلا گیا۔ کیا وہ امریکہ چلا گیا۔ مگر اس نے خط کیوں نہیں لکھا۔ وعدہ کرنے کے باوجود اور شاید وہ نہیں آئے گا۔ مسعود بھائی سچ ہی کہتے ہیں۔ اس نے بھی تو کہا تھا کہ اب وہ کچھ بن کر رہی لوٹے گا۔ اور اگر وہ کچھ نہ بن سکا تو شاید پاٹ کر نہ آئے۔

بابا کی بات اس کے دل میں تیر کی طرح چبھ گئی تھی۔ بابا بھی تو غصے میں آگئے تھے۔ کاش وہ اتنے غصے میں نہ آتے۔

آنسو اس کی آنکھوں میں اکٹھے ہونے لگے لیکن اس نے انہیں بہنے نہیں دیا۔ اقتدار نے کہا تھا۔ ”رونا نہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہارے آنسوؤں کی جھیلیں میری اور تمہاری راہ میں حائل ہو جائیں۔“

”نہیں اقتدار۔ میں روؤں گی نہیں۔ کبھی نہیں۔“ اس نے اپنا عہد دہرایا اور خود بھی اٹھ کر اندر چلی گئی۔

پھر کئی دن اور گزر گئے۔ صبح ہوتے ہی اس کا انتظار شروع ہو جاتا۔ شاید آج کوئی خط آجائے کوئی پیغام۔ کوئی اطلاع مگر پھر ڈوبتے سورج کے ساتھ ساتھ مایوسی اس کے اندر اترنے لگتی۔ آنکھوں کی دھند گہری ہو جاتی جانے وہ اس بھری دنیا میں کہاں کھو گیا تھا۔ اس نے لکھا تھا۔

”میری بخت! میں اتنے بہت سارے دن تمہیں خط نہیں لکھ سکا تو یہ نہ سمجھنا کہ میں نے تمہیں بھلا دیا ہے۔ ان بیتے دنوں کے ہر لمحے میں، میں نے تمہیں یاد کیا ہے۔ جب بھی پاؤں زخمی ہوئے۔ جب بھی دل پر کوئی چوٹ لگی، میں نے چاہا کہ پلٹ جاؤں اس شہر کی زمین مجھ پر تنگ ہو گئی تھی اور کشادہ سڑکیں میرے لئے دشت خار بن گئی تھیں۔ اب تک کا سارا سفر میں نے آبلہ پاٹے کیا ہے اور ہنوز تہی دست ہوں۔ کئی بار میں نے سوچا کہ اپنے خوابوں سے پیچھا چھڑا کر واپس لوٹ جاؤں اور بابا سے معافی مانگ لوں مگر بخت مجھے اپنے کہے لفظوں کا مان تو رکھنا تھا۔ میں نے بابا سے کہا تھا کہ دنیا میری کچھ بھی ناممکن نہیں۔ اور پھر میری باتیں کسی پاگل کی بڑ نہیں اور میرے خواب کسی دیوانے کا خواب نہیں ہیں۔ اپنے اندر کی روشنیوں کو باہر لانا اپنی ذات کے اظہار کی خواہش کرنا کوئی جرم تو نہیں ہے نا۔ مگر میرے لئے شاید یہ ایک جرم ہی بن گیا ہے۔

بخت اور میں نے اس جرم کی بہت سزا سہی ہے۔ بہت۔ اپنی سطح سے نیچے آگراہوں۔ میں تمہیں کیا بتاؤں بخت اور کیا لکھوں۔ زندگی برقرار رکھنے کیلئے میں نے وہ کچھ کیا جس کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے بھیک نہیں مانگی، بخت۔ لیکن میں نے لوگوں کو دھوکا اور فریب بھی دیا۔ کچھ دن پہلے تک میں فٹ پاتھ پر بیٹھ کر لوگوں کے ہاتھ دیکھتا تھا اور انہیں قسمتوں کا حال بتاتا تھا۔ کیر و اور ایم۔ اے ملک کی شوقیہ پڑھی ہوئی کتابوں نے میری مدد کی۔ ہر رات سونے سے پہلے میں فیصلہ کرتا تھا کہ آئندہ صبح میں کچھ اور کروں گا۔ لیکن بھوک بڑی ظالم شے ہے اور ہر صبح میں پھر فٹ پاتھ پر جا بیٹھتا۔ میں جو اپنا آپ منوانے نکلا تھا بخت کیا بن گیا تھا۔ ایک روز ایک شخص میرے پاس آیا وہ مجھ سے اپنی قسمت کا حال پوچھنا چاہتا تھا اور اچھے دنوں کے لئے مجھ سے عمل کروانا چاہتا تھا میری جیب خالی تھی بخت میں نے اس سے کہا پچاس روپے لوں گا۔ وہ لمحہ بھر مجھے دیکھتا رہا پھر اس نے مجھے پچاس روپے دے دیئے اور میں نے اسے ایک تعویذ دیا۔ قسمت کا حال بتایا۔ جب وہ جانے لگا بخت۔ تو اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور اس نے کہا۔ ”سائیں جی۔ آج تین دن بعد پچاس روپے مجھے ملے تھے اور گھر میں میرے بچے تین دن سے بھوکے ہیں۔“

مجھے یوں لگا جیسے کسی نے مجھے آسمان سے زمین پر لاپیچہ کا ہو۔ میں نے وہ روپے اسے واپس کر دیئے اور خود ساحل پر چلا آیا۔ میں نے سوچا تھا اپنے آپ کو لہروں کے حوالے کر دوں کہ مجھے وہ مل گیا۔ وہ انسان نہیں۔ فرشتہ ہے بخت۔ وہ مجھے اپنے ساتھ گھر لے آیا ہے اور اس نے میرے پاؤں میں چبھے تمام کانٹے ایک ایک کر کے نکال دیئے ہیں بخت۔ لوگ اس کا احترام کرتے ہیں۔

سوچتا ہوں اگر اکرام الحق صاحب مجھے نہ ملتے بخت تو شاید آج میں نہ ہوتا۔ عجیب شخص ہے یہ اس کی آنکھوں کے سرخ ڈوروں میں لاقنہا ہی محبت کا سمندر لہریں مارتا

”بہت انا ہے اس میں۔“

مائی اپنی آنکھیں پلو سے صاف کر رہی تھیں۔
وہ چپکے سے باہر چلی آئی۔

اس نے اطلاع تو دی تھی۔ لیکن اپنے تک پہنچنے کا راستہ نہیں بتایا تھا۔
کیا پتا۔۔ کیا پتا مسعود بھائی اس شخص کو جانتے ہوں جس کا ذکر اقتدار نے کیا تھا۔
اندھیرے میں امید کی کرن سی چمکی تو اس نے خود کو تسلی دی۔ مگر پتا نہیں کیوں
مسعود بھائی بہت دنوں سے نہیں آئے تھے، حالانکہ جب سے اقتدار گیا تھا وہ پندرہ دن
بعد ضرور ایک چکر لگاتے تھے۔ اس نے دوبارہ پی۔ سی۔ او سے جا کر فون بھی کیا لیکن وہ
آفس میں ملے ہی نہیں۔ تب اس نے ماموں سے کہا۔

”بابا! آپ مسعود بھائی کی جا کر خبر لے آتے۔ بہت دنوں سے آئے نہیں۔ اکیلے
آدی ہیں کیا خبر بیمار پڑے ہوں۔“

انہوں نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

”کسی دن دیکھ آؤں گا جا کر۔“

”دراصل بابا میرا خیال تھا شاید مسعود بھائی کو اس شخص اکرام الحق کا کچھ پتا ہو۔ اگر
وہ جانتے ہوں اسے تو۔“

”پوچھ لوں گا۔“

ان کے چہرے پر سایہ سا آگیا۔

”بہت دکھی کر دیا ہے اس نے۔“

اور پھر انہوں نے آکر بتایا کہ مسعود تو دفتر کی طرف سے پشاور ٹور پر گئے ہوئے ہیں
سرحد کا لمبا ٹور ہے دو ماہ تو لگ ہی جائیں گے۔ مایوسی اس کے اندر تہہ در تہہ اترنے لگی۔
وہ جتنی جلد اس تک پہنچنا چاہتی تھی اتنی ہی دیر ہو رہی تھی۔ مسعود بھائی جانے

ہے۔ انسانوں سے محبت۔ بلا تفریق اس کے پاس ہر مذہب، ہر فرقے اور ہر طبقے کے
لوگ آتے ہیں اور یہ سب میں یکساں مقبول ہے۔ مجھے لگتا ہے بخت جیسے اب میں
منزل کے قریب پہنچنے ہی والا ہوں۔ لیکن ابھی میں بہت تھکا ہوا ہوں۔ ابھی میرے
زخموں سے خون رس رہا ہے۔ ابھی اندر سے ریزہ ریزہ ہو رہا ہوں۔ شاید اپنے وجود کے
ان ٹکڑوں کو جوڑنے میں مجھے کچھ وقت لگے۔ لیکن مجھے یقین ہے بخت کہ بہت جلد،
بہت جلد میں ایک بار پھر اپنے پاؤں پر کھڑا ہوں گا اور میری بخت تب میں لوٹ کر ضرور
آؤں گا۔ تم میرا انتظار کرنا۔“

بخت نے بار بار اس کا خط پڑھا۔ اس کا دل چاہا وہ روئے چیخیں مار مار کے دیواروں
سے سر پٹھے۔

اقتدار نے جانے کیا کیا دکھ سہے تھے۔

کیسی اذیت میں شب و روز کاٹے تھے۔

کاش وہ اس کے پاس ہوتی تو اس کے پاؤں کے زخموں پر مرہم رکھتی۔ اس کی راہ
کے کانٹوں کو اپنی پلکوں سے چنتی۔ راہوں کو اس کے لئے آسان بنا دیتی۔

اور کیسے خواب آنکھوں میں سجائے ہیں کہ زندگی کو اپنے لئے میرے لئے اور ہم
سب کے لئے ”او کھا“ کر دیا ہے اس نے بابا کو بتایا۔

”اسے لکھو کہ وہ آجائے۔“ وہ ہار گئے تھے۔

”اور جو چاہتا ہے کر لے۔ بیچ دے مکان اور چلا جائے امریکہ۔ کر لے اپنے خواب

پورے۔“

”اس نے اپنا پتا نہیں لکھا؟“

”پتا نہیں لکھا۔“

وہ کسی ہارے ہوئے جواری کی طرح شکست خوردہ سے لگ رہے تھے۔

کب لوٹیں گے۔ اور کہیں کوئی روز نہ تھا۔ کوئی کرن نہ تھی اور اقتدار نے بھی پھر کوئی خط نہ لکھا تھا۔ خدا خدا کر کے مسعود بھائی پشاور سے لوٹے وہ بے حد فریش اور خوش لگ رہے تھے۔

”تم پہلے سے زیادہ کمزور ہو گئی ہو بخت۔ اپنا خیال نہیں رکھا تم نے۔“

”مسعود بھائی! آپ نے بہت انتظار کروایا۔“

”تم نے۔۔۔“

انہوں نے قدرے حیرت سے اسے دیکھا۔

”تم نے میرا انتظار کیا بخت۔ زہے نصیب۔“

”آپ بتا کر بھی تو نہیں گئے تھانا۔ مای بھی پریشان تھیں کہ کہیں آپ بیمار نہ پڑ گئے ہوں۔“

”مجھے کیا پتہ تھا کہ میں۔ میرے لئے بھی کوئی پریشان ہو سکتا ہے۔ ورنہ ضرور بتا کر جاتا۔“ انہوں نے اپنا مخصوص قہقہہ لگایا۔

”اور وہ تمہارا اقتدار آج کل بہت اونچا جا رہا ہے۔“

”آپ۔ آپ کو پتا ہے ان کا۔ کچھ خبر ہے ان کی۔“ وہ یک دم بے قرار ہو گئی۔

”ہاں، پشاور میں تھا تو ایک ہفت روزہ اخبار میں اس کی کتاب کی تقریب رونمائی

کی خبر پڑھی تھی۔“

”کتاب کی تقریب رونمائی؟“

اس کی آنکھوں میں حیرت اتر آئی۔

”ہاں۔ اور جانتی ہو کہ یہ تقریب کہاں ہوئی ہے؟ ایک فائیو سٹار ہوٹل میں۔“

”وہ اخبار ہے آپ کے پاس۔۔۔؟“

”ہاں میں وہ اخبار لے کر آیا تھا۔ آج تو جلدی میں ہوں۔ پھر لے آؤں گا۔“

اسے اپنے خوابوں کی تعبیر ملنے لگی تھی۔ وہ اپنی منزل کی طرف رواں تھا۔ لیکن اس نے بخت کو اپنی خوشیوں میں شریک نہیں کیا تھا۔ اسے نہیں بتایا تھا کہ اس کے ہاتھ آسمان کی بلندیوں کو چھونے والے ہیں۔ لمحہ بھر وہ چپ بیٹھی رہی۔

”وہ کتاب مل جائے گی؟“

”یہاں سے تو نہیں، شاید لاہور سے مل جائے اردو شاعری کا مجموعہ ہے۔“

”آپ اکرام الحق نام کے کسی شخص کو جانتے ہیں؟“

”اکرام الحق! انہوں نے لمحہ بھر سوچا۔“

”ہاں یاد آیا۔ ایک بار میں کراچی گیا تھا تو ہمدانی نے ملوایا تھا۔ اس شخص سے عجیب

آدمی ہے پر لوگ بڑے مداح ہیں۔ بہت مانتے ہیں اسے۔ باتیں کرنے کا فن جانتا ہے

اسیر کر لیتا ہے مخاطب کو۔ ہر موضوع پر بے تکان بولتا ہے۔ دن میں ایک دفتر میں کام

کرتا ہے رات کو ہر روزی تقریباً اس کے گھر میں محفل جمتی ہے۔ کوئی اسکے دروازے

سے خالی نہیں جاتا۔“

”اقتدار آج کل اسی کے پاس ہے۔“ بخت نے بتایا۔

”تمہیں کس نے بتایا؟“

مسعود کو حیرت ہوئی۔

”خط آیا تھا اقتدار کا۔“

”تبھی۔ مگر اکرام الحق اسے کیسے ملا؟“

وہ جیسے اپنے آپ سے بولے۔

”آپ کے پاس ایڈریس ہے اس کا؟“ اس نے پوچھا۔

”نہیں مگر تم ایڈریس کا کیا کرو گی؟“

”میں۔“ وہ ذرا سی جھجکی۔

”میں اقتدار کو خط لکھوں گی۔ اس نے اپنا پتا نہیں لکھا۔“
 ”خط لکھتا ہے وہ؟“

ان کی آواز کچھ گرسی گئی تھی۔

”بہت پہلے آیا تھا اس کا خط جب آپ پشاور گئے تھے۔ تب وہ پریشان تھا۔“

”مگر اب وہ پریشان نہیں ہے۔ اب تو۔“

”وہ پریشان نہیں ہے تو پھر اس نے ہمیں۔“ بخت نے بڑی دلگدلی سے سوچا۔

”اس نے ہمیں اپنی کامیابیوں کی خبر کیوں نہیں دی۔“

”مسعود بھائی! آپ مجھے کراچی لے چلیں گے۔“

”تم! وہ اچھل پڑے۔“

”تم کراچی جا کر کیا کرو گی۔“

”میں اقتدار سے ملنا چاہتی ہوں۔“

اس نے نگاہیں جھکا لیں۔

”پلیز مسعود بھائی، آپ مجھے لے چلیں نا وہاں۔“

”خالو جانے دیں گے تمہیں؟“

”میں انہیں منالوں گی۔ کیا پتا وہ خود ہی چل پڑیں۔ آپ کو نہیں پتا۔ آپ نہیں جانتے مسعود بھائی ان کے دل پر کیا گزرتی ہے۔ میں نے راتوں کو انہیں جاگ کر بھیتے دیکھا ہے۔ مسعود بھائی آپ ایک ماں کی تڑپ اور ایک باپ کے دل کی بے چینی نہیں سمجھ سکتے۔“

”مگر تم وہاں جا کر کیا کرو گی۔“

مسعود بھائی نے پوچھا۔

”میں!“ اس کی آنکھیں چمک اٹھیں اور رخساروں پر شفق اتر آئی۔ ”میں اس سے

کہوں گی کہ مسعود بھائی کہ وہ بے شک وہاں ہی رہے لیکن اس طرح خفا ہو کر نہیں، ناراض ہو کر نہیں۔ سب سے رابطے توڑ کر نہیں، میں اس سے کہوں گی وہ آکر بابا سے اور مامی سے مل جائے۔ سب اس کے بنا اور اس ہیں۔“

”وہ تمہاری بات نہیں سنے گا بخت۔“

”میں جانتی ہو مسعود بھائی کہ وہ میری بات کبھی نہیں ٹالے گا۔ آپ کو پتا ہے اگر میں ایک بار بھی اس سے کہتی کہ وہ نہ جائے۔ میں اسے روکتی تو وہ نہ جاتا۔ لیکن میں نے اسے اس طرح نہیں روکا تھا۔ کیونکہ میں اسے اداس نہیں دیکھ سکتی تھی اور میں چاہتی تھی کہ اس کے خواب پورے ہوں اس لئے میں نے اسے جانے دیا۔“

”بخت! تم کیوں جاتی ہو۔ میں چلا جاتا ہوں۔ جا کر اسے لے آتا ہوں۔ پھر تم اسے چاہو تو روک لینا مت جانے دینا۔“

”آپ جائیں گے مسعود بھائی۔“

”ہاں چلا جاؤں گا۔“ اس کی آنکھوں سے ممنونیت اور تشکر جھلکنے لگا۔

”مسعود بھائی آپ ہمارا بہت خیال کرتے ہیں۔“ وہ چپ چاپ اسے دیکھتے رہے اور کچھ سوچتے رہے ”آپ کب جائیں گے؟“

اس نے انہیں خاموش دیکھ کر پوچھا۔

”دو ایک روز تک جاؤں گا۔“

”شکریہ مسعود بھائی۔“

”شکریہ کی کیا بات ہے بخت مجھے تمہاری، خالو اور خالہ کی خوشیاں بہت عزیز ہیں۔“

میں پوری کوشش کروں گا کہ اسے ساتھ ہی لے کر آؤں۔“

وہ وعدہ کر کے چلے گئے مگر اقتدار ان کے ساتھ واپس نہیں آیا تھا۔

”سوری بخت۔“ وہ بہت شرمندہ تھے۔

”میں اس کو ساتھ نہیں لاسکا۔“

”مگر کیوں؟“

بخت کا چہرہ دھواں دھواں ہو گیا۔

”وہ بہت بدل گیا ہے بخت۔ شہرت نے اسے ہم سے دور کر دیا۔ یہ تو مجھے وہاں جا کر پتا چلا کہ وہ ایک دم سے ہی مشہور ہو گیا ہے۔ ابھی اس کی شہرت کراچی تک محدود ہے لیکن بہت جلد وہ پورے پاکستان میں پہچانا جائے گا۔ اس کی کتاب کا دوسرا ایڈیشن چھپ رہا ہے اور اس کی ایک سیریز ٹی وی پر آنے والی ہے۔“

”آپ اس سے ملے تھے۔“

بخت نے ڈوبتی آواز میں پوچھا۔

”ہاں ملا تھا۔ اور مل کر پچھتایا۔“

”کیوں؟“ اس نے بے چینی سے انہیں دیکھا۔ اس کا رنگ زرد ہو رہا تھا اور ہونٹ خشک ہو رہے تھے۔

”اس نے مجھ سے ٹھیک طرح سے بات نہیں کی۔ وہ بڑے ادیبوں میں گھرا ہوا تھا۔ اس نے کسی کے بارے میں پوچھا تک نہیں۔ میں نے خود ہی بتایا مگر اس نے دھیان ہی نہیں دیا۔“

”نہیں۔“

اس کے ہونٹ تھوڑے کھلے اور اس نے بے یقینی سے مسعود بھائی کو دیکھا۔
”وہ ایسا نہیں ہے، وہ ایسا نہیں ہو سکتا۔“ اس کے دل نے سرگوشی کی۔ مسعود گہری نظروں سے اس کے چہرے کے بدلتے رنگوں کو دیکھ رہے تھے۔

”تمہیں میری بات کا یقین نہیں بخت!“

وہ بنا بولے چپ خالی نظروں سے انہیں دیکھتی رہی۔

”وہ سچ مجھ بہت بدل گیا ہے بخت۔ اس کے چہرے پر اتنی اجنبیت تھی اور آنکھوں میں ایسی سرد مہری کہ وہ اپنا اقتدار تو لگتا ہی نہیں تھا۔“

”پتا نہیں ایسا کیوں ہوا مسعود بھائی حالانکہ وہ تو، وہ تو ایسا نہیں تھا۔“

”آدمی کو بدلتے دیر تو نہیں لگتی بخت۔ جب سامنے رنگ جھلملاتے ہوں۔ روشنیاں رقص کرتی ہوں تو آدمی پیچھے مڑ کر اندھیروں میں نہیں دیکھتا۔“

”مگر اس کے پیچھے اندھیرے تو نہیں تھے مسعود بھائی رنگ اور روشنیاں تو پیچھے بھی تھیں۔“

”کبھی کبھی آدمی کی آنکھیں چندھیا جاتی ہیں بخت۔ روشنی میں بھی اسے کچھ دکھائی نہیں دیتا اور اقتدار کی آنکھیں بھی چندھیا گئی ہیں۔ اور اسے بھی کچھ دکھائی نہیں دیتا اس کی آنکھوں سے پہچان ختم ہو گئی ہے بخت۔“

”ہاں۔“

انہوں نے اس کی بے حد سفید رنگت کو دیکھا اور قہقہہ لگایا۔ وہی مخصوص اونچا قہقہہ۔

”میں تمہارے لئے وہاں سے ایک تحفہ لایا تھا۔“

انہوں نے بریف کیس سے کتاب نکال کر اسے دی۔

”اقتدار کی پہلی کتاب۔“

اس نے کانپتے ہاتھوں سے کتاب تھام لی۔ اس کے بہت سے خوابوں میں سے ایک خواب۔

اس نے ورق الٹا۔

”اپنے بخت کے نام۔“

”بخت کے نام۔“ اس کے اندر گھنٹیاں بجنے لگیں آنکھوں میں جگنو اتر آئے۔

سکتا، وہ کبھی نہیں بدلے گا۔ لمحہ بہ لمحہ اس کا یقین پختہ ہوتا جا رہا تھا۔

”اچھا!“ مسعود بھائی کے لہجے میں تھکن سی اتر آئی۔

”تم نے ارادہ ہی کر لیا ہے تو ٹھیک ہے میں خالو کو پتا سمجھا دوں گا۔“

”تھینک یو مسعود بھائی۔“

وہ کتاب کو کس مقدس امانت کی طرح ہاتھوں میں سنبھالے اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔

وہ کراچی جانے کی تیاری کر رہی تھی۔

”مسعود کہتا ہے۔ ہمارے جانے کا کوئی فائدہ نہیں بیٹا۔“ بابا نے اسے سمجھایا۔

”اسے اگر ہمارا خیال ہو تا تو وہ خود ہی آتا۔ نہ آتا تو خط ہی لکھتا۔“

”مگر بابا ایک بار جانے میں کیا حرج ہے۔“ اس نے انہیں بھی قائل کر لیا۔ مامی اور

اماں نے اس کا ساتھ دیا۔

بابا کو دفتر میں کوئی کام تھا۔ چنانچہ طے پایا۔ کہ ایک ہفتے بعد وہ کراچی جائیں گے۔ پتا نہیں کیا بات تھی وہ بخت کی کوئی بات نہ ٹالتے تھے، انہیں اقتدار سے زیادہ اس سے محبت تھی۔

اقتدار سے ملنے کے تصور سے ہی اس کے گالوں کے مرجھائے ہوئے گلاب کھل اٹھے تھے۔ وہ اس سے صاف صاف کہہ دے گی۔ کہ وہ اس کی جدائی برداشت نہیں کر سکتی۔ اس نے سوچا۔ اور اب وہ اپنی زنجیریں سمیٹ لے گی اور لاکھ وہ کہے لیکن وہ اسے آزاد نہیں کرے گی۔

مسعود بھائی نے اس روز کے بعد بھی ایک دن اسے سمجھایا منع کیا کہ وہ کراچی نہ جائے۔

”تمہارا جانا بالکل بے سود ہے بخت۔“ مگر اس کے ارادے میں دراڑ تک نہ آئی۔

وہ مجھے نہیں بھولا وہ کسی کو بھی نہیں بھولا۔ وہ اسے اپنا بخت کہا کرتا تھا۔ تم میرا مقدر ہو میرا بخت ہو۔

اس کی آنکھوں کے سامنے تنے جالے آپوں آپ صاف ہو گئے۔ کہیں کوئی بات غلط تھی۔ کہیں کچھ صحیح نہیں تھا اس نے گہری نظروں سے مسعود بھائی کی طرف دیکھا اور اس کے اندر دور کہیں گہرائی میں روشنی کا ایک جھمکا سا ہوا۔ ”مسعود بھائی آپ کو اقتدار کہاں ملا تھا؟“

”وہیں۔ وہ کیا نام ہے اکرام الحق کے گھر۔“

”یہ صاحب کہاں رہتے ہیں۔ ذرا سمجھا دیجئے۔“

”کیوں؟“

”میں اور بابا کراچی جائیں گے اقتدار سے ملنے۔“

”مگر تم۔“

وہ مضطرب سے ہو کر کھڑے ہو گئے۔

”تم لوگ جا کر کیا کرو گے۔ میں نے بتایا نا اقتدار بہت بدل چکا ہے۔ بہت بدل گیا ہے۔“

”ہم تو نہیں بدلے۔ ہم تو وہی ہیں نا مسعود بھائی۔“

وہ بڑے اعتماد سے بول رہی تھی۔ اور چند لمحے پہلے کی شکستگی اور تھکن اب اس کی آواز میں نہیں تھی۔

”اس کا رویہ تمہیں دکھ دے گا بخت۔“

”اپنوں کے دیے دکھ بھی پیارے ہوتے ہیں مسعود بھائی۔“ اس کی آنکھوں میں

بڑی تیز چمک تھی اور وہ کتاب کے صفحے الٹ رہی تھی۔

لفظ لفظ اس کی محبت کی کہانیاں سن رہا تھا۔ وہ اس کا تھا صرف اس کا وہ نہیں بدل

”لگتا ہے جیسے میں بے سمت ہو گیا ہوں۔ جسے میں کسی ماورائی طاقت کا موکل بن گیا ہوں اور وہ غیر مرئی وجود دھیرے دھیرے کشاں کشاں مجھے اپنی طرف کھینچ رہا ہو۔ مگر میرے لئے غلط نہ سوچنا بخت یہ سب کچھ محض وقتی ہے۔

عارضی ہوگا محض مجبوریوں کا سودا۔

اور بخت کی سمجھ سے بالاتر تھا یہ سب، کیا اقتدار اب کبھی واپس نہیں آئے گا۔ اس نے اپنے آپ سے پوچھا۔ اور یہ مجبوریوں کا سودا کیا ہے؟ اس کے گالوں کے گلاب پھر مر جھانے لگے اور آنکھوں کی چمک ماند پڑ گئی۔

”لو بھی میں نے ایک ہفتے کی چھٹی لے لی ہے۔“ اقتدار کے خط کو جسے وہ کئی بار پڑھ چکی تھی۔ پھر پڑھ رہی تھی کہ بابا نے آکر کہا۔

”اب پروگرام سیٹ کر لو، کل جانا ہے یا پرسوں۔“ اس نے خط تیکے کے نیچے رکھ کر سوچا۔ بابا سے کہہ دے کہ وہ کراچی نہیں جائے گی۔ ابھی وہ اقتدار کو سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی اور کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

”ہاں تو کیا خیال ہے بھی؟“

اس نے نظر اٹھا کر دیکھا ان کے مر جھائے ہوئے چہرے پر اقتدار سے ملنے کے خیال سے رنگ سے آگئے تھے۔

”پرسوں چلیں گے بابا۔“

”میں مسعود کو فون کر دوں گا سیٹیں بک کروالے۔“

”ٹھیک ہے بابا۔“ اس نے نگاہیں جھکائیں اور سوچا۔

”چلو آخری بار اسے دیکھ لوں گی اور کہہ دوں گی اقتدار میں نے تمہارے تمام جواز اور تمام عذر قبول کئے اور تمہاری زنجیریں کاٹ دیں۔ اب تم جس طرح چاہو اپنے خواب اپنی مٹھی میں بند کر لو ہاتھ بڑھا کر انہیں چھو لو۔“

”میں ایک بار تو ضرور جاؤں گی مسعود بھائی چاہے کچھ ہو۔“ مگر اس روز وہ متذبذب ہو گئی۔ اس کا ارادہ ڈوانا ڈول ہو گیا۔ کتنی ہی دیر تک وہ اقتدار کا خط ہاتھوں میں لئے اسے سمجھنے کی کوشش کرتی رہی۔ جانے وہ کیا کیا چاہتا تھا۔ کیا سمجھانا چاہتا تھا۔ اور وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ اس نے لکھا تھا۔

مجھ سے کبھی بدگمان نہ ہونا بخت۔ میری محبت کا یقین رکھنا۔ میں نے تمہارے سوا کبھی کسی سے محبت نہیں کی، تمہاری محبت آج بھی روز اول کی طرح میری رگوں میں میرے لہو کے ساتھ دوڑ رہی ہے۔ اگر میں کہیں تھک کر بیٹھ جاؤں تو یہ نہ سمجھ لینا کہ میں نے منزل کو پالیا ہے میری منزل تم ہو بخت۔ وہ تو محض ایک پڑاؤ ہو گا۔ زندگی کے تپتے صحرا میں اگر کہیں کوئی شجر سایہ دار مل جائے اور اس کے سائے تلے میں بیٹھ جاؤں یونہی سستانے کو تو یہ خیانت تو نہیں ہے۔ محض تھکاؤوں کو دور کرنا ہے۔ اتنا حق تو ہے نا ایک ایسے مسافر کو جو تپتے صحرا میں چل رہا ہو تو وہ دھوپ کی تمازتوں سے بچنے کے لئے ذرا دیر کو کسی شجر سایہ دار تلے رک جائے۔ بخت میرے خواب میری دسترس میں ہیں۔ میں انہیں ہاتھ بڑھا کر چھو سکتا ہوں۔ لیکن ڈرتا ہوں کہ کہیں تم بدگمان نہ ہو جاؤ۔ اگر میں ان خوابوں کو پانے کے لئے ذرا دیر کو تم سے دور ہو گیا تو خفانہ ہونا میں بہر حال تمہارا ہوں دل و جان کے ساتھ۔

اس نے بار بار خط کو پڑھا۔ یہ جواز۔ یہ عذر کس لئے تم کیا کہنا چاہتے ہو اقی۔ کھل کر کہتے صاف صاف کہتے۔ اس کی آنکھوں کے آگے دھند سی چھا گئی۔ کیا واقعی تم بدل گئے ہو یا بدل رہے ہو۔

”اگر اپنے خواب پاتا ہوں تو تم سے پھٹ جانے کا خوف ہے اور اگر اپنے خوابوں دستبردار ہوتا ہوں تو شاید اپنے آپ سے پھٹ جاؤں۔ بتاؤ بخت میں کیا کروں مجھے کوئی راستہ بھائی نہیں دیتا۔ سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں۔“ اس نے آخر میں لکھا تھا۔

بابا نے مسعود کو سیٹیں بک کرانے کے لئے فون کیا تو انہوں نے اطلاع دی۔
”اقتدار نے شادی کر لی ہے۔“

”نہیں۔“ انہیں یقین نہ آیا۔

”حکایت“ کے سنڈے ایڈیشن میں اس کی شادی کی تصویر چھپی ہے۔ ”مسعود نے تفصیل بتائی اور وہ سیٹیں بک کر دوائے بغیر واپس آ گئے۔“

”سب کی سیٹیں بک ہوئی ہیں بابا۔“ بیگ میں اپنے کپڑے رکھتے ہوئے اس نے پوچھا۔
”اقتدار نے شادی کر لی ہے۔“ بیگ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گر پڑا۔ بابا سر جھکائے شرمندہ سے کھڑے تھے جیسے اس کے مجرم ہوں۔

”تو یہ سارے جواز سارے عذر اس لئے تھے اقتدار احمد اور میں سمجھ ہی نہیں پا رہی تھی۔“

”میں اسے کبھی معاف نہیں کہوں گا۔ اور اب وہ زندگی بھر کبھی اس گھر میں نہیں آ سکتا۔“

”نہیں بابا۔“ اس نے تڑپ کر انہیں دیکھا۔

”یہ گھر اس کا ہے اور اس گھر کے دروازے ہمیشہ اس کے لئے کھلے رہیں گے۔ آپ پریشان نہ ہوں بابا! اس کی کوئی مجبوری ہوگی۔“

”مجبوری۔“ ان پر لرزہ سا طاری ہو گیا اور انہوں نے ہاتھ میں پکڑا ہوا روزنامہ حکایت سنڈے ایڈیشن اس کی طرف پھینک دیا۔

”کیسی مجبوری۔ کسی دولت مند امیر لڑکی سے شادی کرنا اس کی مجبوری تھی۔“

”شاید اس کے پاس یہی ایک راستہ رہ گیا ہو۔“ اس نے زیر لب کہا۔

بابا تھکے تھکے قدموں سے باہر نکل گئے۔

اس نے لکھا تھا تا کہ اس کے خواب اس کی دسترس میں ہیں اور وہ انہیں ہاتھ بڑھا

کے چھو سکتا ہے لیکن ڈر تا ہے وہ اس سے بدگمان نہ ہو جائے۔

”اور میں تم سے بدگمان نہیں ہوئی اتی۔“ اس نے زمین پر بیٹھتے ہوئے اپنا سر گھٹنوں پر رکھ لیا۔ اس کی آنکھوں کے آگے دھند چھا رہی تھی اور دل ڈوب سا رہا تھا۔ بڑی دیر بعد اس نے گھٹنوں سے سر اٹھایا تو اس کی آنکھیں نکھری نکھری تھیں یوں جیسے بارش کے بعد دھل کر آسمان نکھر آتا ہے حالانکہ وہ روئی نہیں تھی۔ اس نے اپنے قریب پڑا ہوا اخبار اٹھا لیا۔

اس اجنبی لڑکی کے ساتھ کھڑا بے حد سنجیدہ اور اداس لگ رہا تھا۔ کچھ دیر وہ تصویر کو دیکھتی رہی۔

”تم خوش نہیں ہواتی۔“ اس نے آہستگی سے کہا۔ تمہیں تو خوش ہونا چاہئے تھا کہ تمہارے خواب اب تمہاری دسترس میں ہیں۔ یہ خواب بھی۔“ وہ ہولے سے ہنسی۔
”کبھی کبھی آدمی کا پیچھا اس طرح کرتے ہیں جیسے باز زخمی فاختہ کا۔“

اور تمہارے خواب بھی تمہارا اس طرح پیچھا کرتے رہے اور بالآخر انہوں نے تمہیں زیر کر لیا۔“ اخبار اس کے سامنے کھلا پڑا تھا۔

”شیخ نصیر الدین کی صاحبزادی گیتی آرا کی شادی ابھرتے ہوئے نوجوان ادیب اقتدار احمد سے۔۔۔ لفظ اس کی آنکھوں کے سامنے ناچنے لگے۔

”اور شاید میں تمہارا بخت نہیں تھی۔“ اس نے اخبار کو اپنے ہاتھوں میں مروڑ ڈالا۔
”خدا کرے تمہارے خواب تمہیں کبھی دھوکا نہ دیں۔“ اس کی آنکھوں کی سطح

گیلی ہونے لگی۔ ”وہ ساری خوشیاں جو اس نے چاہیں۔“ نہیں وہ روئے گی نہیں۔ اس نے اپنی آنکھوں کو رگڑ ڈالا۔ اگر وہ روئی تو اس کے ارد گرد نمکین پانی کی جھیلیں بن جائیں گی اور جو کبھی اس نے پلٹنا چاہا تو۔۔۔

ہمارے حصے میں عذر آئے جواز آئے۔

وہ ایک لڑکی جو زندگی کے سفر میں ذرا دیر کے لئے اسے ملی تھی اور شاید اسے دھوپ کی شدتوں سے بچایا تھا اور اس کے پاؤں کے آبلوں پر مرہم رکھا تھا۔ اور شاید۔“ اس نے مڑے تڑے اخبار کو پھر کھول کر دیکھا۔ تم نے اسے پالیا اجنبی لڑکی جس کے خواب تم نے شاید کبھی نہیں دیکھے تھے اور میں نے اسے کھودیا۔ میں جو بچپن سے اس کی رفاقت کے خواب دیکھتی آرہی تھی۔“ اس کی آنکھوں سے دو آنسو ٹپک کر اخبار میں جذب ہو گئے۔

یہ آنسو نار سائی کے تھے۔ یہ دکھ لا حاصل کا تھا۔ جو اندر ہی اندر اسے کاٹ رہا تھا۔ ”میں روئی نہیں، میں رو نہیں رہی اقتدار احمد۔“ اس نے پھر اپنی آنکھوں کو رگڑ ڈالا۔ اور اخبار کو نہایت احتیاط سے زمین پر بچھا کر اس کی شکنیں دور کرنے لگی۔

برزخ

مجھے جو بھی دشمن جاں ملا وہی پختہ کار جفا ملا
نہ کسی کی ضرب غلط پڑی نہ کسی کا وار خطا ہوا
مجھے ہمسفر بھی ملا کوئی تم ستم ظریف میری طرح
کہیں منزلوں کا تھکا ہوا کہیں راستوں کا لٹا ہوا
اقتدار احمد کی نئی کتاب چھپ کر آگئی تھی۔ خوبصورت گٹ اپ کے ساتھ۔
انگریزی شاعری کا مجموعہ گیتی آر آنے چھپوایا تھا اور اب کی تقریب رونمائی کے سلسلے میں
مصروف تھی۔

”میں چاہتی ہوں اے! اس بار تمہاری اس کتاب کی تعارفی تقریب صرف کراچی
میں ہی منعقد نہ ہو بلکہ پاکستان کے ہر بڑے شہر میں ہوں مجھے یقین ہے کہ یہ کتاب تمہیں
عالمی سطح پر بھی شہرت سے ہمکنار کر دے گی۔“

”ہوں شاید۔“ وہ کچھ کھویا کھویا سا تھا۔

”تم اتنے خاموش اتنے چپ چپ سے کیوں رہتے ہو۔ کیا تمہیں خوشی نہیں
ہوئی۔ دیکھو نا اکبر صاحب نے کتنی خوبصورتی سے کتاب چھاپی ہے۔“
”ہاں دیکھی ہے۔“

”تم یہی چاہتے تھے نا کہ اپنے اندر کی روشنیوں کو باہر لے آؤ۔“
”ہاں میں یہی چاہتا تھا۔“

”اے تم۔“ وہ کچھ جھنجھلا سی گئی۔

”مجھ سے شادی کر کے پچھتا تو نہیں رہے۔“

”نہیں گیت۔“ اس نے متشکر نظروں سے اسے دیکھا۔

”میں فیصلہ کرنے کے بعد پچھتا یا نہیں کرتا۔“

”اور پھر میں تو تمہارا ممنون ہوں گیت تم نے مجھے زمین سے اٹھا کر آسمان پر پہنچا
دیا۔ تم نے مجھے میرا تشخص، میری شناخت دی اور گیت تم یہ کبھی نہ سوچنا کہ میں پچھتا
رہا ہوں۔“

وہ کچھ چپ سی ہو گئی تھی اس کی اتنی خوشی کے اظہار کے باوجود اس کی خاموشی اور
پھر اظہار تشکر۔ پتا نہیں کیوں وہ مجھ سی گئی۔ اور بے دلی سے ورق الٹنے لگی۔ اقتدار
آئینے کے سامنے کھڑا ہو کر نائی باندھنے لگا۔

”تم کہیں جا رہے ہو؟“ اسے تیار ہوتے دیکھ کر اس نے پوچھا۔

”ہاں ذرا اکرام الحق صاحب کے ہاں جاؤں گا۔ انہوں نے میری جاب کے لئے
کسی سے بات کی تھی۔“

”جاب! تم جاب کرو گے۔“ گیتی آر آنے حیرانی سے اسے دیکھا۔

”ہاں۔ اس طرح بیکار بیٹھنا مجھے پسند نہیں ہے۔“

I am Alone in this city of pain

پہلے روز اقتدار نے اپنی یہی نظم سنائی تھی۔ وہ اسے پڑھنے لگی۔
ایک بار، دوبار، تین بار اس نے اسے پڑھا۔ لفظ جیسے درد میں پگھل کر اس کے قلم سے نکلے تھے۔ گیتی کو لگا جیسے اس نے یہ نظم اس کے لئے کہی تھی صرف اس کے لئے وہ بھی کتنی تنہا تھی۔ کتنی اکیلی بچپن سے ہی، I am alone (میں تنہا ہوں) اس نے زیر لب کہا اور کتاب بند کر کے گھٹنوں کے نیچے رکھ دی۔ میں اکیلی تھی۔ اکیلی ہوں اور اکیلی رہوں گی۔ اقتدار احمد تمہاری رفاقت کے باوجود بھی۔ پتا نہیں میں نے صحیح کیا ہے یا غلط اور وہ روی کہتا ہے کہ میں نے فیصلہ کرنے میں جلدی کی ہے اور وہ تو ہمیشہ ہی یہی کہتا رہا ہے۔

پہلے بھی تو اس نے یہی کہا تھا۔ لیکن پھر جب رازی کا راز کھل گیا تو اس نے ایک بار بھی یہ نہیں کہا کہ گیتو I wan you (میں تمہیں چاہتا ہوں) شاید میں نے ٹھیک ہی کیا ہے۔ اقتدار اور رازی میں بہت فرق ہے اسے دولت سے محبت نہیں ہے وہ لالچی اور حریص نہیں ہے پھر وہ خود میری طرف نہیں بڑھا۔

میں نے اس کی طرف پیش قدمی کی تھی اور میں جانتی تھی کہ وہ کچھ مختلف آدمی ہے اور میں نے یہ سوچ کر اس سے شادی نہیں کی تھی کہ وہ مجھے چاہے گا۔ مجھ سے محبت کرے گا میں تو اس پر احسان کر رہی تھی۔ میں تو چاہتی تھی کہ وہ اپنے اندر جلتی روشنیوں کو باہر لے آئے۔ میں دنیا کو ایسے عظیم شخص سے روشناس کروانا چاہتی تھی بس مگر پھر کیوں میرے دل میں بار بار یہ خواہش پیدا ہوتی ہے کہ وہ مجھ سے محبت کرے میرے پاس بیٹھے اور ہم دونوں ہم دونوں۔۔۔ اس نے اضطراب سے اپنے ہاتھوں کو مسلا اور کھڑی ہو کر ٹہلنے لگی۔ تب ہی وہ سب شور مچاتے آگئے۔ نیلی، پنکو، ڈیزی اور روی۔

”یہ کیا بوریت ہے گیتو۔“ نیلی نے شکوہ کیا۔

”آئی ایم سوری اے۔“ وہ شرمندہ سی ہو گئی۔

”میں نے پچاسے بات کی تھی وہ تمہیں اپنا بزنس پارٹنر بنالیں۔ لیکن تم جانتے ہونا رازی کے واقعہ کے بعد وہ خاصا محتاط ہو گئے ہیں۔ چنانچہ وہ اس کے لئے تیار نہیں ہوئے۔ یوں میرا سب کچھ تمہارا ہی ہے اے۔ تمہیں جاب کی کیا ضرورت ہے۔ میں تمہارے اکاؤنٹ میں کل مزید رقم جمع کروادوں گی۔“

”گیت۔ گیت تم۔“ اس نے ہولے سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

”تم بہت اچھی ہو گیت۔ مگر مجھے اس سب کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے دولت سے کبھی محبت نہیں کی گیت بس میں تو صرف یہ چاہتا تھا کہ لوگ مجھے جان لیں۔ اور تم یہ سب جو میرے لئے اتنا کچھ کر رہی ہو۔ یہ بہت زیادہ ہے گیت۔۔۔ It is too much اس سے زیادہ کی چاہ نہیں ہے۔ اور یہ جاب تو محض اپنے آپ کو بہلانے کے لئے تسلی دینے کے لئے ہے کہ میں ناکارہ نہیں ہوں۔ میں صرف تمہارے ٹکڑوں پر نہیں پڑا ہوں۔“

”اے۔“ گیتی نے تڑپ کر اسے دیکھا۔

”اس طرح کی بات مت کرو۔ میں تو بس یہ چاہتی تھی کہ تمہیں پریشان نہ ہونا پڑے اور تم آرام سے تخلیق کرتے رہو۔“

”اس طرح آدمی ایک کونے میں بیٹھ جائے تو تخلیق میں سے سچا کرب ختم ہو جاتا ہے، جھوٹ رہ جاتا ہے۔“

آل رائٹ، جو تمہارا دل چاہے کرو۔“ گیتی آرا پھر کتاب دیکھنے لگی۔

بڑا درد، بڑا کرب تھا اس کی شاعری میں کہیں کہیں تو لفظ زندہ دکھائی دیتے۔ دل کو پگھلاتے ہوئے۔ گداز کرتے ہوئے جیسے کوئی دل کے تاروں کو چھیڑ رہا ہو۔

اقتدار چلا گیا۔ گردہ یونہی بیٹھی پڑھتی رہی۔ ورق الٹی رہی۔

”تمہیں پتا ہے پورے سات دن سے تم نہیں آئیں نہ کلب نہ گھر کیا بات ہے۔“

”کچھ نہیں۔“ وہ بیٹھ گئی۔

”یونہی دل نہیں چاہ رہا تھا۔“

”کہیں تمہارے اکے صاحب نے تو کوئی پابندیاں عائد نہیں کر دیں تم پر۔“ روی نے کن اکھیوں سے اسے دیکھا۔

”سنا ہے یہ متوسط طبقے کے مرد بڑے پوزیو۔ ہوتے ہیں۔ اپنی عورتوں کو گھر کے اندر بند دیکھنا پسند کرتے ہیں اور یہ اس طرح کی سرگرمیاں یہ اتنی بے تکلفی ان کی برداشت سے باہر ہوتی ہے۔“

”وہ بھلا اسے کیسے منع کر سکتا ہے روی۔“ ڈیزی ہنسی۔

”گیتو اس کے لئے کیا کچھ نہیں کر رہی۔ اور وہ بیچارہ تو اگر ساری زندگی اس کے پاؤں دھو دھو کر پیتا رہے تو بھی کم ہے۔“

”ڈیزی فضول باتیں مت کرو۔“ گیتی کو غصہ آگیا۔

”اس میں غصہ ہونے کی کیا بات ہے۔ ڈیز۔“ پنکو نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

”ڈیزی نے کچھ غلط تو نہیں کہا نا۔ غریب آدمی سے شادی کرنے کا ایک فائدہ تو

ہے ساری زندگی بیچارہ بیوی کے سامنے سر نہیں اٹھا سکتا۔ پس میں ہی بنا رہتا ہے۔“

گیتی آرا کو یوں لگا جیسے اس کے ہونٹوں سے لے کر حلق تک میں کڑواہٹ ہی کڑواہٹ گھل گئی ہو۔ مگر وہ خاموش رہی۔

”کیا فضول ناپک لے بیٹھے ہو۔ ڈیز ہم تمہیں لینے آئے تھے۔ ذرا شامی کے ہاں چلتے

ہیں اس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ اکے کہاں ہے۔ اسے بھی ساتھ لے چلتے ہیں۔“

”اکے تو اکرام الحق صاحب کی طرف چلا گیا ہے۔“

”یار گیتی اسے اتنا کھلامت چھوڑو۔ لگا میں سخت رکھو۔ یہ جو شاعر اور ادیب قسم کے

بندے ہوتے ہیں ذرا۔۔“ اس نے بائیں آنکھ کا کوناد بایا۔ ”اور وہاں اکرام الحق کے ہاں

آج کل وہ کیاناں تھا اس کا وہی لمبے بالوں والی شاعرہ۔“

”شاحسن۔“ ڈیزی نے بتایا۔

”ہاں شا بہت آتی ہے اور میں نے دیکھا تھا اس دن بڑی اداؤں کے ساتھ اکے سے بات کر رہی تھی۔“

”افوہ! ختم کرو یہ بات۔ اکے بہت مختلف ہے۔ خاموش طبع اور سنجیدہ سا اس نے تو بلا ضرورت کبھی مجھ سے بھی بات نہیں کی۔“

گیتی آرا نے کہا اور پوچھا۔

”شامی کو کیا ہوا ہے۔“

”پتا نہیں۔“ روی نے بتایا۔

”مانی نے فون کیا تھا کہ شامی کی طبیعت کافی خراب ہے۔“

”اچھا چلتے ہیں۔ تم بٹھو گپ شپ لگاؤ میں تیار ہو کے آتی ہوں۔“

شامی گھر میں اکیلا تھا۔ اس کے ڈیڈی جاپان کے ٹور پر گئے ہوئے تھے اور ممی اس کی بہن کے پاس امریکہ میں تھیں۔ اس کی بہن کے ہاں جڑواں بچے پیدا ہوئے تھے اور فی الحال ان کا واپسی کا کوئی پروگرام نہیں تھا۔ لہذا شامی کی خبر لینے والا کوئی نہ تھا۔ جب وہ سب پہنچے تو وہ تنہا اس بیٹھا تھا۔ اور اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور چہرے پر وحشت تھی۔

”تمہیں کیا ہوا تھا۔“ ڈیزی نے پوچھا۔ مانی نے تمہاری طبیعت کی خرابی کا بتایا تھا۔“

”مجھے پتا نہیں کیا ہوا تھا۔ جب سے کرن گئی ہے مجھے پتا نہیں کیا ہوا ہے۔“ اس نے

بے بسی سے روی کی طرف دیکھا۔

”یار روی تم نے کبھی محبت کی ہے۔“

”نہیں بھائی کون یہ روگ پالے۔“

”گیتو تم۔ تم نے محبت کی تھی نارازی سے اور جب اس نے تمہیں فریب دیا تھا تو تمہیں کیسا لگتا تھا۔ یوں نہیں جیسے کوئی دل کو چیرے جارہا ہو۔“

”ہاں۔ مگر وہ محبت نہیں تھی۔ شامی وہ تو جھوٹ تھا اور مجھے لگتا تھا جیسے کوئی میرا دل ٹکڑے ٹکڑے کر رہا ہو۔ اپنی ناقدری کا دکھ تھا مجھے۔ اس فریب کا رنج تھا۔

اور محبت تو شاید اب۔“ اس نے بات ادھوری چھوڑ دی اور پوچھا۔

”کیا تمہیں کرن کماری سے محبت ہو گئی تھی شامی؟“

”ہاں۔“ اس نے اعتراف کیا۔

”مگر ہم تو اسے مذاق سمجھ رہے تھے یار۔“

میں بھی مذاق ہی سمجھتا تھا۔ پر جب سے وہ گئی ہے مجھے لگتا ہے جیسے مسلسل کوئی

میرا دل چیرے جارہا ہو۔“ اس نے گلاس اٹھا کر گھونٹ بھرا۔

”اور گیتو تم۔“ اس کی آنکھوں میں ہمدردی اور ترس تھا۔

”تم نے اکے سے شادی کیوں۔۔ کی پاگل۔ دوسری بار دھوکا کھا گئیں۔“

”نہیں۔“ گیتی آرانے تڑپ کر اسے دیکھا۔

”اکے رازی کی طرح نہیں ہے۔ وہ بہت مختلف ہے شامی۔ وہ حریص اور لالچی

نہیں ہے۔ یہ صحیح ہے کہ میں اس کا ذریعہ بنی ہوں۔ اس کو مشہور کروانے کا لیکن اس

نے مجھے ذریعہ نہیں بنایا بلکہ میں خود۔ میں نے خود ہی اسے پیشکش کی تھی۔“

”بات تو ایک ہی ہے ناجاناں آگے سے کان پکڑو یا پیچھے سے۔“ رومی نے کہا تو

وہ برامان گئی۔

”پتا نہیں کیوں تم مجھے پچھلے ایک سال سے یہ باور کرانے کی کوشش۔ کر رہے ہو

کہ میں نے اکے سے شادی کر کے غلطی کی ہے۔“

”آئی ایم سوری۔“ رومی نے معذرت کر لی۔

”میرا مقصد تمہارا دل دکھانا نہیں تھا بس میں ایسا ہی محسوس کرتا ہوں۔“ میں

در اصل کچھ اور کہنا چاہتا تھا رومی تم سمجھے نہیں۔“ شامی نے وضاحت کی۔

”پہلی بار جب میں اکے سے ملا تھا تو مجھے لگا تھا کہ جیسے اس شخص نے اپنی آنکھوں

میں کوئی خواب چھپا رکھے ہوں۔ جیسے یہ شخص کسی کی محبت کا ستیا ہوا ہے۔ پھر میں نے

سوچا کہ اس کے خواب وہ نہیں ہیں اور محبت اس کا دکھ نہیں۔ اس کا دکھ تو پہچانا جانا

ہے۔ مگر اب جب وہ نامور ہو رہا ہے اور اس کے سارے خواب پورے ہو رہے ہیں اب

بھی تم نے غور کیا اس کی آنکھوں کی اداسی کم نہیں ہوئی لگتا ہے جیسے اس اداسی کی دھند

کے پیچھے کوئی خواب رو رہے ہوں۔ کسی کی محبت کے خواب۔“

”کرن کماری نے تو تمہیں فلسفی بنادیا ہے شامی!“

رومی نے قہقہہ لگایا۔

”اب تمہیں ہر آدمی اپنی طرح مجنوں ہی نظر آتا ہے۔“

”چلو اٹھو اب یہ سوگ ختم کرو۔ چلو کلب چلتے ہیں۔ وہاں جا کر ناچیں گے، گائیں

گے اور سارے غم بھول جائیں گے۔ دیکھنا کرن کماری کی یاد وہاں تو تمہارے قریب

بھی نہیں پھٹکے گی۔“

”یاد۔“ وہ ہنسا۔

”یہ تم کبھی اکے سے پوچھنا کہ یاد آنا اور یاد کرنا اپنے بس میں ہوتا ہے کیا۔ سب کچھ

ہوتے ہوئے بھی کوئی یاد آتا ہے۔ وہ شاعر آدمی ہے شاید زیادہ بہتر طریقے سے

وضاحت کر سکے۔“ ڈیزی نے ڈیک لگا دیا تھا۔

رومی تھرکنے لگا۔

شامی لڑکھاتا ہوا اٹھ کر ڈریسنگ روم میں چلا گیا۔ گیتی چپ جانے کیا سوچ رہی

تھی۔ اسے لگ رہا تھا جیسے کوئی اس کا دل چیر رہا ہو۔ پھر شامی تیار ہو کر آگیا۔ تو وہ سب روی کی گاڑی میں لد کر مانی کے سنگرز کلب چلے گئے۔

وہ بہت دیر سے واپس آئے تھے۔ اقتدار جاگ رہا تھا اس نے ایک نظر گیتی کو دیکھا اور ہاتھ میں پکڑی ہوئی کتاب بند کر کے نیچے رکھ دی۔

”گیت، تم نے بہت دیر نہیں کر دی؟“

”ہاں۔“ گیتی آرانے عجیب نظروں سے اسے دیکھا۔

تو کیا ہوا تمہیں کوئی اعتراض ہے؟

”نہیں۔ اعتراض تو نہیں میں نے بس یونہی پوچھا تھا۔ پہلے تو تم نے کبھی اتنی دیر

نہیں لگائی تھی۔“

”میں شادی سے پہلے بھی اکثر دیر سے آیا کرتی تھی۔ ہم لوگ کلب گئے تھے۔

وہاں وقت کا پتا ہی نہیں چلتا۔“ گیتی آرانے اسے تکتے ہوئے ٹھہر ٹھہر کر بتایا۔

”لیکن اگر تمہیں پسند نہیں ہے تو۔“

”نہیں نہیں گیت۔“ اقتدار نے اس کی بات کاٹ دی۔

”تمہارا جودل چاہے تم کرو۔ تم میرے لئے اپنے پروگرامز نہیں مس کیا کرو۔ میں

جانتا ہوں کہ تم اس طرح کی زندگی گزارنے کی عادی ہو۔“

”تو تمہیں میری کسی بات پر کوئی اعتراض نہیں ہے اکے۔“ اس نے پوچھا۔

”چاہے میں جو بھی کرتی رہوں۔“

”ہاں ہاں گیتو میں بھلا تمہاری کسی بات پر کیوں اعتراض کروں گا۔“

”ہاں تم بھلا میری کسی بات پر کیوں اعتراض کرو گے۔“ اس نے زیر لب کہا۔ اور

ہونٹ بھیچنے لمحہ بھر اسے دیکھتی رہی۔

”تو پھر۔“ اس نے لفظ چبا چبا کر کہا۔

”تو پھر پلیز مجھے تنہا چھوڑ دو۔ اور دوسرے بیڈ روم میں چلے جاؤ۔“ اقتدار کی آنکھوں میں حیرت سی اتر آئی۔ وہ اپنی خوبصورت آنکھوں کو پورا کھولے لمحہ بھر حیرت سے اسے تکتا رہا۔ پھر ہولے سے سر کو جھٹکا۔

”تم۔ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا گیت۔“

”پلیز۔“

اس نے میز پر اوندھی پڑی ہوئی اپنی کتاب اٹھائی اور سر جھکائے باہر نکل گیا۔

”ایڈیٹ، بے وقوف، پاگل۔“ گیتی آرانے جھلا کر تکیہ اٹھا کر ایک طرف پھینکا اور بستر پر گر پڑی۔

شادی کے بعد اقتدار گیتی آرا کے ساتھ اس کے شاندار گھر کی ایٹکسی میں اٹھ آیا تھا۔ اور تب سے وہاں ہی رہ رہا تھا، شیخ نصیر الدین نے تو چاہا تھا کہ وہ گیتی کو ایک الگ گھر لے دیں لیکن گیتی نے وہاں ہی رہنا پسند کیا تھا۔

”نو پاپا میں الگ گھر میں رہ کر کیا کروں گی۔ خواہ مخواہ کی ذمہ داری۔“

سو اس کی روٹین میں کوئی خاص فرق نہیں پڑا تھا۔ سوائے اس کے کہ اب اقتدار بھی اس کی زندگی میں شامل ہو گیا تھا اس ایک سال کے دوران اس نے اقتدار کے لئے بہت کچھ کیا تھا۔۔۔ بوفے پارٹیاں، ڈنر، لنچ ہر روز ہی کوئی نہ کوئی تقریب منعقد ہوتی تھی۔ اور اس سب کا یہ فائدہ ہوا تھا کہ اقتدار اب نہ صرف کراچی میں بلکہ کراچی سے باہر بھی پہچانا جانا لگا تھا۔ اسکے خواب اب اس کی مٹھی میں تھے۔ پھر بھی جانے کیوں وہ خوش نہیں تھا ایک انجانا سادہ اس کی آنکھوں سے جھلکتا رہتا تھا۔

”آخر وہ اتنا اس کیوں رہتا ہے۔“ گیتی آرانے کروٹیں بدلتے ہوئے سوچا اور شامی کہتا ہے۔

اس کی آنکھیں خواب دیکھتی ہیں۔ کسی کی محبت کے خواب جیسے ماضی نے اسے

باندھ رکھا ہوا اور اس کے پاؤں میں زنجیریں ڈال رکھی ہوں اور کسی دن۔ کسی دن اچانک وہ پلٹ جائے گا۔ ماضی کی طرف۔

وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اقتدار جا چکا تھا اور شاید اب دوسرے بیڈ روم میں مزے سے سو رہا ہو گا اور میں جاگ رہی ہوں۔ جل رہی ہوں۔ تڑپ رہی ہوں۔

وہ اٹھ کر آئینے کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ وہ خوبصورت تھی، دلکش تھی۔ دولت مند تھی۔ پھر۔ پھر اور کیا چاہئے تھا اقتدار کو۔

کیا کوئی اس سے بھی زیادہ خوبصورت۔۔۔ نہیں جھوٹ بولتا ہے۔ شامی اور روی دونوں جھوٹے ہیں۔ وہ دراصل اس سے جلیس ہوتے ہیں۔ اس کی شہرت سے اور اس کی شخصیت کے حسن سے اور اس کے توجہ سے اس سے محبت کرنے پر۔

وہ صرف اس کی بیوی ہی نہیں۔ اس نے اسے عزت دی ہے، مقام دلایا ہے۔ زمین سے اٹھا کر آسمان پر پہنچایا ہے وہ واپس کہاں جائے گا۔ کیا ہے اس کا وہاں۔

ابوڑھے ماں باپ اور بس، شاید اسے ماں باپ کا خیال آتا ہو۔ ان کی یاد ستاتی ہو اور پھر روی بھی تو کہتا ہے کہ یہ متوسط طبقے کے لوگ ایک دوسرے کی محبتوں میں جکڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ ماں باپ، خالہ، پھوپھو بہت ساری محبتیں ہوتی ہیں۔ ان کے ارد گرد یہی بات ہوگی۔ میں کہوں گی اس سے کہ وہ اپنے ماں باپ سے مل آیا کرے۔ کسی دن میں بھی چلوں گی اس کے ساتھ۔ اس کے چھوٹے سے گھر میں۔ اس کے ماں باپ کی محبتوں کے سائے تلے رہنا کتنا اچھا لگے گا۔

اس نے بے حد مطمئن ہو کر سوچا اور واپس آکر بستر پر لیٹ گئی۔ اور پھر بہت سارے دن یونہی گزر گئے۔ وہ بہت مصروف رہنے لگا تھا۔ اور وہ خود بھی مصروف ہو گئی تھی۔ سگرز کلب میں سالانہ فنکشن کی تیاری کے سلسلے میں اس کا زیادہ وقت وہاں ہی گزر رہا تھا۔

وہ ہر سال سگرز کلب کے اس فنکشن میں بہت جوش و خروش سے حصہ لیتی تھی۔ سوا ب بھی وہ بہت مصروف تھی، روی، پنکویا مانی کوئی بھی آکر اسے لے جاتا تھا۔ اقتدار نے کبھی کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔ اکثر اسے دیر بھی ہو جاتی۔ اقتدار اسے کچھ نہ کچھ لکھتے یا پڑھتے ہوئے ملتا۔ یا پھر وہ بھی گھر پر نہ ہوتا۔ اکثر دونوں آگے پیچھے ہی گھر آتے تھے۔ وہ اکثر شامیں اکرام الحق صاحب کے ہاں ہی گزارتا تھا اس کی نئی کتاب کی بہت پذیرائی ہوئی تھی۔

پہلا ایڈیشن تو ہاتھوں ہاتھ بک گیا تھا۔ اگرچہ اس کی نظموں میں کوئی بات تھی۔ کوئی دل کو چھو لینے والا تاثر یوں لگتا تھا جیسے اس کے ہاتھ زندگی کی نبض پر ہوں اور وہ کچھ لکھ رہا ہے کہہ رہا ہے وہ سچ ہو۔ بالکل سچ۔ لیکن اسے بام شہرت تک پہنچانے میں اسکی صلاحیت اور فن سے زیادہ گیتی کی پارٹیوں اور ڈرنز نے کام کیا تھا اور وہ بجا طور پر اس کا ممنون تھا۔ شکر گزار تھا اگرچہ اس کا دل چاہتا تھا کہ گیتی گھر پر رہ کر اس کا انتظار کیا کرے اور وہ دونوں اس طرح زندگی گزاریں جس طرح اس نے بخت کے ساتھ گزارنے کا خواب دیکھا تھا۔ لیکن وہ اسے روک نہیں سکتا تھا اور نہ ہی منع کر سکتا تھا کیونکہ وہ اس کا ممنون تھا اور یہ جذبہ سپاس اسے کچھ کہنے سے روک لیتا۔ اس روز وہ بہت اُداس تھا پتا نہیں کیوں آج اسے بخت بہت یاد آرہی تھی۔ اس کی باتیں اس کا ناراض ہونا دھنسا پھر بابا اور اماں کا خیال اسے بے چین کئے دے رہا تھا۔

”گیتی۔“ اس نے مضطرب ہو کر گیتی کے بیڈ روم میں جھانکا، وہ تیار ہو رہی تھی۔ سیاہ بارڈر والی ہلکی گلابی ساڑھی میں وہ بہت دلکش لگ رہی تھی۔

”ہوں۔“ گیتی آرا نے آئینے میں اپنا جائزہ لیتے ہوئے اسے دیکھا۔

”گیت آؤ آج سمندر کے کنارے چلیں۔ وہاں ٹھنڈی ریت پر ننگے پاؤں گھومیں گے۔ باتیں کریں گے میں تمہیں اپنے بچپن کی باتیں سناؤں گا۔ تم مجھے اپنے ماضی کے

قصے سنانا۔ گیت چلو گی نا۔“

”اوہ نو۔ اے تمہیں پتا نہیں آج کلب میں فنکشن ہے۔ آج تو میں کہیں نہیں جاسکتی۔“

”اچھا۔“ اس کے دل پر اسی کہرے کی طرح گرنے لگی۔

”تم کیوں نہیں میرے ساتھ چلتے آکے! بلکہ سب لوگ کہہ رہے تھے کہ تمہیں لے کر آؤں مگر میں نے وعدہ نہیں کیا تھا کہ شاید تمہاری اپنی کوئی مصروفیت ہو۔“

”نہیں، میں تو فارغ ہوں۔“

”تو پھر چلو نا؟“ بخت کی یاد کا عفریت اسے گھیر رہا تھا جکڑ رہا تھا اس لئے وہ اس سے ڈر کر اس کے ساتھ ہی چلا آیا۔ سب نے بڑے پر جوش طریقے سے اس کا استقبال کیا۔ گیتی اسے چھوڑ کر چلی گئی اور اسٹیج وغیرہ کا انتظام دیکھ رہی تھی۔ وہاں بہت رونق تھی۔ اونچے گھرانوں کے خوش فکرے لڑکے۔ گہرے رنگوں کی شرٹس پہنے ادھر ادھر گھومتے پھر رہے تھے۔ لڑکیاں ایک دوسرے کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے چمکتے چہروں کے ساتھ ہنسی تمقہ لگاتی ہوئی اسے بڑی عجیب لگ رہی تھیں۔

”کیا انہوں نے وہ سب کچھ پالیا ہے جو انہوں نے چاہا۔ وہ سب۔“ اس نے حیرت سے سوچا۔

”تبھی تو وہ اتنی خوش ہیں اور یہ لڑکے بھی۔“

اور وہ اکرام الحق صاحب کہتے ہیں کہ کچھ پانے کے لئے کچھ کھونا پڑتا ہے۔ جیسے میں نے کچھ پایا ہے۔ مگر بہت کچھ کھو بھی دیا ہے کیا پتا کتنا کچھ کھویا ہے۔ اور یہ سب انہوں نے کچھ پانے کے لئے کچھ بھی نہیں کھویا شاید۔“

”کیا سوچ رہے ہو دوست۔“ شامی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

”سوچ رہا ہوں۔“ اس نے مڑ کر شامی کی طرف دیکھا۔

”کچھ پانے کے لئے کچھ کھونا کیا ضروری ہوتا ہے۔“

”شاید۔“ شامی نے جیب سے شیش نکال کر ایک گھونٹ بھرا۔

”ہم نے کچھ نہیں پایا ہاں بہت کچھ کھو دیا۔“

”کیا تم نے بھی کچھ کھو دیا ہے۔ کیا کھویا ہے تم نے؟“ اس نے حیرت سے اسے دیکھا۔

”میں نے۔“ اس نے شیشی جیب میں رکھ کر ہونٹ پونچھے۔

”اے کھویا ہے جو ابھی ملی بھی نہیں تھی لیکن میں اسے اپنا سمجھ رہا تھا۔“

”ہاں کبھی کبھی ہم کسی کو اپنا سمجھنے لگتے ہیں اور پھر وہ ہمیں ملتے بھی نہیں اور کھو جاتے ہیں۔“

”ہاں میں سمجھتا ہوں دوست کہ تم بھی کوئی بہت قیمتی چیز کھو بیٹھے ہو۔ اگر اس

کھوئی ہوئی شے کا دکھ بھلانا چاہتے ہو تو لویو۔“ اس نے جیب سے وہی شیشی نکالی۔

”نہیں۔“ اس نے ہاتھ سے شیشی کو پیچھے کیا۔

”اچھا تو پھر آؤ اندر چلیں۔ شاید پروگرام شروع ہو گیا ہے۔“

وہ اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا اور شامی اسے بتانے لگا کہ جس طرح انہوں نے،

چند لڑکوں نے مل کر اس کلب کی بنیاد آج کے دن ہی رکھی تھی۔ پھر ہولے ہولے

ممبرز کی تعداد بڑھتی گئی اور اب تو تقریباً چھی فیملی کے لڑکے لڑکیاں اس کے ممبرز

ہیں اور مزے کی بات یہ ہے کہ یہ کلب صرف یگ جزیشن کے لئے ہے۔

ہال بھرا ہوا تھا۔ وہ دونوں ایک طرف بیٹھ گئے پروگرام شروع ہو چکا تھا وہ سر

جھکائے بیٹھا تھا کہ اچانک شور ہوا۔ اور تالیاں بجنے لگیں اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ چمکیلے

چست لباس میں گیتی شعلہ جوالا بنی کھڑی تھی۔

”اب گیتی آرار قص کریں گی۔“ اسٹیج سیکرٹری نے اعلان کیا۔

وہ پارے کی طرح تھرک رہی تھی اور ہال میں سیٹیاں اور تالیاں بچ رہی تھیں۔ وہ ایک دم گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا ہال کے دروازے پر رومی نے اسے روکا۔
ارے اے تم جا رہے ہو۔ ابھی تو بہت پروگرامز ہیں۔“
”ہاں۔“ اس کے چہرے پر وحشت سی برس رہی تھی۔ رومی کے ہونٹوں پر ایک طنزیہ سی مسکراہٹ آگئی۔

”پتا نہیں تم متوسط طبقے کے لوگ اتنے تنگ نظر کیوں ہوتے ہو۔“
اقتدار کی آنکھیں چلنے لگیں اور وہ باہر نکل آیا۔ پھر بہت دیر تک وہ اکرام الحق صاحب کے ہاں بیٹھا رہا۔ آج ان کی محفل میں ایک بڑے صاحب کرامت بزرگ آئے ہوئے تھے۔ ان کی باتوں میں وقت گزرنے کا پتا ہی نہ چلا اور جب رات گئے وہ واپس پلٹا تو گیمیتی کے بیڈروم کی لائٹ جل رہی تھی۔ شاید وہ واپس آگئی تھی۔ وہ لمحہ بھر اس کے بیڈروم کے باہر کھڑا کچھ سوچتا رہا۔ پھر مڑ کر دوسرے بیڈروم میں چلا گیا۔
صبح گیمیتی اس کے بیڈروم میں آئی تو وہ لکھ رہا تھا۔ اور اس کے سامنے سگریٹ کے ٹوٹوں کا ڈھیر لگا تھا۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ سینئر ٹیبل پر پڑا ہوا ایش ٹرے بھی سگریٹوں سے بھرا ہوا تھا۔

شاید وہ ساری رات جاگتا رہا تھا۔
”اے تم کہاں چلے گئے تھے؟“

اقتدار نے مڑ کر اسے دیکھا، گلابی نائیکی سے اس کا خوبصورت بدن جھل رہا تھا اور رات سب اس بدن کو ہر زاویے سے دیکھ رہے تھے۔

”میں۔۔۔ دل نہیں لگ رہا تھا وہاں۔ اس لئے چلا آیا تھا۔“

”مگر تم گھر پر تو نہیں تھے۔“

”میں وہاں سے سیدھا اکرام الحق صاحب کی طرف چلا گیا تھا۔“

”مگر تم کیوں آگئے تھے۔ کیا میرا قص کرنا تمہیں پسند نہیں آیا تھا۔“
”تمہارا قص۔“ اس نے نگاہیں چرائیں۔
”نہیں اچھا تھا بہت اچھا۔“

”اور وہ رومی کہہ رہا تھا کہ تمہارا پالتو شوہر تمہیں قص کرنا دیکھ کر برداشت نہیں کر سکا اس لئے بھاگ گیا۔“ اس نے سوچا اور وہیں ایک طرف اس کے بیڈ کے کنارے پر ٹنگ گئی۔

”کیا تم سوئے نہیں رات بھر۔“

”ہاں۔“

”کیا لکھا؟“

”پتا نہیں کیا کچھ لکھ ڈالا۔“ اس نے میز پر بکھرے ہوئے کاغذوں کی طرف دیکھا، گیمیتی نے ہاتھ بڑھا کر ایک کاغذ اٹھالیا۔

”اے تمہارے ہاں اتنا کرب کیوں ہے؟“

”پتا نہیں۔“

”کیا تمہیں کسی کی یاد ستاتی ہے۔“

”یاد؟“ اس نے گہری نظروں سے گیمیتی کو نہ دیکھا۔

”یاد۔ تو بہت قیمتی سرمایہ ہوتی ہے۔ گیت بھلایا دوں نے بھی کبھی ستایا ہے۔ انہیں

تو سنبھال سنبھال کر سینٹ سینٹ۔۔۔ کر رکھنا پڑتا ہے۔“

”اے بعض اوقات تم بہت مشکل بات کرتے ہو، ناقابل فہم۔ مجھ سے صاف

بات کیا کرو۔ چلو کسی دن تمہارے گھر چلتے ہیں۔“

”میرے گھر؟“ اس نے سوالیہ نظروں سے گیمیتی کو دیکھا۔

”میں نے تو کوئی گھر نہیں بنایا گیت۔ میں تو خود تمہارے گھر میں رہتا ہوں۔ میرا

گھر تو بس خواب میں بنا تھا۔ خواب میں ہی ٹوٹ گیا۔
”اے۔“ اس نے الجھ کر کہا۔

”میں تمہارے والدین کے گھر کی بات کر رہی ہوں۔“

”وہاں۔ تم وہاں جا کر کیا کرو گی گیت۔ وہ گھر تمہارے شایان شان نہیں ہے۔“

”اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ وہ گھر کیسا ہے۔ اصل بات تو یہ ہے کہ وہاں تمہارے والدین رہتے ہیں۔ ہم ان سے ملنے جائیں گے کیا وہ تمہیں دیکھ کر خوش نہیں ہوں گے۔“

”ہاں۔ شاید، پتا نہیں۔“

”میرا خیال ہے۔ ایک بار ہم ان سے مل آئیں۔ تم ان سے پچھڑ کر اداس رہتے ہو۔ پھر تمہاری یہ اداسی ختم ہو جائے گی اور تم چیزوں کو بھرپور طور پر انجوائے کر سکو گے۔“

”میں اداس نہیں رہتا گیت۔ ہاں میری دلچسپیاں اور طرح کی ہیں۔ تاہم میں کوشش کروں گا کہ تمہارا ساتھ دے سکوں۔“ اس نے خلوص دل سے وعدہ کیا لیکن وہ اسکا ساتھ نہ دے سکا۔ دونوں الگ الگ راستوں پر چل رہے تھے اور ہر آنے والا دن ان کے درمیان فاصلے پیدا کر رہا تھا۔ گیتی نے کئی بار اسے گھر چلنے کو کہا۔ مگر ہر بار اس نے ٹال دیا۔

”آخر تم مجھے گھر لے کر کیوں نہیں چلتے؟“ ایک دن وہ الجھ پڑی۔

”اس لئے کہ میرے والدین تمہیں قبول نہیں کریں گے۔“

”کیوں آخر مجھ میں کیا کمی ہے؟“

”تم میں کوئی کمی نہیں ہے گیت لیکن میں جانتا ہوں کہ انہیں میری نافرمانی کا دکھ

ہے۔“

”میں انہیں منالوں گی۔“ اس نے ضد کی۔

”تم مجھے ایک بار وہاں لے کر تو چلو۔“ بقول رومی کے آج کل اس کے اندر اپنی آیا ماں کی روح حلول کر گئی تھی اور وہ سب کی محبتیں سمیٹنا چاہتی تھی می کی۔ ڈیڈی کی، اقتدار کے والدین کی اور اقتدار کی۔

”آئی ایم سوری گیت میں تمہیں وہاں لے کر نہیں جاسکتا۔ میں ان کا سامنا نہیں کر سکتا۔

”کیا رازی کی طرح تمہاری بھی وہاں کوئی بیوی اور بچے ہیں۔“ اس نے شکی نظروں سے اسے دیکھا۔

”نہیں گیت میرا اعتبار کرو۔ میں نے تم سے پہلے کبھی کوئی شادی نہیں کی۔“

”تم جھوٹ بولتے ہو۔ تم فریبی ہو رازی کی طرح تمہیں شہرت پانے کے لئے اپنا مقام بنانے کے لئے میرے سہارے کی ضرورت تھی اور تم نے۔“

”تم صحیح کہتی ہو گیت۔ مجھے تمہاری ضرورت تھی لیکن میں نے تمہیں کوئی فریب نہیں دیا۔ کوئی دھوکا نہیں دیا۔ میں نے تمہیں اپنے متعلق سب کچھ بتا دیا تھا۔ میں نے تم سے یہ کبھی نہیں کہا تھا گیت کہ میں تم سے محبت۔“

”ہاں۔“ اس نے شکست خوردگی سے کہا۔

”تم نے یہ کبھی نہیں کہا کہ تم مجھ سے محبت کرتے ہو۔“

”مگر اب تم میری بیوی ہو گیت۔ شادی ایک معاہدے کا نام ہے۔ باہمی رضا مندی کا نام۔ ہم دونوں نے اپنی اپنی مرضی سے ایک دوسرے کو منتخب کیا ہے اور میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ تمہارے علاوہ میری کوئی بیوی نہیں ہے۔ مجھے ان محبتوں کی قسم جنہیں میں چھوڑ آیا ہوں۔ وہ محبتیں جنہوں نے مجھے پال پوس کر بڑا کیا۔ مجھ سے امیدیں وابستہ کیں۔“

”آلہ رایت۔“ گیتی کو اس کی بات پر یقین آگیا۔ سچ اس کے لفظ لفظ سے ٹپک رہا

”ویری سیڈ (بہت افسوسناک) گیتو تمہیں کیا ہو گیا ہے۔“ روی نے افسوس کا اظہار کیا۔

”تم گیتی اکے کے ساتھ چند دنوں کے لئے اس کے گھر چلی جاؤ۔“ شامی نے ہمدردی سے اسے دیکھا۔

”مجھے یقین ہے، وہاں تمہارے اندر کے سارے خلا پر ہو جائیں گے۔ یہ میرا مخلصانہ مشورہ ہے۔“

”وہ مجھے وہاں نہیں لے جانا چاہتا۔“ اس نے افسردگی سے کہا۔

”لیکن کیوں؟“ پنکو نے منہ پھاڑ کر جمائی لیتے ہوئے پوچھا۔
There is some thing wrong in the bottom (اس کے پس منظر میں کوئی غلط بات ہے) روی نے اندازہ لگایا۔

”تمہارا کیا مطلب ہے؟“ مانی نے پوچھا۔

”وہاں ممکن ہے، اس کے والدین کے گھر میں اس کی ایک عدد بیوی اور۔۔۔“

”نہیں۔“ گیتی نے اس کی بات کاٹ دی۔

”ایسا نہیں ہے۔“

”تو پھر۔۔۔ روی نے آنکھیں گھمائیں۔

”کوئی محبوبہ۔“

”نہیں۔“ گیتی نے گری ہوئی آواز میں کہا۔

”ایسا نہیں ہو سکتا۔“

”ایسا ہی ہو گا گیتو۔ تم محض اپنے آپ کو بہلا رہی ہو۔“ مانی نے پر خیال انداز میں کہا۔

”تم نے کبھی غور کیا اس کی شاعری میں کسی سے ہچڑ جانے کا دکھ ہے۔ کسی کی یاد

کی کک ہے۔ لگتا ہے جیسے وہ شعر کے پردے میں کسی سے باتیں کر رہا ہو۔“

تھا۔ اس کی بات کا یقین کر لینے کے باوجود بھی وہ اس تھی۔ اور اس اداسی کو وہ کوئی نام نہ دے پار ہی تھی۔

تب وہ تیار ہو کر اپنے دوستوں کی طرف چل دی۔ پنکی کے ہاں برتھ ڈے پارٹی تھی۔ سب اس کے گھر جمع تھے۔ ہنسی، قہقہے۔ شور ہنگامہ، بہت دیر بعد جب ہنگامہ تھا تو روی نے ایک طرف خاموش بیٹھی کچھ سوچتی ہوئی گیتی سے کہا۔

”آؤ گیتی رقص کریں۔ کرتے رہیں۔ کرتے رہیں۔ ایک دوسرے کی بانہوں میں بانہیں ڈالے ناچتے رہیں یہاں تک کہ رات گزر جائے۔“

”آئی ایم سوری روی میرا موڈ نہیں ہے۔“

”موڈ کیوں نہیں ہے۔“

”بس۔“ اس نے کندھے اچکائے۔

”کیا بات ہے گیتو میں محسوس کر رہا ہوں کہ تم کچھ دنوں سے پھر بڑی پُپ پُپ رہنے لگی ہو۔“ مانی نے بڑے خلوص سے پوچھا۔

”ہماری گیتو کے کی صحبت میں رہ کر فلسفی بن گئی ہے۔“

”کیا سوچتی رہتی ہو گیتو۔“ مانی نے پھر پوچھا۔

”کبھی کبھی۔۔۔“ اس نے سب کی طرف دیکھا۔

”میں بڑی عجیب باتیں سوچتی ہوں۔“

”مثلاً۔“ پنکی کو لٹڈ ڈرک ہاتھ میں لئے لئے اس کے قریب کھسک آئی۔

”مثلاً یہ کہ ایک چھوٹا سا گھر ہو کچے صحن والا اور وہاں میں ہوں ا کے ہو اور اس

کے ماں باپ ہوں۔ میں ان کی خدمت کروں وہ مجھے دعائیں دیں اور۔۔۔“

”اوہو۔“ نان سینس کیا فضول بات ہے گیتو۔

”وہی متوسط طبقے کی لڑکیوں والی سوچ۔“ ڈیزی نے ناک چڑھائی۔

”اگر میں شاعر ہوتا تو میں بھی کرن کماری سے شعر کے پردے میں باتیں کرتا۔ اسے بتاتا کہ اس کی جدائی میں مجھ پر کیا گزرتی ہے۔“ شامی نے آہستگی سے کہا۔

گیتی آرا بنا بولے ان کے تبصرے، ان کی باتیں سنتی رہیں اور اس کے دل پر جیسے برف سی گرتی رہی۔ ایک بے نام سادکھ، ایک بے وجہ سی اداسی اسے گھیرتی رہی۔

”تم اداس ہو۔“ شامی اپنی بوتل ہاتھ میں اٹھائے اس کے قریب چلا آیا۔

”پتا نہیں۔“

”تم اداس ہو گیتو لو پیو اور سارے غم غلط کر ڈالو۔“ گیتی آرا نے نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا۔

”ادہ مائی ہڈ۔“ مانی کو اچانک یاد آیا۔

”آج نادر خان کے ہاں برج پارٹی تھی۔ ہمیں تو ادھر جانا تھا۔“

”ارے یاد ہی نہیں رہا۔ مسز نادر برج بہت اچھا کھیلتی ہیں۔“ روی نے تبصرہ کیا۔

”میں نہیں جاؤں گی۔“ گیتی نے انکار کر دیا۔

”کم آن یار۔ تم اچھا کھیلتی ہو۔“ پنکو نے اسے بازو سے پکڑ کر اٹھایا۔ تو وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

پھر بہت سارے دن گزر گئے گیتی ایک دم لا پرواہی ہو گئی تھی۔ اور اسکی وہی پرانی مصروفیات لوٹ آئی تھیں۔ دل چاہتا تو اقتدار سے بات کرتی نہ دل چاہتا تو اسے اپنے بیڈ روم سے ہی نکال دیتی۔ اقتدار نے کبھی اس کی کسی بات پر اعتراض نہیں کیا تھا۔ نہ اس کے دیر سے آنے پر نہ اس کے رویے پر اور نہ ہی ان برج اور فلیش پارٹیوں پر جو ساری ساری رات جاری رہتی تھیں۔ وہ اپنی دنیا میں مگن تھا۔ قلم اور شعر سے اس نے ناتا جوڑ لیا تھا۔ اس کی اکثر شامیں ادبی محفلوں میں گزرتیں۔

گیتی شروع میں چند دن اس کے ساتھ گئی مگر پھر دونوں اپنے اپنے راستے پر چلنے

لگے تھے۔ الگ الگ ریل کی طرح ساتھ بھی اور الگ بھی۔ گیتی اکثر غصے میں رہتی تھی۔ نہ جانے کیوں اقتدار کو اس کی ناراضگی اور غصے کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ کئی بار اس کا جی چاہا وہ اس سے اس غصے اور ناراضگی کی وجہ پوچھے۔ لیکن پھر اس نے سوچا ممکن ہے وہ اسے اچھا نہ سمجھے۔ سو وہ خاموش ہی رہا تھا کئی بار اس نے سوچا تھا کہ وہ اسے منع کرے کہ اتنی رات گئے تک باہر نہ رہا کرے۔ کہ اسے اچھا نہیں لگتا مگر ہر بار وہ اسے کہتے کہتے رہ گیا کہ وہ اس کا ممنون تھا۔ شکر گزار تھا اور وہ اس پر پابندیاں عائد نہیں کرنا چاہتا تھا کیونکہ جانتا تھا کہ وہ اسی ماحول کی عادی ہے اور جانتے بوجھے اس نے اسے اپنایا تھا۔

مگر پیاس تو پھر بھی نہیں بجھی تھی۔ تشنگی تو اسی طرح برقرار تھی۔ اس نے سوچا تھا کہ اس کی پیاس بجھ جائے گی وہ گیتی کے سہارے سب کچھ پالے گا۔ وہ سب جس کی اس نے تمنا کی تھی۔ ایک جنت کو چھوڑ کر لیکن اب لگتا تھا کہ ایک جنت ہی تو اس کی سب سے بڑی تمنا تھی مگر اب۔ اب کیا ہو سکتا تھا وہ کھویا کھویا سا رہتا۔ کیا میں گیتی سے شادی کر کے پچھتا رہا ہوں؟“ کئی بار اس نے اپنے آپ سے پوچھا تھا لیکن کوئی واضح جواب اسے نہیں ملا تھا۔ اس نے بہت کچھ پایا تھا لیکن کوئی واضح جواب اسے نہیں ملا تھا۔ اس نے بہت کچھ پایا تھا لیکن پھر بھی کچھ کھو جانے کا احساس شدید تر تھا جو ہر گزرتے دن کے ساتھ پہلے سے زیادہ ہوتا جا رہا تھا اور گیتی کا رویہ اس احساس کو بڑھا رہا تھا۔

”وہ مجھے اپنا نوکر سمجھتی ہے اور میرے ساتھ اس طرح سلوک کرتی ہے جیسے کوئی اپنے پالتو جانور کے ساتھ کرتا ہے۔“ اس احساس نے بار بار اس کے اندر سوئیاں سی چھوئی تھیں اور بار بار اس نے ان سوئوں کو بڑی احتیاط سے ایک ایک کر کے باہر نکالا تھا۔

”نہیں وہ ایسی نہیں ہے۔ بس اس کی سوچ اس کی دلچسپیاں مجھ سے مختلف ہیں اور وہ ایسی ہی زندگی کی عادی ہے۔“ اور وہ خود کو گیتی کا مجرم سمجھتا تھا پوری سچائی اور خلوص کے ساتھ کیونکہ وہ سمجھتا تھا کہ وہ جنت کو اپنے دل میں بسا کر گیتی کے ساتھ فریب کر

”گیت تم کہاں جا رہی ہو؟“ اس کے قریب آتے ہوئے اس نے اپنے مخصوص نرم لہجے میں پوچھا۔

”کیا تم مجھ سے یہ پوچھ سکتے ہو۔“ گیتی نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

”گیت پلیز میری بات سن لو۔ میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔“

”سن لوں گی مگر ابھی تو میں جا رہی ہوں۔“ اور وہ کھٹ کھٹ کرتی نخت سے سر اٹھائے چلی گئی۔ اقتدار تھوڑی دیر تک وہاں ہی کھڑا دیکھتا رہا پھر خود بھی تیار ہو کر باہر نکل گیا۔

رات کو اکرام الحق صاحب کے ہاں چند شعر اکٹھے تھے اور اقتدار اپنا نیا کلام سنارہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں دیئے جل رہے تھے اور اس کے لہجے میں بڑا درد تھا۔ وہ یوں سامنے خلا میں دیکھ رہا تھا جیسے اس کے سامنے کوئی ہو۔ تب ہی مانی وغیرہ کے گروپ کے ساتھ گیتی بھی آگئی۔ اکرام الحق صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں کھڑے ہو کر ان کا سواگت کیا۔ دھیمی سی مسکراہٹ ان کے ہونٹوں پر بجی ہوئی تھی۔

”آپ بڑے دنوں بعد آئے۔“ انہوں نے آہستگی سے پوچھا اور انہیں بیٹھے کا اشارہ کیا۔ اقتدار جیسے ان کی آمد سے بے خبریوں ہی خلا میں دیکھ رہا تھا۔

”ہاں تو اقتدار صاحب پلیز۔“ ان سب کے خاموشی سے بیٹھ جانے کے بعد ایک صاحب نے کہا تو اقتدار نے پڑھنا شروع کیا۔ اور غزل ختم کر کے وہ سر جھکائے بیٹھ گیا۔

”بہت خوف اقتدار صاحب روز بروز آپ کی شاعری میں درد زیادہ جھلکنے لگا ہے۔“

”مسعود بھائی نے کہا تھا۔“ وہ جیسے خواب کی سی کیفیت میں بول رہا تھا۔

”اس سے بچھڑ کر تمہاری شاعری میں نکھار آجائے گا اس کی جدائی تمہیں ایک ایسے درد سے آشنا کرے گی کہ جو تمہیں ایک عظیم شاعر بنادے گا۔“

”وہ کون تھی بھی کس سے بچھڑ کر۔“ ایک صاحب ہنسے تو وہ چونکا۔

رہا ہے لیکن اسے یقین تھا کہ کوئی دن ایسا ضرور آئے گا جب وہ پوری سچائی کے ساتھ گیتی سے محبت کر سکے گا بخت کو اپنے دل سے نکال کر۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے کبھی گیتی کو اپنی محبتوں کا یقین نہیں دلایا تھا اور نہ ہی کبھی لمبے چوڑے ڈائلاگ بولے تھے۔ مگر وہ دن آنے سے پہلے ہی گیتی آرانے اپنا بیڈ روم الگ کر لیا تھا۔

”تم کیا چاہتی ہو گیت؟“ اس نے پوچھا۔

”میں کیا چاہتی ہوں۔“ اس نے شاکی نظروں سے اسے دیکھا۔

”کیا تم نہیں جانتے۔“

”نہیں پلیز گیت مجھے بتاؤ۔“ اس روز بڑے دنوں بعد وہ صبح ناشتے کی میز پر اکٹھے ہوئے تھے۔

”میں کچھ نہیں چاہتی مسٹر اقتدار احمد۔“ اس نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی بیالی ٹیبل پر ٹخ دی۔ ”اور تم مجھے کیا دے سکتے ہو۔ تم ایک تلاش اور کنگے شاعر، ہاں تم مجھے بتاؤ کہ تم اور کیا چاہتے ہو۔ اپنی کسی نئی کتاب کی تقریب رونمائی۔ کوئی نیا ڈر۔“

”گیت۔“ حیرت سے اس کا منہ کھلا اور بند ہو گیا۔

”یہ تم کیسی بات کر رہی ہو؟“

”ایک بلنک چیک میں جانے سے سے پہلے تمہاری ٹیبل پر رکھ جاؤں گی۔ جتنی رقم ضرورت ہو لے لینا۔“ اور وہ ناشتہ ادھورا چھوڑ کر چلی گئی۔ اور پتا نہیں کیوں اپنے بیڈ پر گر کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ چینیں مارے، اونچی اونچی آواز میں روئے اور کمرے میں پڑی تمام چیزیں توڑ پھوڑ کر پھینک دے مگر وہ ضبط کئے چپکے چپکے آنسو بہاتی رہی اور جب دل کا بوجھ کم ہونے کے بجائے بڑھ گیا تو تیار ہو کر باہر نکل آئی۔ اقتدار اسے دیکھ کر ڈرائنگ روم سے باہر نکل آیا شاید وہ ابھی تک وہیں بیٹھا تھا۔

”نہیں۔ کوئی نہیں کوئی بھی نہیں۔ میں شاید اپنے آپ میں نہیں تھا۔“ پھر اس کی نظریں گیتی آرا کی طرف اٹھیں جو بڑی گہری نظروں سے اسے ہی دیکھ رہی تھی۔ اقتدار نے نظریں جھکا لیں۔ اور گیتی آرا کو جیسے کوئی اور اک ہوا۔ کوئی ایسا اور اک جس نے اس کے دل کو لخت لخت کر دیا۔ وہ بالکل ساکت بیٹھی تھی اور اسکے اندر جیسے کوئی آتش فشاں سادھک اٹھا تھا۔

”گیتو۔“ شامی نے سرگوشی کی۔

”میں نے تم سے کہا تھا کہ اکے کی آنکھیں خواب دیکھتی ہیں اور کسی کی یاد اس کی سیاہ آنکھوں کے پانیوں میں تیرتی ہے۔“

گیتی کی آنکھیں جل رہی تھیں اور چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ اندر طوفان اٹھ رہے تھے۔ لیکن وہ خاموش نظروں سے شامی کو دیکھتی رہی۔

”گیتو۔“ شامی نے ہولے سے اس کا ہاتھ دبایا۔

”ٹیک اٹ ایزی۔“ باوجود اس کے اس کا ایک ماضی ہے جس کی زنجیریں ابھی تک اس کے پاؤں میں پڑی ہیں۔ وہ اچھا آدمی ہے سچا اور کھرا۔“

”ہاں۔“ ایک طنزیہ سی مسکراہٹ گیتی آرا کے لبوں پر آگئی۔

”سچا اور کھرا۔ اور وہ جھوٹ نہیں بولتا۔ اس کی آنکھیں، اس کا چہرہ، اس کا لہجہ سب سچ بولتے ہیں۔“ اس نے تھوڑا سا آگے جھک کر اسے دیکھا۔ وہ گھٹنوں پر ٹھوڑی رکھے ساکت بیٹھا تھا اور اکرام الحق صاحب دھیمے لہجے میں کچھ کہہ رہے تھے۔

”اور کاش وہ جھوٹ بول سکتا۔“ اس کی آنکھوں میں جگنو سے چمکے اور اس نے دائیں ہاتھ کی چھوٹی انگلی سے ان جگنوؤں کو صاف کیا۔

”گیت۔“ اچانک اقتدار کھڑا ہو گیا۔

”آؤ گھر چلیں۔“

”کس کے گھر؟“ گیتی نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

”تمہارے گھر۔“ وہ نادم سا ہو گیا۔

میں کوشش کروں گا کہ ہم جلد ہی ایک گھر بنالیں۔ ایک ایسا گھر جو ہمارا گھر ہو گا۔ ہم دونوں کا مشترکہ گھر۔“ اس نے دل ہی دل میں سوچا اور بدستور اس کی طرف دیکھتا رہا۔

”چلو۔“ پتا نہیں کیا سوچ کر وہ کھڑی ہو گئی۔

”اللہ حافظ۔“ اکرام الحق صاحب نے انہیں خدا حافظ کہا اور وہ دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہوئے باہر نکل گئے۔



”مجھے لگتا ہے جیسے میں چلتے چلتے تھک گیا ہوں، بے دم ہو گیا ہوں اور کسی بھی لمحے ہمت ہار بیٹھوں گا۔“

اقتدار نے اکرام الحق صاحب کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ وہ بہت شکست خوردہ بہت تھکا تھکا دکھائی دیتا تھا۔

آج چھٹی کا دن تھا اور اکرام صاحب اکیلے تھے چھٹی کے دن ان کے گھر کا دروازہ بند رہتا تھا۔ یہ دن انہوں نے اپنی ذات کے لئے مخصوص کر رکھا تھا لیکن اقتدار کے لئے کوئی پابندی نہ تھی، اس کا جب دل چاہتا تھا وہ آجاتا تھا۔

”یہ تمھیں کیوں ہے میاں؟“ اکرام الحق نے اپنے گھٹنوں پر رکھے ہوئے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے محبت سے پوچھا۔

”پتا نہیں۔“

”اے سمجھاؤ محبت سے، پیار سے۔ عورت تو پیار کے دو بولوں سے پکھل جاتی ہے۔“

”وہ میری بات نہیں سنتی۔ غصے میں دیوانی ہو جاتی ہے۔ چیزیں اٹھا اٹھا کر پھینکتی ہے۔ اور میں اسے روک بھی نہیں سکتا کہ وہ اس وقت نشے میں ہوتی ہے بے تحاشا

ڈرنک کرنے لگی ہے وہ مجھے بتائیں میں کیا کروں۔ پورا ایک برس ہو گیا ہے اور مجھے لگتا ہے جیسے وہ کسی جہنم میں ہوں۔ میرے ارد گرد شعلے ہیں، بھڑکتے ہوئے شعلے، میں ان شعلوں میں گھرا ہوں۔ یہ آگ مجھے جلا رہی ہے پھر بھی جلا نہیں پاتی۔“

”ہوں۔“ اکرام الحق صاحبِ مہِ خیال انداز میں اسے دیکھ رہے تھے۔

”وہ اکثر راتوں کو بہت دیر سے آتی ہے، میں اس کے انتظار میں جاگتا رہتا ہوں اور جب سوتا ہوں تو خواب مجھے پریشان کرتے ہیں وہی خواب جیسے میرا ایک پاؤں رکاب میں دھرا ہوا اور ایک زمین پر میں کہیں جانے کے لئے تیار کھڑا ہوں۔ یہ خواب میں اس وقت سے دیکھ رہا ہوں جب سے میں نے اپنے اندر روشنیوں کو جاگتے ہوئے محسوس کیا ہے اور جب سے میرے اندر اپنے آپ کو منوانے کی امنگ جاگی تھی۔ پر تب یہ خواب یہیں ختم ہو جاتا تھا مگر اب یوں ہوتا ہے کہ گھوڑا مجھے گرا کر روند کر آگے نکل پاتا ہے۔ یہ اذیت ناک خواب مجھے جگا دیتا ہے اور پھر میں ساری رات نہیں سو سکتا۔“

”تم مکمل طور پر اپنا آپ اسے سوئپ دو۔ ماضی سے ہر تعلق توڑ دو۔ پوری سچائی کے ساتھ اس کے بن جاؤ۔“

”میں نے ماضی سے ہر تعلق توڑ دیا ہے۔“

”نہیں تم اب بھی اپنے ماضی سے بندھے ہوئے ہو اور تمہارے اندر پیچھے کی طرف پلٹ جانے کی خواہش ہمکتی ہے۔ جب تک تم ماضی سے پیچھا نہیں چھڑاؤ گے تب تک اس برزخ سے باہر نہیں نکل سکو گے۔“

”اس میں اور مجھ میں بہت فاصلہ ہے۔ میرے اور اس کے طبقے میں بہت فرق ہے۔ ہماری ویلیوز الگ الگ ہیں۔ وہ جن باتوں کو اچھا سمجھتی ہے۔ وہ میرے نزدیک صحیح نہیں ہیں۔“

”تم اسے اپنے راستے پر چلا سکتے ہو۔ تم اس کے شوہر ہو۔ اسے اپنی مرضی کا پابند

کر سکتے ہو۔“

”شاید نہیں۔ میرے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں اور میری زبان پر تالے پڑے ہیں۔“

”کھول ڈالو اپنے ہاتھوں کو اور یوں بھی اس بچے کی خاطر جو اس دنیا میں آنے والا ہے۔ تم دونوں کو ایک دوسرے کے قریب آنا ہی ہو گا۔ ماضی کی ہر زنجیر کاٹ ڈالو اقتدار۔“ اکرام الحق صاحب نے اسے سمجھایا لیکن نہ وہ ماضی کی زنجیریں کاٹ سکا اور نہ ہی اس پر اپنا اعتبار قائم کر سکا۔ کبھی جو وہ اس کے بیڈ روم میں چلا جاتا تو اس کی آنکھیں شعلے برسانے لگتیں۔

”کیا لینے آئے ہو یہاں؟ جاؤ شعر کے پردے میں اس سے جا کر باتیں کرو۔ اسے بلاؤ۔ اسے پکارو۔“

”گیت مجھے سمجھنے کی کوشش کرو۔“

”کیا سمجھنا چاہتے ہو تم مجھے کیا سمجھاؤ گے۔“ وہ چلانے لگتی تو وہ سر جھکائے اس کے کمرے سے نکل آتا۔

”بے وقوف، احمق، پاگل۔“ اس کے جانے کے بعد وہ سارا غصہ کمرے کی چیزوں پر نکالتی۔ تکیہ، بستر، چادریں سب اٹھا اٹھا کر کمرے کے وسط میں پھینک دیتی۔ اور وہ اپنے کمرے میں بیٹھا سوچتا رہتا کہ چاند کو چھونے کی خواہش میں اس نے اپنے پاؤں زمین سے اٹھالئے تھے۔ اب نہ زمین اس کے پاؤں کے نیچے ہے اور نہ چاند اس کی دسترس میں۔ وہ خلا میں لٹک رہا ہے یا عالم برزخ میں ہے۔

شیخ نصیر الدین پر فالج کا حملہ ہوا تھا اور ان کا دایاں حصہ متاثر ہوا تھا۔ فوری طور پر انہیں ہاسپٹل ایڈمٹ کروادیا گیا تھا اقتدار شام کو گھر آیا تو اسے علم ہوا تو وہ انہیں دیکھنے ہاسپٹل چلا گیا۔ وی۔ آئی۔ پی روم میں وہ اکیلے تھے۔ دو نرسیں ان کے پاس تھیں۔ ماما اور کیتی وہاں نہیں تھیں وہ کچھ دیر بیٹھا رہا۔

”کیا گیتی کو علم ہے کہ اس کے پاپ کی طبیعت اتنی خراب ہے۔“

اس نے سوچا اور پھر اسے تلاشتا ہوا سنگرز کلب پہنچ گیا۔ وہاں اودھم مچا تھا۔ چند لڑکے ایک طرف ہال میں بیٹھے مختلف قسم کے ساز بجا رہے تھے اور چند جوڑے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے لکڑی کے چکنے فلور پر پھسل رہے تھے۔ گیتی کا گروپ لان میں خوش گپیوں میں مصروف تھا۔

”آہا اقتدار صاحب۔“ روی نے بڑے پر جوش طریقے سے اس کا خیر مقدم کیا۔
”آپ آج ادھر کیسے بھول پڑے۔ اب تو آپ بڑے شاعر، بڑے ادیب بن گئے ہیں۔ ہمیں تو دکھائی ہی نہیں دیتے۔“

”میں تو اب بھی معمولی انسان ہوں روی۔“ اس نے گیتی کی طرف دیکھا۔ سیاہ لباس میں اس کا رنگ دمک رہا تھا اور آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں شاید اس نے ڈرنک کی تھی۔
”شاید آپ گیتو کے نقش پا پر چلتے ہوئے یہاں تک پہنچے ہیں۔“

شامی کرن کی محبت میں فلسفی ہو تا جا رہا تھا۔

”مبارک ہو گیتو۔“ وہ گیتی کی طرف مڑا۔

”وہ تمہارے پیچھے چلتا ہوا تم تک پہنچ گیا ہے۔“ گیتی کی آنکھیں چمکنے لگیں اور ہونٹوں پر خود بخود ایک مسکراہٹ آگئی۔

”گیت۔“ وہ دو قدم آگے بڑھ آیا۔

”تمہیں پتا ہے تمہارے ڈیڈی پر فالج کا ایک ہوا ہے۔“ ایک لمحے اس کے چہرے کا رنگ بدلا۔ اور اس نے آہستگی سے کہا۔

”نہیں۔“

”شاید تمہارے گھر سے نکلنے کے بعد ان کی طبیعت خراب ہوئی ہو۔ میں ابھی ہسپتال سے آ رہا ہوں۔ تمہاری ممی بھی وہاں نہیں تھیں۔ میں تمہیں کھوجتا ہوا یہاں

تک پہنچا ہوں۔ چلو۔“

”کہاں؟“ اس کی آنکھوں کی جوت بجھ گئی تھی اور ہونٹوں کی مسکراہٹ مر گئی تھی۔
”ہسپتال۔“

”تم جاؤ اس اطلاع کا شکریہ مجھے جب جانا ہو خود ہی چلی جاؤں گی۔“ اقتدار نے حیرت سے اسے دیکھا۔

”گیت تمہارے ڈیڈی کی طبیعت کافی خراب ہے اور تمہارا وہاں۔“

مجھے معلوم ہے۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر اس کی بات کاٹ دی۔

”تم جاسکتے ہو۔“ وہ سر جھکائے واپس پلٹ آیا۔

”گیتو اس کے ساتھ اس طرح کا سلوک نہیں کرنا چاہئے۔ آخر وہ تمہارا شوہر ہے۔“ شامی نے سنجیدگی سے کہا
”ہوں شوہر۔“ وہ طنزیہ ہنسی۔

”وہ اتنا بڑا آدمی ہے۔ باہر لوگ اس کا احترام کرتے ہیں۔ ایک نام ہے اس کا تمہارے سامنے وہ بھگی بلی بن جاتا ہے۔“

”اسے یہ بڑا آدمی کس نے بنایا ہے شامی۔“ اس کے لہجے میں تلخی تھی اور چہن۔

”میں نے۔ میں نے اسے، اس کو یہ مقام دلویا ہے ورنہ اس کی شاعری اور اس کا ادب اکرام الحق صاحب کے گھر کی چار دیواری میں ہی دم توڑ دیتا۔ اس کا سارا ٹیلنٹ وہیں اپنی موت آپ مر جاتا۔“

”اگر اس کے نصیب میں شہرت لکھی ہوئی تھی تو اسے کوئی اور ذریعہ مل جاتا گیتو مگر۔۔“ اس نے بات نامکمل چھوڑ کر ایک نظر اسے دیکھا۔

”میں سمجھتا تھا تم اس سے محبت کرتی ہو۔“

”نہیں۔“ وہ عجیب جنونی سی ہنسی ہنسی۔

”وہ میری ضرورت تھا۔ میں تنہائی فیل (محسوس) کرتی تھی اکیلی تھی۔ اس لئے میں نے اسے خرید لیا جس طرح بچپن میں کوئی گڑیا یا۔۔ کوئی قیمتی کھلونا خرید کرتی تھی اس کھلونے کو خریدتے وقت مجھے یہی محسوس ہوتا تھا کہ اگر یہ کھلونا میں نے نہ خرید اتو جانے کیا ہو جائے گا۔ چند دن مجھے اس سے بڑا لگاؤ رہتا۔ وہ کھلونا مجھے بہت عزیز رہتا مگر۔۔“

”وہ کھلونا نہیں گیتو انسان ہے۔“ شامی جانے کیوں آج اس کی سائیڈ لے رہا تھا۔

”تمہیں اس سے اتنی ہمدردی کیوں ہو رہی ہے۔“

”اس لئے کہ محبت کرنے والوں کی فریکوینسی یکساں ہوتی ہے۔ اس کا دل محبت کا لازوال خزانہ ہے۔ میں نے اسے پہچان لیا ہے گیتو تم بھی اس لازوال خزانے میں حصہ دار بن جاؤ محبت کرنے والا دل کسی سے نفرت نہیں کر سکتا۔“

”ہاں وہ مجھ سے نفرت نہیں کر سکتا کیونکہ لینے والا ہاتھ دینے والے ہاتھ سے نفرت نہیں کر تا بلکہ ممنہن ہوتا ہے اس کا احسان مند ہوتا ہے۔“

”گیتو اسے سمجھنے کی کوشش کرو۔“ شامی نے بے بسی سے کہا اور اپنی جیب سے بوتل نکال کر منہ سے لگالی۔

”میں نے کہیں پڑھا تھا کہ سچا شاعر یا ادیب کبھی نہیں بکتا۔ حیرت ہے اے تمہارے ہاتھوں میں کیسے بک گیا۔“ مانی نے جو اتنی دیر سے نہایت انہماک سے اس کی اور شامی کی گفتگو سن رہا تھا پوچھا۔

”یہاں اس دنیا میں ہر چیز بک جاتی ہے مانی ڈیئر فرینڈ۔ بس قیمت لگانے والا قیمت لگانا جانتا ہو اور گیتو نے اے کی صحیح قیمت لگائی تھی وہ سمجھ گئی تھی کہ وہ کس قیمت پر بکے گا۔“ روی نے بھی گفتگو میں حصہ لیا۔

”کچھ لوگ نہیں بکتے ساری دنیا مادیت پرست نہیں ہوتی ہے۔ جو لوگ Materialist نہیں ہوتے وہ اس طرح سے بک جاتے ہیں۔ کچھ لوگ محبت کے دو

بولوں کے عوض اور کچھ لوگ۔۔“

”اوہ مائی گاں۔ تم کس قدر روبرو باتیں کر رہے ہو۔“ پنکو کپڑے جھاڑ کر کھڑی ہو گئی۔

”آؤر قص کریں یا گائیں۔“

”چلو۔“ وہ سب کھڑے ہو گئے۔

”گیت چار دن ہو گئے ہیں تم پہا کو دیکھنے ہاسپٹل نہیں گئیں۔“ ناشتے کے بعد اس نیلی کے ساتھ کہیں جاتے دیکھ کر اقتدار نے پوچھا۔

”میں جاؤں یا نہ جاؤں یہ میرا ذاتی مسئلہ ہے اقتدار احمد۔“

”مگر گیت وہ تمہارے ڈیڈی ہیں۔ تمہیں وہاں جانا چاہئے ڈاکٹر کوئی تسلی بخش بات نہیں کرتے اور وہ کل بھی تمہیں پوچھ رہے تھے۔“

”مجھے پوچھ رہے تھے۔“ وہ عجیب طرح سے ہنسی۔

”کیا ان کی اتنی مصروف لائف میں میرے لئے اتنا وقت نکل آیا کہ انہوں نے مجھے سوچا اور پوچھا۔ واٹ آفنی تھنک اٹ از۔“

”گیتی ڈار لنگ۔“ ماما سے پکارتی ہوئی بیڑھیوں سے اتر رہی تھیں۔ گلابی پھولوں والی نیوی بلیو ساڑھی میں نیلم کی میچنگ جیولری کے ساتھ وہ بہت دلکش لک رہی تھیں۔

فریش اور خوش نصیر الدین کی بیماری کی کوئی فکر کوئی تردد ان کے چہرے پر نہ تھا۔

”ہائے ماما۔“ گفتگو نے ہاتھ ملایا۔

”یہ تم نے اپنا کیا حال بنا رکھا ہے جانو۔“ انہوں نے سر سے پاؤں تک اسے دیکھا۔

”ارے تم نے مجھے کچھ بتایا ہی نہیں۔“

”کیا؟“ گیتی آرا نیلی کے کندھے پر ہاتھ رکھے کھڑی تھی۔ اور اپنی بڑی بڑی آنکھیں کھولے حیرت سے انہیں دیکھ رہی تھی۔

”ہاؤ انوسٹ یو آر۔“ پھر وہ اقتدار کی طرف مڑیں۔

”ڈیز تم اس کا خیال رکھو۔“

”جی۔“ اقتدار نے فرمانبرداری سے کہا۔

”اور ہاں گیتی تم اپنے پاپا کو دیکھنے نہیں گئیں۔“

”نہیں۔“ اس نے سنجیدگی سے کہا۔

”ماما آپ کو پتا ہے۔“ اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک لہرائی۔

”مجھے پاپا سے کتنی شدید محبت ہے۔ می میں انہیں تکلیف میں نہیں دیکھ سکتی،

ڈپریشن ہوتا ہے مجھے۔“

”چند لمحوں کے لئے دیکھ آنا۔“

”یس ماما لیکن۔ میں آج کل پاپا کی وجہ سے بہت اپ سیٹ ہو گئی ہوں۔ سوچ رہی

ہوں کچھ دنوں کے لئے باہر چلی جاؤں۔“

”ہاں ضرور۔“ وہ پورچ کی طرف بڑھیں۔

”آپ ہاسپٹل جا رہی ہیں۔“

”اوہ نوڈار لنگ آج تو کلب میں الیکشن ہو رہا ہے میں شام کو جاؤں گی۔ تمہارے پاپا

بڑے مامام سے ہیں بہت بہتر ہیں۔ نرسیں ہر وقت ان کے پاس رہتی ہیں۔“

”I Know Mamma، (میں جانتی ہوں) ان کے جانے کے بعد اس نے نیلی

کے کندھے سے ہاتھ ہٹایا اور وہیں پڑی کرسی پر بیٹھتے ہوئے حیران کھڑے اقتدار کی

طرف دیکھا اور ہنس دی۔ مگر اقتدار اس کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔ اس کی نگاہیں زمین

پر جمی تھیں اور وہ سوچ رہا تھا کہ وہ جو اس نے کہیں پڑھا تھا کہ محبت کی ویلیو ہر طبقے میں

یکساں ہوتی ہیں تو شاید غلط تھا۔

اسے یاد آیا کہ ایک بار جب بابا بیمار ہو گئے تھے تو اماں کیسے رات رات بھر جاگ کر

ان کی تیمارداری کرتی تھیں اور اس کی جب بھی آنکھ کھلتی تھی یا تو وہ جانماز بچھاڑے

سجدہ ریز ہوتے یا بابا کا سر یا بازو دوبارہ ہوتی تھیں اور ان دس بارہ دنوں کی بابا کی بیماری میں وہ کتنی کمزور ہو گئی تھیں۔ اور جب بابا ٹھیک ہو گئے تھے تو کئی بار انہوں نے کہا تھا کہ لگتا ہے میں نہیں تم بیمار ہوئی تھیں۔ اور گیتی کی ماما کتنی فریش لگ رہی تھیں۔ جیسے انہیں اس بات کی ذرا بھی پروا نہ ہو کہ ان کا شوہر ہاسپٹل میں بیمار پڑا ہے اور اگر کبھی مجھے کچھ ہوا تو شاید گیتی بھی اسی طرح کرے گی بلکہ شاید اس سے بھی بدتر ممکن ہے وہ مجھے کسی خیراتی ہسپتال میں پھنکوا دے کہ بہر حال مجھ میں اور نصیر الدین میں بہت فرق ہے کہ میں۔۔۔ اور پھر نہ جانے کہاں سے بخت اس کے خیالوں میں در آئی۔ اور اگر گیتی کی جگہ بخت ہوتی تو۔

”کیا سوچ رہے ہو اے؟“ نیلی نے پوچھا تو اس نے چونک کر دونوں کی طرف دیکھا۔

”کچھ نہیں۔ میں سوچ رہا تھا کہ گیتی کو باہر نہیں جانا چاہئے۔ ایک تو پاپا ہاسپٹل میں

ہیں اور دوسرے خود اسے ان دنوں سفر نہیں کرنا چاہئے۔“

”تم ڈاکٹر تو نہیں ہونا۔ اور جہاں تک پاپا کی بات ہے تو میرا خیال ہے اس کے لئے

میرا یہاں رہنا کوئی اتنا ضروری نہیں ہے۔“

”ضروری ہے گیت!“ اس نے نرمی سے سمجھایا۔

”جب آدمی بیمار ہوتا ہے تو اسے اپنی ضرورت ہوتی ہے۔ بے شک تمہیں

کچھ کرنا نہیں ہے، نرسیں ہیں ڈاکٹر ہیں مگر تمہارا وہاں ہونا ضروری ہے۔ خوشی ہوتی

ہے مریض کو کوئی اسے پوچھنے والا ہے۔ میں جانتا ہوں تو تمہارے پاپا بہت خوش ہوتے

ہیں اور اس خوشی۔۔۔“

”تمہیں ان کی خوشنودی کی ضرورت ہے مجھے نہیں۔“ گیتی نے اس کی بات کاٹ دی۔

”مجھے پتا ہے کہ اگر وہ مر گئے تو ان کی ساری دولت مجھے ملنی ہے۔ جبکہ تم اس لئے پاپا

کی خدمت کر رہے ہو کہ شاید وہ تمہیں کچھ دے جائیں۔ تمہارے نام کچھ کر جائیں۔“

”گیت۔“ اس کی آواز بلند ہو گئی۔

”میں ایسا نہیں ہوں۔“

”مت چیخوٹ از آفیکٹ۔“

”تم کتنی ظالم ہو گیتی۔ ہاؤ کروئل۔“ اس نے آہستگی سے کہا لیکن گیتی نے سن لیا اور

چیخ پڑی۔

”ہاں ہاں میں ظالم ہوں، پتھر ہوں، کیوں کی تھی مجھ سے شادی۔ تم خود غرض، لالچی، حریص شخص۔“

”گیت۔“ اس نے اس کے ہاتھ تھام لئے۔

”ہوش میں آؤ۔“

”ہٹ جاؤ میرے سامنے سے۔“ گیتی نے اسے دھکا دیا۔ اسے دورہ سا پڑ گیا تھا، اور وہ چیزیں اٹھا اٹھا کر پٹخ رہی تھی۔

”گیتو کیا ہو گیا ہے تمہیں۔“ نیلی نے اسے سنبھالنے کی کوشش کی۔

”کچھ نہیں ہوا مجھے، اس لالچی خود غرض شخص سے کہو کہ میرے سامنے سے ہٹ

جائے۔“

”میں لالچی یا خود غرض نہیں ہوں گیتو۔“ اس نے بے بسی سے کہا۔

”تم لالچی نہیں ہو۔“ وہ ہنسنے لگی۔

”تم خود غرض نہیں ہو۔“ اس کا قبضہ بلند ہو گیا۔

”تم نے دولت کے لالچ میں، پیسے کی ہوس میں اسے چھوڑ دیا۔ وہ جس سے تم

شعروں میں باتیں کرتے ہو۔ جس کی یاد میں تمہارے لفظ روتے ہیں۔ جس کی جدائی

نے تمہارے فن کو نکھار دیا ہے۔“

”گیت تم۔۔“

”مت جھوٹ بولو مجھ سے تم جھوٹ نہیں بول سکتے تمہیں جھوٹ بولنا بھی نہیں

آتا۔ اور وہ شامی بھی کہتا ہے کہ تم سچے اور کھرے آدمی ہو لیکن اس کے ساتھ ہی کتنے

خود غرض اور لالچی۔ گیٹ آؤٹ۔“ وہ ہنسنے ہنسنے پھر چیخنے لگی۔

اس نے بے بسی سے اسے دیکھا اور سر جھکائے لمبے لمبے ڈگ بھر تا وہاں سے ہٹ گیا۔

گیتی ہانگ کانگ سے واپس آئی تو شیخ نصیر الدین ابھی ہاسپٹل میں ہی تھے اور ماما کو

ان کی طویل بیماری سے ڈپریشن ہو رہا تھا۔ وہ بہت اپ سیٹ تھیں اور چاہتی تھیں کہ

انہیں باہر لے جائیں جبکہ ڈاکٹروں کا خیال تھا کہ انہیں باہر لے جانے کی قطعی کوئی

ضرورت نہیں ہے کیونکہ اب وہ پہلے سے بہت بہتر تھے معمولی ایکسر سائز کی ضرورت

تھی۔ لیکن وہ باہر لے جانے پر بضد تھیں۔

”کیا خیال ہے تمہارا جان تمہارے پاپا کو امریکہ نہ لے جاؤں۔“

”ایزیوش ماما۔“ وہ بہت تھکی تھکی اور نڈھال لگ رہی تھی۔ ریلیکس ہونے کے

بجائے وہ مزید ڈپریشن لگتی تھی۔

”پھر بھی۔“

”جو آپ کا دل چاہے ماما۔“ وہ بیزار سی لگ رہی تھی۔ شام کو اس کا سارا گروپ

شور مچاتا آ گیا۔ اقتدار اپنے بیڈروم میں تھا۔

”اے گیتو تم کچھ زیادہ کمزور نہیں ہو گئی ہو۔“ شامی نے بغور اسے دیکھا اس کے

آنکھوں کے گرد حلقے پڑ گئے تھے اور رنگ زرد ہو گئی تھی۔

”اور جسم دیکھو نا کیسا بے ڈول ہو رہا ہے۔“ ڈیزی نے بھی تبصرہ کیا۔

”وہ تو بھی اب ہونا ہی ہے۔“ نیلی ہنسی۔

”اچھا۔“ شامی نے کچھ سمجھتے ہوئے سر ہلایا۔

”یہ اچھی بات ہے۔“

”تمہیں اب اپنا خیال رکھنا چاہئے۔“ پتکو نے مشورہ دیا۔

”اور اس اکے کو بھی تو تمہارا خیال رکھنا چاہئے۔“

”وہ کون ہوتا ہے میرا خیال رکھنے والا۔“ وہ ایک دم بھڑک اٹھی۔

”تمہارا شوہر نامدار۔“ روی نچلے ہونٹ کو دانتوں تلے دبا کر ہنسا۔

”مائی فٹ۔“ اس کے لہجے سے حقارت جھلک رہی تھی۔ پھر جلد ہی وہ سب اٹھ

گئے۔ ان کا کوئی پروگرام تھا البتہ نیلی اس کے پاس رہ گئی تھی۔

”گیتو ایک بات کہوں۔“

”کہو۔“ اس نے تیکے سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔

”تم اپنے رویے میں کچھ تبدیلی پیدا کرو۔ خاص طور پر اب جبکہ تم ماں بننے والی

ہو۔ یہ بچہ یقیناً تم دونوں کو قریب لے آئے گا۔“

”یہ بچہ۔“ وہ ہڈیانی انداز میں ہنسی۔

”یہ بچہ ہم سب سے مختلف نہیں ہوگا۔ یہ بھی ہمارے جیسا ہوگا۔ ماما اور میرے

جیسا۔ جس کی محبت کا معیار بھی یہی ہوگا کہ میری اور ماما کی طرح پاپا کو ہاسپٹل چھوڑ کر

دل بہلانا باہر چلا جائے گا۔ نیلی ایسا کیوں ہوتا ہے، یہ ہمارے اور آیا اماں کے طبقے میں

محبت کے معیار میں اتنا فرق کیوں ہے۔“

”تم اپنی آیا اماں کو نہ بھولنا گیتو۔“

”نہیں۔ میں تو بھول گئی ہوں۔“

”گیتو میں یہ سمجھتی ہوں کہ تم اکے سے محبت کرتی ہو میری یہ سمجھ میں نہیں آتا

کہ اگر یہ محبت ہے تو پھر تمہارا یہ حقارت آمیز رویہ کیا ہے تم کیا چاہتی ہو۔“

”پتا نہیں۔“

اس نے بے بسی سے نیلی کی طرف دیکھا۔

”مجھے خود اپنی سمجھ نہیں آتی کہ میں کیا چاہتی ہوں۔“

”تم دونوں نے اپنی پسند سے شادی کی تھی سب نے تمہیں سمجھایا تھا مگر تم نہیں

مانی تھیں حالانکہ روی نے کہا تھا کہ وہ بھی رازی کے طبقے سے تعلق رکھتا ہے اور شاید وہ

بھی رازی کی طرح تمہیں۔۔۔“

”نہیں۔“ اس کی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے۔

”وہ رازی کی طرح نہیں ہے۔ وہ رازی نہیں ہے کاش وہ رازی کی طرح ہی ہوتا۔

محبت نہ سہی مگر جھوٹ ہی ہوتا۔ جھوٹ ہی بولتا۔ پر وہ جھوٹ بھی نہیں بولتا۔ نیلی

جھوٹ بھی نہیں۔“ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

”وہ صرف اس سے محبت کرتا ہے۔“

”کس سے؟“

”وہ جس سے وہ شعر کی زبان میں باتیں کرتا ہے۔ تم نے۔۔۔ تم نے کبھی اس کی

تحریر پڑھی۔ دیکھا غور کیا کتنی تڑپ ہے اس کے لہجے میں وہ کتنی وارفتگی سے اسے پکارتا

ہے، بلاتا ہے۔“

”وہ شاعر ہے گیتو۔“

”مگر وہ سچ بولتا ہے۔ وہ روایتی شاعر نہیں ہے نیلی۔ اس کا کرب اس کی اپنی ذات کا

کرب ہے۔ اس کی شاعری میں جھجھک جانے کا دکھ سجا ہے۔“

”پھر بھی گیتو وہ تم سے محبت کرتا ہے، تم اس کی بیوی ہو۔ تم نے کئی بار ہم سب

کے سامنے اس کی انسلٹ کی ہے لیکن اس نے کبھی تم سے اونچی آواز میں بات نہیں کی

ہمیشہ سر جھکا رہتا ہے۔“

”اور تم اسے محبت کہتی ہو۔“

وہ ہنسی۔ وہی ہڈیانی سی ہنسی۔

”یہ محبت نہیں ہے۔ یہ محض جذبہ سپاس ہے۔ وہ میری ہر بات پر سر جھکا دیتا ہے کیونکہ میں اسکی کفالت کرتی ہوں وہ مجھ سے محبت نہیں کرتا نیلی۔ وہ مجھ سے محبت نہیں کرتا۔ وہ صرف میرا ممنون ہے۔“

وہ رو رہی تھی۔

”وہ کہتا ہے I am alone in this world of Pain لیکن وہ اکیلا نہیں ہے نیلی۔ اکیلی تو میں ہوں۔ اس کے پاس تو اس کی یادیں ہیں۔ اس کا ماضی ہے میرے پاس کیا ہے۔ Nothing کچھ نہیں۔ کچھ نہیں۔ میں اکیلی ہوں۔ تنہا ہوں۔“ اس کی آواز لمحہ بہ لمحہ اونچی ہوتی گئی۔

”ہاں میں اکیلی ہوں۔“ وہ چیخنے لگی مٹھیاں بھیجنے بھیجنے کر اس کے چہرے سے وحشت برس رہی تھی۔

نیلی نے اسے چیخنے اور رونے دیا۔ بڑی دیر بعد وہ سنبھلی تو نیلی اسے سونے کی تلقین کر کے باہر نکل آئی۔

اقتدار باہر ٹہل رہا تھا۔ قلم اس کے ہاتھ میں تھا غالباً وہ اس کے چیخنے کی آواز سن کر باہر نکلا تھا۔ لیکن پھر شاید اس کے بیذروم میں جانے کی ہمت نہیں پڑی تھی۔ نیلی اسے دیکھ کر رک گئی۔

”اے، تم جانتے ہو گیتی بیمار ہے۔“

”ہاں۔“ اس نے آہستگی سے کہا۔

”وہ بہت بیمار ہے۔ ذہنی اور جسمانی دونوں طرح سے تم ماما سے بات کرو اور پھر

اسے کسی اچھے سے ڈاکٹر کے پاس لے جاؤ۔“ اس نے سر ہلادیا۔

مگر ہر گزرتا دن اس کی بیماری اور جنون میں اضافہ کر رہا تھا۔ کبھی کبھی تو وہ بالکل پاگل لگنے لگتی تھی چیزیں اٹھا اٹھا کر پھیلتی، چیختی چلاتی اور پھر خود ہی رونے لگتی۔ شیخ نصیر

الدین ہاسپٹل سے گھر آگئے تھے اور ماما ان کی بیماری کی تھکن اتارنے کے لئے بنگاک چلی گئی تھیں اور جانے سے پہلے انہوں نے بہترین ہاسپٹل میں گیتی کا نام رجسٹر کروایا تھا اسے ڈھیروں ہدایات دی تھیں اور اس کی پیشانی چوم کر آنے والے بچے کی صحت و تندرستی کی دعا دے کر چلی گئی تھیں۔

”آیا ماں کہتی تھیں نیلو کہ مائیں اولاد کے دلوں میں جھانک لیتی ہیں ان کا دکھ ان کے دل میں خود بخود اتر آتا ہے۔ کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہوتی مگر ماما کیسی ماں ہیں کہ میرے دل میں نہیں جھانک سکتیں۔“ ایئر پورٹ سے واپسی پر اس نے پنگی سے کہا۔ آج خلاف معمول وہ بہت بہتر دکھائی دے رہی تھی میک اپ سے بے نیاز چہرے پر ایک چمک اور روشنی سی تھی۔ پہلے پہل ماں بننے کی چمک۔

”ساری بات یہ ہے گیتی کہ تمہاری آیا ماں نے تمہارے ذہن کو منقسم کر دیا ہے تم دو کشتیوں پر پاؤں مت رکھو۔ آخر ہم بھی تو ہیں۔ ہمیں تو کبھی تمہاری طرح تنہائی محسوس نہیں ہوتی۔“

گیتی خاموش ہی رہی۔ گھر پہنچنے تک پھر ان کے درمیان کوئی بات نہ ہوئی۔ جب وہ گھر پہنچے تو اقتدار کہیں جا رہا تھا اس کی سوچ میں ڈوبی ہوئی دلکش آنکھوں میں حزن تھا اور پیشانی پر شکنیں تھیں۔

”تم کہیں جا رہے ہو اے۔“

پنگی نے پوچھا۔

”ہاں۔“

”مت جاؤ۔ گیتی کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔“

”کیا ہوا ہے گیتی کو؟“ اس کی آنکھوں میں اضطراب سا نظر آیا۔

”کچھ نہیں مگر ان دنوں اس کا تنہا رہنا اچھا نہیں ہے۔“

”اچھا۔“ وہ پلٹ آیا۔ پھر تینوں کچھ دیر تک بیٹھے ہلکی پھلکی باتیں کرتے رہے۔
اقتدار کی نگاہیں بار بار گیتی کی طرف اٹھ رہی تھیں۔

”کیا بات ہے اکے۔ آج تمہاری نگاہیں گیتی کے چہرے سے ہٹ نہیں رہی ہیں۔“ بچی ہنسی تو گیتی کا رنگ لمحہ بھر کو بدلا۔ اس نے نگاہیں اٹھا کر اقتدار کی طرف دیکھا جو اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ پھر اس کی نگاہیں جھک گئیں۔ بچی ہنستی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔

”تم ایک دوسرے سے نگاہوں میں باتیں کرو ہم تو چلے۔“

”بیٹھو بچی، چائے پی کر جانا۔“

”نہیں بھئی۔ مجھے ذرا نیلی کی طرف بھی جانا تھا۔“ اس کے جانے کے بعد بہت دیر تک دونوں کے درمیان خاموشی رہی۔ بڑی دیر بعد اقتدار نے پوچھا۔

”ماما کب واپس آئیں گی؟“

”پتا نہیں۔“ وہ ریوور سے نیل پالش صاف کر رہی تھی۔

”گیتی“ تم کب تک ہاسپٹل جاؤ گی؟“

”کیوں؟“

”وہ مجھے ایک مشاعرے میں شرکت کے لئے لندن جانا تھا۔ اور تمہارے ہاسپٹل

کی ڈیٹ قریب قریب ہوں تو میں نہ جاؤں۔“

”نہیں تم میری خاطر مت رکو، یوں بھی میں عادی نہیں ہوں۔ اور پھر یہ تو

تمہارے لئے ایک آنر (Honour) ہے۔“

”اقتدار نے کچھ کہنا چاہا لیکن گیتی نے ٹوک دیا۔

”یہ تو تمہارا خواب ہے، اپنے آپ کو منوانا اور عالمگیر شہرت حاصل کرنا اور اس

کے لئے تم نے اسے چھوڑا۔“

”گیت۔“ وہ نادم سا ہو گیا۔

”کیا ہم اپنے بچے کے لئے سمجھوتا نہیں کر سکتے۔“

”تم کیا چاہتے ہو؟“ گیتی نے پوچھا۔

”میں کیا چاہتا ہوں۔“ وہ کھڑا ہو گیا۔

”میں چاہتا ہوں ہم نارمل لوگوں کی طرح زندگی گزاریں۔“

”تو تم سمجھتے ہو میں نارمل نہیں ہوں؟“ اس کی ذہنی رو بہکنے لگی۔

”نہیں گیتی! میرا یہ مطلب نہیں تھا۔“ وہ گھبرا گیا۔

”میں تمہارا مطلب اچھی طرح سمجھتی ہوں۔ تم۔ تم مجھے نارمل نہیں سمجھتے۔ میں

نارمل نہیں ہوں۔ میں نارمل نہیں ہوں۔“ وہ چیخنے لگی۔

”گیت۔ گیت ہوش کرو۔“ اقتدار نے اس کے ہاتھ تھام لئے مگر گیتی نے اسے دھکادے کر پیچھے ہٹا دیا۔

”مت چھوؤ مجھے۔ مت ہاتھ لگاؤ۔ تم، لالچی، حریص آدمی۔“

”میں لالچی نہیں ہوں گیت۔“ اس کا چہرہ چیخنے لگا۔

”میں لالچی نہیں ہوں۔“

”تم۔“ اس نے انگلی سے اس کی طرف اشارہ کیا اور پھر ہنسنے لگی۔ ہنسنے ہنسنے اس کی

آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اسے پھر دورہ پڑ گیا تھا۔

”کیا تم یہاں آنے سے پہلے کسی سے محبت نہیں کرتے تھے؟“ اقتدار نے سر جھکا لیا۔

”کرتے تھا۔ بولو۔ بولتے کیوں نہیں ہو۔“

”ہاں۔“

پہلی بار اقتدار نے اعتراف کیا۔

”پھر تم نے اسے کیوں چھوڑ دیا؟“

”میں نے اسے کیوں چھوڑ دیا۔“ اس کی نگاہیں خلا میں بھٹکنے لگیں اور ان دیکھی

زنجیریں اسے پیچھے کی طرف کھینچنے لگیں۔

”پتا نہیں۔“ اس نے بے بسی سے گیتی کی طرف دیکھا۔

”حالانکہ تم اس سے محبت کرتے تھے۔“

”ہاں حالانکہ میں اس سے محبت کرتا تھا۔“

”پھر بھی تم نے اسے چھوڑ دیا۔ اس لئے کہ وہ غریب تھی۔۔!“

”نہیں گیت۔“ اس نے تڑپ کر کہا۔

”وہ غریب نہیں تھی۔ اس کا دل تو محبت کا ایک ایسا خزانہ تھا جس کا کوئی مول

نہیں تھا۔“

”مگر محبت کا وہ خزانہ شاید تمہیں یہ شہرت، یہ مقام نہیں دلواسکتا تھا۔ اس لئے تم

نے۔۔“

”ہاں تم ٹھیک کہتی ہو شاید۔“ وہ بہت شکست خوردہ سالگ رہا تھا۔

”میں تمہارا ممنون ہوں گیت کہ تم نے مجھے۔۔“

”مت کہو کچھ۔“ وہ چیخ اٹھی۔

”نہیں چاہئے مجھے یہ تمہارا جذبہ ممنونیت نہیں چاہئے۔“

”گیت۔“ اس نے بڑی ندامت سے اسے دیکھا۔

”میں نے شاید تمہارے دل کو دکھ پہنچایا ہے لیکن میرا یقین کرو گیت کہ اس کے

علاوہ کہ وہ میرے دل میں تھی میں نے تمہارے ساتھ کبھی کوئی بے وفائی نہیں کی اور

میں نے ہمیشہ پورے خلوص سے کوشش کی کہ اسے اپنے دل سے نکال دوں۔ لیکن یہ

میرے اختیار میں نہیں تھا شاید مگر مجھے یقین ہے کہ ہولے ہولے سب ٹھیک ہو جائے

گا۔ آنے والا ہے مجھے یادوں کی اس نگرہ سے باہر لے آئے گا۔“

گیتی نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

اس کی آنکھوں میں اس کے چہرے پر سچ لکھا تھا۔

”میرا اعتبار کرو۔“ گیتی نے ایک گہرہ اور لمبا سانس لے کر نکلنے سے ٹیک لگا کر

آنکھیں موند لیں۔ اقتدار اس کے سامنے بیٹھا اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کے سوتے ہوئے

چہرے کو، زرد رنگت کو اور لمبی پلکوں کو اور اس کے دل میں ایک نیا جذبہ، ایک نیا

احساس پیدا ہو رہا تھا۔ ایک ایسا جذبہ جو اس سے پہلے کبھی اس کے دل میں اس کے لئے

پیدا نہیں ہوا تھا۔



تمام عمر یونہی گرد راہ گزر میں کئی

کوئی پڑاؤ جو آئے تو کچھ ٹھہر جائیں

وہ در وہ لوگ وہ چہرے مجھے بلاتے ہیں

چلو کہ شام ہوئی ہے پلٹ کے گھر جائیں

”بخت!“ مسعود بھائی اسے سارے گھر میں تلاش کرتے پھر رہے تھے۔

”بھئی کہاں ہو؟“ انہوں نے اس کے کمرے میں جھانکا وہ گھٹنوں پر ٹھوڑی رکھے

جانے کیا سوچ رہی تھی۔

”ایک تو تم پتا نہیں جانے کہاں چھپ جاتی ہو۔“

”کہاں جانا ہے۔ میں یہیں تو ہوں۔“ اس نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔

”آپ کب آئے؟“

”کچھ دیر ہوئی۔“ وہ اس کے قریب ہی کرسی کھینچ کر بیٹھ گئے۔

”یہ ہر وقت اپنے کمرے میں گھسی کیا سوچتی رہتی ہو؟“

”میں نے کیا سوچنا ہے مسعود بھائی!“

”کیا سوچنا ہے تم نے۔“ انہوں نے گہری نظروں سے اسے دیکھا۔

”اسی کے متعلق سوچتی ہو گی۔ بھول جاؤ اب اسے۔ نکال دو اس کا خیال ذہن

سے۔ چلا گیا وہ یہاں سے کبھی نہیں آئے گا اب وہ۔“

”وہ آئے گا مسعود بھائی۔“

”ہا۔۔“ وہ اپنے مخصوص انداز میں بنے۔

”بہت بے وقوف ہو تم، بہت احمق ہو۔ اس نے ایک امیر لڑکی سے شادی کی ہے

اور اب ہواؤں میں اڑ رہا ہے۔ آسمانوں پر پرواز کر رہا ہے۔“

”پلیز مسعود بھائی۔“ اس نے ہاتھ اٹھا کر انہیں روکا۔

”میں نے آپ سے کہا ہے مجھ سے اس موضوع پر بات نہ کیا کریں۔“

”اچھا نہیں کرتے۔“ انہوں نے منہ پھاڑ کر جمائی لی۔

”اور بات کرو کوئی اپنے اسکول کی، کیسا جارہا ہے۔“

”سب ٹھیک ہے۔ کو لیگز اچھے ہیں۔ بہت اچھا وقت گزر جاتا ہے۔“ اس نے

اطمینان سے بتایا اور کھڑی ہو گئی۔

”ارے بھئی کہاں چلیں؟“ انہوں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ بخت کی آنکھوں میں

حیرت سی اتر آئی۔ اس نے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔

”سوری۔“ انہوں نے معذرت کی۔

”دراصل میرا مطلب تھا کہ بیٹھو، باتیں کرتے ہیں۔“

”میں چائے لینے جا رہی تھی۔“

”چائے ابھی خالہ نے پلا دی ہے۔ میں پہلے ادھر ہی گیا تھا۔ ان سے مل کر ادھر

آیا ہوں۔“

”اچھا۔“ وہ بیٹھ گئی۔

”تم نے اقتدار کی نئی کتاب دیکھی۔ میں تمہارے لئے لایا تھا۔ ادھر خالو کے کمرے

میں پڑی ہے۔“

”اچھا۔“

وہ اپنے ناخنوں کو دیکھ رہی تھی۔۔

”تم نے کبھی اقتدار کو خط لکھا۔ میرا مطلب ہے اس کی شادی کے بعد۔“

”نہیں۔“

”اس کے ایڈریس کا تو کوئی مسئلہ نہیں ہے اگر تم۔“

”نہیں۔ شکریہ۔“

اس نے ان کی بات کاٹ دی۔

”میں اس کی ضرورت نہیں سمجھتی۔“

”بخت! تم اس طرح اداس اور چپ چپ رہتی ہو۔ تو بہت دکھ ہوتا ہے مجھے دل

چاہتا ہے کہ اس کم بخت کو کان سے پکڑ کر لے آؤں اور تمہارے قدموں میں ڈال دوں

بہت کم ظرف نکلا وہ بہت۔“

”مجھے اس سے کوئی شکوہ نہیں ہے اور آپ۔ آپ نے پھر وہی موضوع شروع کر

دیا۔“

”کیا کروں بخت۔“ وہ اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگے۔

”میرا بس نہیں چلتا میں تمہارے ہونٹوں پر مسکراہٹیں بکھیر دوں۔ میرا دل چاہتا

ہے کہ تم پہلے جیسی ہو جاؤ ویسی ہی لالبا لی۔ اور لا پرواہی جیسے پہلے تھیں۔ مگر جب میں

یہ تمہارا یہ سوکھا ہوا چہرہ، اداس آنکھیں دیکھتا ہوں تو مجھے اقتدار پر غصہ آتا ہے۔ ورنہ

کیا وہ مجھے عزیز نہیں تھا؟ بہت پیارا ہے وہ مجھے۔ بہت عزیز ہے۔“ ان کی آواز بھرا گئی۔

”تمہیں کیا خبر وہ مجھے کتنا یاد آتا ہے۔ کتنا یاد کرتا ہوں میں اسے۔“ ان کی آنکھوں میں آنسو چپکنے لگے۔

”میں جانتی ہوں مسعود بھائی۔“ اس نے آہستگی سے کہا۔

”خوش رہا کرو بخت۔ میں تمہیں خوش دیکھنا چاہتا ہوں۔“

”خوش رہتی ہوں میں۔ مطمئن ہوں اپنی زندگی سے۔“

”نہیں تم خوش نہیں ہو بخت۔ اپنے لئے نہ سہی خالہ جان اور خالو کا ہی خیال کر لو۔“

خالو تمہاری وجہ سے پریشان رہتے ہیں۔“

”میری وجہ سے؟“

”وہاں وہ سمجھتے ہیں کہ اقتدار نے تمہارے ساتھ زیادتی کی ہے اور یہ ان کی غلطی

ہے کہ انہوں نے تمہیں بچپن میں ہی اس سے منسوب کر دیا تھا وہ تم سے اور پھو پھو سے

شرمندہ ہیں۔“

”نہیں نہیں بھلا اس میں ان کا کیا قصور۔ یہ تو نصیب کی بات ہوتی ہے مسعود

بھائی۔ اور مجھے نہیں پتا تھا کہ بابا ایسا سمجھتے ہیں۔“

”وہ ایسا نہ سمجھیں گے تو اور کیا سمجھیں گے۔ تم جو ہر وقت بیس گز منہ لمبا کئے

پھرتی ہو اور تمہارے چوکھٹے پر ہر وقت خزاں چھائی رہتی ہے۔“

”ہا۔“ وہ اپنی ہی بات پر خوش ہو کر زور سے ہنسنے لگا۔

”میں آئندہ خیال رکھوں گی مسعود بھائی۔“ وہ سنجیدہ تھی۔

”تمہیں خیال رکھنا بھی چاہئے بخت۔ دنیا صرف اقتدار پر ختم نہیں ہو گئی ہے۔ دنیا

میں اور بھی بہت اچھے اچھے لوگ ہیں۔“ انہوں نے کن اکھیوں سے اسے دیکھا۔ وہ کتنی

بے تحاشا خوبصورت تھی۔ اس کی لابی پلکیں۔ اس کے شکرنگری ہونٹ، دلکش قامت،

گلابی رنگت اور پھر ان بیٹے سالوں میں وہ بہت باوقار اور سوبر ہو گئی تھی۔ وہ بات بے

بات ہنسنا، لڑنا، جھگڑنا، رونا سب ختم ہو گیا تھا۔ کیا ہی اچھا ہو اگر۔ اگر۔

انہوں نے ہونٹوں پر زبان پھیری۔

”ہاں تو بخت بی بی۔ دنیا میں بہت اچھے اچھے لوگ ہیں اور خالو چاہتے ہیں کہ تم۔“

”اور آپ کو کیا پتا مسعود بھائی کہ میری دنیا اقتدار پر ختم ہو گئی ہے۔“ اس نے

دلگرفتگی سے سوچا۔ اور مجھے تو اس کا انتظار کرنا ہے زیست کے آخری لمحے تک۔ اس

نے کہا تھا کہ میں منتظر رہوں۔ وہ لوٹ کر ضرور آئے گا اور یہ کہ زندگی کے تپتے صحرا

میں دھوپ کی تمازتوں سے بچنے کے لئے اگر کوئی کہیں کسی شجر سایہ دار تلے بیٹھ جائے

تو یہ محض ایک پڑاؤ ہے نامنزل نہیں۔ آدمی کتنا بھی آرام کر لے بالآخر تو اسے منزل پر

پہنچنا ہی ہے۔“

”کیا سوچ رہی ہو؟“

”کچھ نہیں۔“ وہ چونک کر کھڑی ہو گئی۔

”آپ آرام کریں مسعود بھائی۔ میں ذرا رات کے کھانے کے لئے اماں کی ہیلپ

کروں گی۔“

انہوں نے سر ہلا کر سالہ اٹھالیا۔



وہ بہت پریشان تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ بابا کو کیا جواب دے

مسعود بھائی نے اسے پرہیز کیا تھا اور بابا چاہتے تھے کہ وہ اس پرہیز کو قبول کر لے

لیکن وہ اس کے لئے تیار نہ تھی۔ کیا ہوا تھا جو اقتدار نے شادی کر لی تھی۔

یہ تو محض ایک پڑاؤ تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اسے پلٹ کر آنا ہے لیکن کب؟ یہ اسے

علم نہیں تھا۔ اور بابا اس بات کو نہیں جانتے تھے اور سمجھتے بھی نہیں تھے۔

انہیں تو صرف یہ غم تھا کہ اقتدار نے اسے دکھ پہنچایا ہے۔ اس کے نازک دل کو

ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے اور وہ اس دکھ کا ازالہ کرنا چاہتے تھے۔ انہیں اس بات کا شدت سے احساس تھا کہ انہوں نے بچپن میں ہی اسے اقتدار سے منسوب کر کے بہت بڑی غلطی کی تھی اور اب اس غلطی کا کفارہ اس طرح ہو سکتا تھا کہ وہ مسعود کا پروپوزل قبول کر لیں۔ مسعود اچھا لڑکا تھا اچھی پوسٹ پر تھا۔ اکیلا تھا اور وہ سمجھتے تھے کہ بخت اس کے ساتھ خوش رہے گی۔ لیکن بخت جانتی تھی کہ وہ مسعود بھائی کیا کسی کے ساتھ بھی خوش نہیں رہ سکتی۔

اس کے لئے خوشی کیا تھی اس کا مفہوم وہ بابا کو نہیں سمجھا سکتی تھی۔ وہ تو خوش تھی کہ اقتدار وہ سب کچھ پارہا تھا جس کی اس نے تمنا کی تھی۔ جو چاہا تھا۔ جو مانگا تھا۔ اس سے بچھڑ جانے کا دکھ اپنی جگہ پر بہت شدید اور گہرا تھا۔ بارہا اس کا دل اسے ایک نظر دیکھنے کو تڑپا تھا لیکن اس نے اپنے دل پر صبر کی سل رکھ لی تھی اور بڑے حوصلے اور صبر کے ساتھ اس دکھ کو برداشت کر رہی تھی۔ وہ بابا کو نہیں سمجھا سکتی تھی کہ وہ کیا سوچتی ہے۔ اس لئے اس نے مسعود بھائی سے بات کی۔

اس روز وہ بہت سنجیدہ لگ رہے تھے اور ان کی آنکھوں میں ہر وقت نظر آنے والی وہ عجیب سی چمک بھی نہیں تھی۔ انہوں نے اس کی ساری بات بڑی توجہ سے سنی تھی۔ ”دیکھو بخت بابا جو کہتے ہیں تمہاری بہتری کے لئے ہی۔ اقتدار اب پلٹ کر نہیں آئے گا بخت۔ اس کا انتظار فضول ہے۔ زندگی کا سفر بہت طویل ہے۔ اکیلے کیسے طے کرو گی۔ میں نہیں کہتا بخت کہ تم میرے حق میں فیصلہ دو۔ وہ کوئی بھی ہو بخت لیکن تمہیں جلد از جلد فیصلہ کر لینا چاہئے۔“

”مسعود بھائی آپ جانتے ہیں میرے لئے یہ سب ناممکن ہے۔“

”کچھ بھی ناممکن نہیں ہوتا بخت۔ ہولے ہولے سب ٹھیک ہو جائے گا۔ آج نہیں تو کل ایک دن ایسا تمہاری زندگی میں ضرور آئے گا جب تم اسے بھول جاؤ گی۔“

”میں اسے بھولنا نہیں چاہتی مسعود بھائی اور مجھے اس سے کوئی گلہ بھی نہیں ہے۔“

”مگر اس نے تو تمہیں بھلا دیا ہے۔“

”شاید نہیں۔“ وہ کھوئی کھوئی سی تھی۔

”پتا نہیں کیوں مجھے یقین ہے مسعود بھائی کہ وہ مجھے نہیں بھولا۔ وہ مجھے نہیں بھول سکتا۔“

”تم بہت سادہ دل ہو بخت۔ وہ ایک شادی شدہ آدمی ہے اور اس کی بیوی صرف اس کی بیوی ہی نہیں بلکہ وہ ایک ایسی لڑکی ہے جس نے اسے وہ سب کچھ دیا ہے جس کی اسے تمنا تھی۔ یہ شہرت، یہ مقام یہ نام کیا تم سمجھتی ہو کہ اسے یوں ہی مل گیا ہے اور کیا وہ ایسی بیوی کو چھوڑ سکتا ہے۔ جس کے ہاتھ میں اس کا حال اور مستقبل ہے۔“

”میں یہ تو نہیں چاہتی مسعود بھائی کہ وہ اسے چھوڑ دے آخر اس نے بھی اسے چاہا ہو گا۔ میں تو محبت کرنے والوں کی قدر کرتی ہوں۔ میرے دل میں تو اس کے لئے بھی محبت ہے کہ اسے اقتدار نے پسند کیا ہے۔ وہ کوئی معمولی ہستی تو نہیں ہو گی نا۔“

”تم بہت عجیب ہو بخت۔“ مسعود بھائی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ آج خلاف معمول وہ اپنا مخصوص قہقہہ بھی نہیں لگا رہے تھے۔

”شاید دنیا میں تم ایسے بہت کم لوگ ہوں گے۔ جو لوگ محبت کرنے کا ہنر جانتے ہیں مسعود بھائی وہ سب ایسے ہی ہوتے ہیں۔ سچی اور بے لوث محبت کرنے والے سودو زیاں سے بے نیاز ہوتے ہیں۔“

”میں شاید تمہارے قابل نہیں ہوں بخت۔ مگر۔“ وہ کھڑے ہو گئے۔

”کوئی اور شخص شاید مجھ سے بہتر تمہیں وہ سب کچھ دے سکے جو اقتدار نہیں دے سکا۔ میں بابا سے کہوں گا کہ وہ تمہارے لئے۔“

”نہیں مسعود بھائی آپ میری بات نہیں سمجھے۔ آپ۔“ اس کی نگاہیں جھک گئیں۔

”آپ بہت اچھے ہیں مسعود بھائی۔ مگر آپ نہیں جانتے کہ میرے دل پر کیا گزرتی ہے اور میں اپنے آپ کو کتنا بے بس پاتی ہوں۔ کوئی شخص خواہ کتنا ہی اچھا کیوں نہ ہو وہ اقتدار نہیں ہو سکتا مسعود بھائی۔ میں وہ سب کچھ آپ سے نہیں کہہ سکتی جو میں سوچتی ہوں اور محسوس کرتی ہوں۔ پھر بھی میرا آپ سے وعدہ ہے کہ اگر زندگی میں کبھی میں نے کسی کے ساتھ کی ضرورت محسوس کی تو وہ آپ ہی ہوں گے۔“

”بخت۔“

مسعود بھائی کی آواز میں رقت پیدا ہو گئی۔

”میں بہت چھوٹا تھا جب یکے بعد دیگرے ماں باپ کا انتقال ہو گیا۔ کبھی کبھی میں ادھر خالہ کے گھر میں آتا تو میرے اندر سکون سا اتر آتا۔ خالہ جان، خالو جان اور پھر اقتدار، ان سب کی محبتوں میں میں اپنی تنہائی کا غم بھول جاتا میں اس زندگی کا عادی ہو گیا تھا اور مجھے کبھی احساس نہیں ہوا تھا کہ میرا بھی ایک گھر ہو، بیوی ہو۔ بچے ہوں۔ پھر اقتدار چلا گیا اور میں، خالہ اور خالو جان اور تمہارے دکھ کے خیال سے یہاں زیادہ آنے لگا۔ اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جب میں واپس جاتا تو اپنے گھر کی دیواروں میں میرا دم گھٹنے لگتا اور تنہائی مجھے کاٹ کھانے کو دوڑتی۔ تب خالو جان نے مجھ سے تمہارے بارے میں بات کی اور میں جس نے کبھی اس انداز میں نہیں سوچا تھا خواب دیکھنے لگا۔ ایک گھر کے خواب۔“

”مسعود بھائی۔“

وہ نادام سی ہو گئی۔

”مسعود بھائی پلیز آپ کسی بھی اچھی سی لڑکی سے شادی کر لیں۔ کئی لڑکیاں ہیں میری نظر میں اور مجھے یقین ہے کہ کوئی بھی لڑکی آپ کی شریک حیات بن کر بہت خوش رہے گی۔“

”یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو جب کہ تم نے جو مجھے بہت اچھی طرح جانتی ہو۔ ٹھکرا دیا ہے تو ایک اجنبی لڑکی۔“

”میں نے آپ کو ٹھکرایا نہیں ہے مسعود بھائی۔ میں آپ کو کس طرح سمجھاؤں۔“ اس نے بے بسی سے ہاتھ ملے۔

”کاش آپ نے کبھی کسی سے محبت کی ہوتی۔ کسی کو چاہا ہو تا جس طرح چاہے جانے کا حق ہے۔ کاش!“

”جانتا ہوں۔ جانتا ہوں بخت۔“ انہوں نے اس کی بات کاٹ دی۔

”اسی لئے تو تمہارا انتظار کروں گا اس وقت تک جب تک تم اپنے دل سے اس کے خیال کو نکال نہ دو۔ تم نے خود کہا ہے ناکہ اگر تمہیں کسی کے ساتھ کی ضرورت محسوس ہوئی تو تم مجھے۔“

”ہاں۔“ اس نے انہیں بات مکمل نہ کرنے دی۔

”مگر پلیز مسعود بھائی آپ میرے لئے اپنی زندگی برباد نہ کریں۔ آپ کو کسی رفاقت کی ضرورت ہے۔ آپ نے زندگی کا اتنا لمبا سفر تنہا کاٹا ہے۔ میں آپ کے کرب کو سمجھتی ہوں۔ میں۔ ممکن ہے میں کبھی بھی اپنے آپ کو اس کے لئے تیار نہ کر سکوں اور آپ کا انتظار رائیگاں جائے۔“

”یہ میرا مسئلہ ہے بخت۔“ بڑی دیر بعد وہ اپنے مخصوص انداز میں ہنسنے لگی۔ وہی اونچا گونجدار قہقہہ۔

”اور مجھے یقین ہے کہ بہت جلد تم تھک جاؤ گی۔ اتنی نازک سی تو ہو۔ اور زندگی کا سفر بہت کٹھن ہوتا ہے۔“ انہوں نے سوچا اور ان کی آنکھوں میں وہی عجیب سی چمک لوٹ آئی اور انہوں نے گہری نظروں سے اس کا جائزہ لیا اور کھڑے ہو گئے۔

”میں بابا سے بات کرتا ہوں۔“

مگر بابا نے ان کی بات ماننے سے انکار کر دیا۔

”وہ بے وقوف ہے۔ اپنا برا بھلا نہیں سمجھ رہی ہے مگر ہم تو بے وقوف نہیں ہیں۔ میں اپنے ایک غلط فیصلے کی سزا سے نہیں دینا چاہتا مسعود میاں۔“

”مگر وہ ابھی ذہنی طور پر تیار نہیں ہے بابا۔ اگر زبردستی کی گئی تو شاید وہ خوش نہ رہ سکے۔“

”میں خود اس سے بات کروں گا۔ سمجھاؤں گا اسے۔“ وہ بہت مضطرب، بہت بے چین تھے۔

”تمہیں نہیں خبر مسعود میاں کہ اقتدار کا دکھ اندر ہی اندر مجھے دیمک کی طرح چاٹ رہا ہے۔ ہم تو گھن کھائی ہوئی لکڑی کی طرح ہیں میاں۔ جانے کب۔ جانے کب گر جائیں میں اسے یوں بے سہارا نہیں چھوڑنا چاہتا۔ میں چاہتا ہوں آنکھیں بند کرنے سے پہلے اس کا ہاتھ کسی مضبوط ہاتھ میں دے دوں۔ اور مجھے یقین ہے کہ تم اس کے لئے مضبوط سہارا ثابت ہو گے۔“

وہ اٹھ کر ٹہلنے لگے۔

”میں تمہیں کس طرح سمجھاؤں کہ میں آپ سے نظر نہیں ملا سکتا۔ ان کی آنکھوں کا حزن۔ ان کے چہرے کا لال میرے دل میں دراڑیں ڈالتا ہے۔ میرا غم دو چند ہو جاتا ہے کیا سوچتی ہوں گی وہ کتنے مان سے میں انہیں گھر لایا تھا۔ کتنے یقین سے میں نے انہیں کہا تھا کہ بخت میری بیٹی ہے۔ مگر۔۔۔“

”اس سب میں بھلا آپ کا کیا قصور بابا؟“

”کاش اقتدار ایک بار مجھے ملتا تو میں اس سے پوچھتا کہ جب میں اس کے نام کی انگوٹھی بخت کو پہناتا تھا تو اس وقت اس نے میرا ہاتھ کیوں نہ پکڑا۔ جب میں اس کی پھوپھو سے اس کی بیٹی مانگ رہا تھا تو اس وقت اس نے میری زبان بند کیوں نہ کر دی

کیوں نہ کہا کہ اس کی آنکھیں اور طرح کے خواب دیکھتی ہیں۔ اس کے دل میں دولت کی ہوس اور لالچ ہے اور وہ دولت کی خاطر سارے رشتے توڑ سکتا ہے۔“

ان کا چہرہ سرخ پڑ گیا تھا اور آواز اونچی ہو گئی تھی۔

”پلیز بابا۔“ مسعود نے ان کا ہاتھ تھام کر انہیں ریلیکس ہونے کو کہا۔ کافی دیر بعد وہ سنہلے تو اٹھ کر بخت کی طرف چلے گئے۔ بخت اسی طرح بیٹھی تھی جس طرح مسعود اسے چھوڑ کر گیا تھا۔ دائیں ہاتھ کی ہتھیلی پر ٹھوڑی ٹیکے وہ سوچ میں اس طرح گم تھی کہ اسے بابا کے آنے کی خبر تک نہ ہوئی، بالآخر بھرا سے دیکھتے رہے۔ اس کے چہرے کے گلاب کلا گئے تھے اور آنکھوں کے دیئے بجھ گئے تھے۔ کیسے اس کی آنکھیں ہر وقت ہنستی رہتی تھیں اور ہونٹ گیلے رہتے تھے۔ رخساروں پر شفق ڈوبتی ابھرتی رہتی۔ وہ ہولے ہولے چلتے ہوئے اس کے قریب آکر بیٹھ گئے۔

”بابا۔ آپ۔۔۔!“ بخت نے سراٹھا کر قدرے حیرت سے انہیں دیکھا۔

”میری بچی۔“ انہوں نے اس کی پیشانی چوم کر اس کا سر اپنے سینے سے لگالیا۔

”مجھے معاف کر دینا میری بچی۔“

”بابا۔ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟“ بخت نے تڑپ کر انہیں دیکھا۔

”میں خود کو تمہارا مجرم سمجھتا ہوں، اس لئے کہ وہ بکثرت میرا بیٹا ہے۔ کاش وہ پیدا ہی نہ ہوتا۔“

”بابا پلیز آپ اس طرح کی بات نہ کریں اور میں تو خوش ہوں۔ مجھے کوئی دکھ نہیں ہے اقتدار کوئی غیر تو نہیں ہے۔ ہمارا اپنا ہے ہمیں اس کی خوشی میں خوش ہونا چاہئے اور آپ اسے معاف کر دیں بابا پلیز۔“

”تو تو بہت اچھی ہے میری بیٹی۔“ انہوں نے پھر اس کا سر اپنے سینے سے لگالیا۔

”اور وہ واقعی تیرے قابل نہ تھا۔ مسعود بہت اچھا لڑکا ہے۔ محبت کرنے والا اور

مخلص۔ تو اس کے ساتھ بہت خوش رہے گی مجھے یقین ہے۔“

”مگر بابا۔“ اس نے تڑپ کر انہیں دیکھا۔

”میرے دل پر بہت بوجھ ہے بخت بیٹی، اس بوجھ کو ہلکا کر دو۔ میری بات مان لو۔ اقتدار نے میرے سینے میں شگاف ڈال دیا ہے۔ تمہاری ہاں میرے زخم پر مرہم رکھ دے گی مجھے اس دکھ کے بھورے نکال لو بیٹی۔“

”بابا۔“ وہ ان کے سینے سے لگی روتی رہی۔ انہوں نے کہنے کے لئے کچھ نہیں چھوڑا تھا۔ اس کا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو رہا تھا اور جیسے کوئی اس کے وجود کو منقسم کر رہا ہو۔

بابا اسے تسلی دے رہے تھے لیکن وہ تو جیسے کچھ نہیں سن رہی تھی۔ اس کا ذہن اس کا جسم سب جیسے برف کے ٹکڑے میں تبدیل ہو رہے تھے۔ بابا اسے تسلی دے کر چلے گئے تھے مگر اسے یوں لگ رہا تھا جیسے اس کے جیتے جاگتے وجود کو سولی پر چڑھایا جا رہا ہو۔ یہ سب کس قدر مشکل اور ناممکن تھا۔ مگر اسے بابا کے لئے ان کی خوشی کی خاطر، ان کا بوجھ ہلکا کرنے کے لئے اس سولی پر چڑھنا تھا مگر یہ کس قدر اذیت ناک اور تکلیف دہ تھا۔ کاش فیصلہ کرنے کا اختیار اس کے ہاتھ میں ہوتا۔

وہ اتنی بے بس، اتنی مجبور، اتنی بے اختیار نہ ہوتی۔ کاش! بابا نے اس طرح اسے آزمائش میں نہ ڈالا ہوتا۔ اقتدار نے ان کے دل کو چیر ڈالا تھا۔ اب وہ انکار کر کے انہیں مزید دکھ نہیں پہنچا سکتی تھی۔

آنسو اس کی آنکھوں میں اکٹھے ہونے لگے۔ وہ کبھی نہیں روئی تھی، اقتدار نے کہا تھا۔ ”رونا نہیں کہ تمہارے آنسوؤں سے میرے اور تمہارے درمیان نمکین جھیلیں بن جائیں گی اور میں ان نمکین جھیلوں کو عبور نہ کر پاؤں گا۔“ مگر آج آنسو بے اختیار ہو رہے تھے۔

”یہ آنسو میں تمہاری جدائی میں نہیں بہا رہی اقتدار یہ تو مجبوری کے آنسو ہیں۔“

اپنے بے اختیار ہونے کے، اپنے بے بس ہونے کے۔ یہ آنسو تمہاری راہ میں حائل نہیں ہوں گے۔ اور اگر تم کبھی آنا چاہو تو لوٹ آنا۔ پلٹ آنا اقتدار۔ میں ہر موڑ پر تمہیں منتظر ملوں گی۔ یوں سمجھ لینا کہ دھوپ کی تمناؤں سے گھبرا کر میں بھی ذرا دیر کو کسی شجر سایہ دار تلے بیٹھ گئی تھی۔ اگرچہ میں نے ایسا دل سے نہیں چاہا اور نہ ہی خواہش کی ہے۔“ وہ دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر رونے لگی۔

زندگی بے حد مشکل اور ادکھی ہو گئی تھی۔ گھر میں اس کی شادی کی باتیں ہو رہی تھیں اور وہ بہت بے چین، بہت بے کل تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کیا کرے۔ کہاں جائے، کیسے محبت و شفقت کی ان زنجیروں کو کاٹ ڈالے جنہوں نے اسے بے اختیار اور بے بس کر ڈالا تھا۔ یہ بد دینا تھی۔ خیانت تھی۔

وہ دل میں اقتدار کی محبت کو بسا کر کس طرح مسعود کے ساتھ زندگی بسر کرتی۔ اس نے ان کے بارے میں ایسا کبھی نہیں سوچا تھا۔ کبھی نہیں اور یہ کوئی ایک لمحے کی بات تو نہ تھی۔ عمر بھر کا روگ تھا، لمحے لمحے کی موت تھی۔

کئی بار اس نے ہمت کی کہ بابا سے جا کر صاف صاف کہہ دے کہ وہ ان کی بات نہیں مان سکتی۔ مگر ہر بار ان کے دروازے کے پاس سے جا کر پلٹ آئی۔ ان کا وہ کرب سے چٹخا ہوا چہرہ۔ ان کے لہجے کا سوز۔ ان کی آنکھوں کے آنسو۔ اس کے راستے میں حائل ہو جاتے کوئی راہ بھائی نہیں دیتی تھی۔ شاید میں اندھی ہو گئی ہوں اور میری سوچ مفقود ہو گئی ہے۔

اس روز اسٹاف روم میں بیٹھے بیٹھے اس نے سوچا۔

”میرے آگے پیچھے تمام راستے بند ہو گئے ہیں نہ کوئی راستہ مجھے اقتدار کی طرف لے کر جاتا ہے اور نہ کوئی راستہ اسے میری طرف لاتا ہے۔ شاید ہمارا ساتھ زندگی کے کسی موڑ پر ممکن نہ تھا۔ میں تمہارا بخت نہ تھی اور تم میرا مقدر نہ تھے۔“ اس نے زیر

لب کہا اور قلم میز پر رکھ دیا۔ لفظ آنکھوں کے سامنے گڈمڈ ہو رہے تھے۔ اس نے زور سے آنکھوں کو رگڑا۔

لڑکیاں کتنی بار اپنی کاپیوں کے متعلق پوچھ چکی تھیں اور وہ ان تین دنوں میں ایک کاپی بھی چیک نہ کر سکی تھی۔

”خدایا“ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔ ”کیا میرے لئے کوئی راستہ نہیں رہا۔“

رہا! کوئی راستہ۔ کوئی راہ نجات۔ اس نے چاروں طرف اور اس طرح دیکھا جیسے کوئی راستہ تلاش کر رہی ہو۔

”اور اب میں روؤں گی اقتدار۔“ اس نے اپنے نچلے ہونٹ کو دانتوں تلے دبایا۔ ”اتنا کہ میرے اور تمہارے درمیان نمکین پانیوں کی جھیلیں حائل ہو جائیں، اور تم چاہو بھی تو ان جھیلوں کو عبور نہ کر سکو کہ میں تمہاری ان خوبصورت آنکھوں میں شکوے کے رنگ اترتے نہیں دیکھ سکتی۔“

”ہاں میں۔“

”حد ہو گئی۔ ایک تو یہاں کوئی کسی کی بات نہیں سنتا اور میڈم تو بس۔“ مسز نور شور چپاتی ہوئی اندر داخل ہوئیں تو اس نے بے اختیار اُٹھنے والے آنسوؤں کو بمشکل روکا۔ ”کیا بات ہے مسز نور؟“

”کیا بتاؤں بخت ایک تو ٹرانسفر ہو گیا۔ دوسرا وہ بھی اتنے دور دراز پہاڑی علاقے میں۔ تم ہی بتاؤ میاں میرے باہر، چھوٹا سا بچہ، میں کس طرح اکیلی وہاں رہوں گی۔ سو طرح کے مسائل ہوتے ہیں۔“ وہ دھپ سے کرسی پر گر پڑیں۔

”میڈم سے میں نے کہا وہ ذرا ڈی۔ ای۔ او صاحبہ سے بات کریں۔ میرے پرائمر بتائیں۔ میری ساس ہیں بوڑھی ہیں۔ نظر ٹھیک سے انہیں آتا نہیں۔ انہیں کس کے

سہارے پر چھوڑ کر جاؤں۔ مگر میڈم کہتی ہیں کہ وہاں کے لوگوں کو بھی تو حق ہے کہ وہ اپنے بچوں کو تعلیم دلوائیں۔ دو سال سے وہ اسکول صرف ایک ٹیچر کے سہارے چل رہا ہے۔ کسی نے تو جانتا ہی ہے مگر وہ کسی میں ہی کیوں۔ اتنے بہت سے ٹیچر ہیں مگر۔“

”آپ نے ڈی، او صاحبہ سے بات کی؟“

”وہ کہاں سنتی ہیں کسی کی، عجب دماغ ہے ان کا۔“

”اگر آپ کی جگہ کوئی اور رضاکارانہ طور پر وہاں جانے کے لئے تیار ہو جائے تو۔“ بخت کے اندر روشنی کی ایک کرن سی اتری تھی۔ وہ چلی جائے وہاں اس دور دراز پہاڑی علاقے میں۔ مسعود بھائی سے اور بابا کی التجا کرتی نظروں سے دور۔

”پھر شاید ممکن ہے ڈی۔ او۔ صاحبہ میری مجبوریوں کو سمجھ لیں۔ مگر کون جاتا ہے بخت وہاں اتنے دور۔“ وہ افسردہ ہو گئیں۔ ”میں ریزائن دے دوں گی۔“ اس نے قلم اٹھا لیا اور کاپی کھول لی۔ لیکن دل ہی دل میں وہ اپنے فیصلے کو تول رہی تھی۔ پرکھ رہی تھی۔ ”ہاں یہ ممکن ہے۔“

وہ بابا کو منالے گی کہ اس کا جانا ضروری ہے۔ یہ ٹرانسفر کسی طور رک نہیں سکتا البتہ شادی میں کچھ تاخیر کر دی جائے جب تک وہ پلٹ نہ آئے۔ اور پھر کس نے پلٹ کر آنا ہے وہ وہاں خوش رہے گی۔ وہ جوں جوں سوچتی گئی اتنا ہی اس کا فیصلہ پختہ ہو تا گیا۔ ڈی او نے مسز نور کی جگہ اس کا ٹرانسفر کر دیا تھا مسز نور اس کی بے حد ممنون تھیں۔ بابا نے بڑے دھیان سے اس کی بات سنی تھی اور پھر جانے کیا سوچ کر اس کی بات مان لی تھی۔

”لیکن بیٹی اگر تم نے واپس آنے میں بہت دیر کر دی تو کہیں مسعود۔۔۔“

”میں جلد آ جاؤں گی بابا۔“ اس نے انہیں تسلی دی۔ بابا کی نگاہیں اس کے چہرے پر تھیں جو ان چند دنوں میں اور بھی زرد ہو گیا تھا۔ انہیں افسوس ہوا کہ انہوں نے شاید جلدی کی تھی۔ اتنی جلدی وہ بھلا اقتدار کو بھلا سکتی تھی۔ چلو اچھا ہے۔ کچھ وقت

مل جائے گا تو سنبھل جائے گی۔

”اقتدار میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گا۔ تم نے میری نازک دل بٹی کا دل دکھایا ہے۔“ انہوں نے اس کی پیشانی چوم کر اسے جانے کی اجازت دے دی۔
”تم نے یہ ٹرانسفر خود کروایا ہے؟“ مسعود نے سنا تو غصہ ان کی آنکھوں میں بل کھانے لگا۔

”مجھے کیا ضرورت تھی۔“ بخت نے نظریں چرائیں۔

”ضرورت۔“ وہ طنز سے ہنسنے۔

”جس شخص کے لئے تم یہ جوگ لے رہی ہو بخت اس نے تو کبھی بھول کر بھی تمہیں یاد نہیں کیا ہوگا۔ قیمتی گاڑیوں میں بیٹھنے والے اور ریشم کے گدیلوں پر سونے والے سخت اور کھردری زمینوں کے خواب نہیں دیکھتے بخت بیگم۔ وہ پلٹ کر آئے گا یہ خیال تم اپنے دل سے نکال دو۔ میں تمہیں وہاں جانے کی اجازت نہیں دوں گا۔“
”آپ کون ہوتے ہیں مجھے اجازت دینے والے؟ غصے سے اس کے ہونٹ بل کھا کر رہ گئے۔

”میں۔“ وہ بڑی مکاری سے ہنسنے۔

”میں کون ہوں بخت۔ یہ تم بابا سے پوچھو جنہوں نے تمہارے تمام اختیارات میرے ہاتھ میں دے دیئے ہیں۔“

”مسعود بھائی آپ۔“

”نہیں۔“ انہوں نے اس کی بات کاٹ دی۔

”اب صرف مسعود۔“

”اوہ۔“ غصہ اس کے اندر ہی اندر بل کھانے لگا۔ مگر وہ ضبط کئے ہونٹ بھیجنے کھڑی رہی۔

”تم نہیں جاؤ گی۔ ٹرانسفر کو ان کے بہت سے طریقے ہیں۔ میں تمہارا ٹرانسفر رکوالوں گا۔“

”مجھے جانا ہے۔“ وہ اپنے کمرے کی طرف جانے کے لئے پلٹی۔ اس وقت وہ دونوں کمرے میں کھڑے تھے مگر مسعود نے ہاتھ بڑھا کر اسے روک لیا۔
”تم نہیں جاؤ گی، بخت اور میں پاپا سے کہوں گا کہ ایک ماہ کے اندر اندر تمہیں رخصت کر دیں۔“

”آپ مجھے نہیں روک سکتے مسعود بھائی۔“ اس نے ان کا ہاتھ جھٹک دیا۔ غصے سے لفظ اس کے اندر ہی گڈمڈ ہو رہے تھے۔

”میں“ ان کی آنکھیں شعلے برسانے لگیں۔

”تم مجھے کیا سمجھتی ہو۔“ ان کے لہجے میں سختی تھی اور آنکھوں میں تیز چمک۔
”میں نے تمہارے لئے ایک طویل جنگ لڑی ہے اور تم کیا سمجھتی ہو کہ میں آسانی سے تم سے دستبردار ہو جاؤں گا ہرگز نہیں۔ اقتدار کو بھول جاؤ بخت۔ میں اسے کبھی تم تک نہیں پہنچنے دوں گا“ وہ حیرت سے آنکھیں پھاڑا نہیں دیکھ رہی تھی۔ یہ آج مسعود بھائی کو کیا ہو گیا ہے۔ اس سے پہلے تو انہوں نے اس طرح کبھی بات نہیں کی تھی اور اسے حیرت سے اپنی طرف تکتے پا کر شاید انہیں بھی اپنے لہجے کی سنگینی کا احساس ہو گیا تھا کہ فوراً ہی ان کے چہرے کے تاثرات بدل گئے اور لہجے میں وہی خوشامدانہ رنگ اتر آیا۔

”دراصل میں۔“ انہوں نے کان کھجایا۔

”میں یہ سب نہیں کہنا چاہتا تھا۔ لیکن غصے میں مجھے کچھ پتا ہی نہ چلا۔ وہ لوگ جنہیں ہم اپنا سمجھتے ہیں غصہ بھی تو ہمیں انہیں پر آتا ہے۔ دیکھو ناب تمہارا تحفظ میں اپنی ذمہ داری سمجھتا ہوں اور میں یہ ہرگز نہیں چاہوں گا کہ تم ایک اجنبی علاقے میں

جسے تم نے دیکھا تک نہیں جاؤ۔“

”میں اپنا تحفظ خود کر سکتی ہوں مسعود بھائی۔“ اس نے بے حد تلخی سے کہا اور تیز تیز قدموں سے چلتی اپنے کمرے کی طرف مڑ گئی۔ اپنے کمرے میں آکر بہت دیر تک وہ مسعود بھائی کے الفاظ پر غور کرتی رہی۔ آخر مسعود بھائی نے یہ کیوں کہا تھا کہ انہوں نے اس کے لئے ایک طویل جنگ لڑی ہے اور یہ کہ وہ اس سے دستبردار نہیں ہوں گے۔ جوں جوں وہ سوچتی گئی اس کا ذہن الجھتا گیا۔ مسعود بھائی کا کردار اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا بہر حال جو کچھ بھی ہے تھک کر اس نے سوچا۔

”مسعود بھائی قابل اعتبار ہر گز نہیں ہیں اور یہ کہ اسے مسعود بھائی سے ہر گز شادی نہیں کرنا ہے اور وہ وہاں جا کر بابا کو لکھ دے گی کہ اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے اور اس کی خوشی اسی میں ہے اور اس نے یہی کیا بھی۔۔۔ بابا نے اس کے خط پر کوئی تبصرہ نہیں کیا تھا البتہ دوبارہ خود اس سے ملنے گئے تھے اور اس موضوع پر کوئی بات نہ کی تھی۔ مسعود بھائی ہر ہفتے پہنچ جاتے۔ وہ چاہتے ہوئے بھی انہیں منع نہ کر سکتی تھی۔ چنانچہ جب اسے پتا چلا کہ اس سے آگے ایک اور پہاڑی علاقے میں ٹیچر کی ضرورت ہے وہاں ایک ٹیچر بھی نہیں ہے۔ پرانی ٹیچر جو تھیں انہوں نے ریٹائرمنٹ لے لی ہے اور وہ علاقہ ایسا ہے کہ وہاں تک جانے کے لئے کنوئیں کا بھی صحیح انتظام نہیں ہے تو اس نے اپنی ہیڈ مسٹر لیس سے کہا کہ وہ وہاں جانے کے لئے تیار ہے۔ ارد گرد کے سارے گاؤں انہی کے تحت تھے۔

”مگر مس بخت۔ آپ کے آنے سے مجھے بڑا سہارا ملا تھا۔

”یہاں تو آپ ہیں اور پھر شاید کوئی اور بھی آجائے۔ مگر وہاں تو کوئی نہیں ہے۔“

”آپ بہت نیکی کا کام کر رہی ہیں مس بخت۔“ وہ اس سے بہت متاثر تھیں۔ اس نے ان سے التجا کی تھی کہ کسی کو بھی اس کے متعلق نہ بتایا جائے کہ وہ کہاں ہے۔

چنانچہ سات آٹھ ماہ سے وہ بہت سکون کے ساتھ اس چھوٹے سے گھر میں رہ رہی تھی۔ اسکول کے ساتھ ہی ایک کمرے اور کچن کا چھوٹا سا گھر تھا۔ اسکول کا عملہ ایک چوکیدار، ایک مائی اور ایک کلرک پر مشتمل تھا۔ اب اس کے آنے سے چار افراد ہو گئے تھے۔ لڑکیوں کی تعداد بہت کم تھی اور اس کے آنے سے پہلے کلرک انہیں پڑھایا کرتا سابقہ ٹیچر کے جانے کے بعد کئی لڑکیوں نے اسکول آنا چھوڑ دیا تھا مگر اس کے آجانے سے وہ پھر آنے لگی تھیں۔ سب لوگ بے حد مخلص تھے اور اس کی بہت عزت کرتے تھے چند ہی دنوں میں تقریباً سارے گاؤں سے اس کی واقفیت ہو گئی تھی۔ اس نے درخواست دی تھی کہ یہاں ایک اور ٹیچر بھیجا جائے جس پر ممکنے نے وعدہ کیا کہ جلد ہی وہ کسی ٹیچر کا بندوبست کر دیں گے اور یہ بھی محض اتفاق تھا کہ بہت جلد مسز اقبال آ گئیں۔ مسز اقبال ریٹائر ہو چکی تھیں۔ دنیا میں اکیلی تھیں۔ شوہر کا انتقال ہو چکا تھا اولاد تھی نہیں۔ لہذا اپنی خوشی سے یہاں آئی تھیں۔

”یہ اس اسکول کی زندگی میں پہلا موقع ہے کہ یہاں بیک وقت دو ٹیچرز موجود ہیں۔“ کلرک بہت خوش تھا بچے مطمئن تھے۔

اور بخت کا وقت بھی بہت اچھا گزر رہا تھا۔

مسز اقبال بہت شفیق اور مہربان تھیں۔ اس کی ڈاک پرانے اسکول کے ایڈریس پر آتی جسے پندرہ دن بعد چوکیدار جا کر لے آتا۔ مسعود بھائی دو تین بار اس کا پتا کرنے آئے تھے اور پھر مایوس ہو کر چلے گئے تھے۔ اسے ان کی سمجھ تو نہیں آئی تھی لیکن پتا نہیں کیوں وہ ایک دم ہی اسے بہت برے لگنے لگے تھے۔

کاغان جانے والی ایک ویگن نہ جانے کیسے حادثے کا شکار ہو کر گاؤں کے قریب سے گزرنے والے پہاڑی نالے میں گر پڑی تھی۔ ہلاک شدگان اور زخمیوں کو فوراً قریبی قصبے میں پہنچا دیا گیا تھا مگر وہ نہ جانے کیسے رہ گیا تھا۔ شاید امدادی پارٹی میں سے

کسی کی اس پر نظر نہیں پڑی تھی۔ اور نہ جانے کیسے وہ گر تاپڑتا گاؤں میں پہنچ گیا تھا۔
 بخت اپنے بستر پر لیٹی سونے کی کوشش کر رہی تھی۔ قریب ہی مسز اقبال سو رہی
 تھیں۔ جب سے وہ آئی تھی مائی کچن میں سونے لگی تھی۔ بخت نے ایک نظر سوئی ہوئی
 مسز اقبال کو دیکھا، کتنی گہری نیند سو رہی ہیں اور ایک وہ ہے جس سے نیندیں روٹھ گئی
 ہیں اکثر ساری رات نیند نہیں آتی تھی اور آج تو پھر عجیب سی بے چینی اور گھبراہٹ
 محسوس ہو رہی تھی۔ شاید یہ صبح ہونے والے دیگن کے حادثے کا اثر ہے۔ چوکیدار نے
 بھی پوری تفصیل بتائی تھی۔ کیسے کسی کی لاش کا سر الگ تھا، ٹانگیں الگ تھیں۔ زخمی
 کراہ رہے تھے۔

”اے تو اخبار میں رپورٹر ہونا چاہئے تھا۔“ مسز اقبال نے تبصرہ کیا تھا۔
 بارہ بج چکے تھے۔ اس نے گھڑی پر ایک نظر ڈالی اور قریب پڑی لکڑی کی میز پر
 پڑے ہوئے مٹی کے تیل کی لائین کو اٹھایا تاکہ بجھا سکے کہ دروازے پر دستک دی۔
 کسی نے بہت زور سے دروازہ کھٹکھٹایا تھا۔
 ”مسز اقبال۔“ اس نے گھبرا کر انہیں جھنجھوڑا لالا۔
 ”کیا ہے؟“ وہ آنکھیں ملتی ہوئی اٹھ بیٹھیں۔

”باہر دروازے پر کوئی ہے۔“ مسز اقبال نے سننے کی کوشش کی۔
 ”نہیں شاید تمہارا وہم ہے۔“ تب ہی دروازے پر پھر دستک ہوئی مگر اب کے یہ
 دستک بہت ہلکی تھی جیسے کوئی ہولے ہولے دروازے پر ہاتھ مار رہا ہو۔
 ”پہلے کسی نے بہت زور سے دروازہ دھڑ دھڑایا تھا۔“ بخت نے لائین کو اونچی
 کرتے ہوئے کہا۔

”دیکھیں، اس وقت کون ہے۔“ مسز اقبال کھڑی ہو گئیں۔
 ”مائی کو بھی جگا لیتے ہیں۔“ بخت نے کہا۔ دونوں باہر نکلیں تو مائی بھی کچن سے باہر

آ رہی تھی۔

”باہر شاید کوئی ہے بی بی صیب۔“

”ہاں۔ مگر اس وقت کون آسکتا ہے۔“

”کہیں کوئی چور ڈاکو ہی نہ ہو۔“

”ادھر کیا ہے جو کوئی چوری کرنے آئے گا۔“ مائی نے لائین اس کے ہاتھ سے
 لے لی۔

”شاید میری بیٹی کے گھر سے کوئی آیا ہو۔ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی آج
 کل۔“ مائی نے بات کرتے کرتے بے دھڑک دروازہ کھول دیا۔ مسز اقبال اسے منع
 کرتے کرتے رہ گئیں۔

دروازے کے پاس ہی دیوار کے ساتھ کوئی ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔
 ”اے کون ہو تم؟“ مائی نے آگے بڑھ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو اس کا سر
 ایک طرف کو لڑھک گیا۔ بخت نے لائین اونچی کی۔ وہ جو کوئی بھی تھا زخمی تھا۔ اس کا
 سر نیچے کو جھکا ہوا تھا اس لئے اس کا چہرہ صاف نظر نہیں آ رہا تھا اس کی قمیص کے کالر پر
 خون لگا ہوا تھا اور گردن پر بھی خون جما تھا۔

”یہ۔ یہ تو زخمی ہے اور شاید بے ہوش ہو گیا ہے۔“ بخت کی آواز لرز رہی تھی۔
 ”پر زخمی کیسے ہوا۔ کیا کسی نے مارا ہے اسے۔“ مائی نے جیسے اپنے آپ سے کہا۔
 ”آج دیگن کا حادثہ بھی تو ہوا تھا۔ ممکن ہے ان زخموں میں سے کوئی ہو۔“ مسز
 اقبال نے رائے پیش کی۔

”جو بھی ہو اس کی مدد کرنا ہمارا اخلاقی فرض بنتا ہے۔“ بخت نے اپنی حالت پر قابو پا
 لیا تھا۔

”تم جاؤ۔ چوکیدار کو جگا لاؤ۔ اُسے اندر لے چلتے ہیں تھوڑی بہت فرسٹ ایڈ تو مجھے

آتی ہے۔ صبح قصبے سے ڈاکٹر کو بلا لیں گے جانے کتنا خون ضائع ہو چکا ہے۔“

جب چوکیدار کی مدد سے اسے اٹھا کر اندر لایا گیا اور چوکیدار نے بستر پر لٹا کر اسے سیدھا کیا تو بخت کی چیخ نکل گئی۔

”اتی۔ تم۔“ وہ بے اختیار گھٹنوں کے بل بستر پر بیٹھ گئی اور اس کا ہاتھ تھام لیا۔ وہ بے سدھ پڑا تھا اور وہ بے قراری سے اسے بلارہی تھی۔

”اتی۔ اقتدار۔!“

”یہ غالباً تمہارے کوئی عزیز ہیں۔“ مسز اقبال نے بخت کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

”ہاں۔“ وہ چونکی۔

”میرے کزن ہیں اقتدار احمد، مشہور راسٹر ہیں۔ یہ یہ کراچی میں تھے۔ یہاں کیسے۔“

”اوہ اقتدار احمد ہیں۔“ مسز اقبال نے جھک کر اسے دیکھا۔

”میرے پسندیدہ شاعر ہیں۔ تم نے کبھی بتایا ہی نہیں کہ یہ تمہارے کزن ہیں۔ اور یقیناً یہ اسی ویگن میں ہوں گے جو حادثے کا شکار ہوئی ہے۔“

”ہوں۔“ بخت بہت غور سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کی رنگت کتنی سنو لاگئی تھی۔ آنکھوں کے نیچے حلقے پڑے تھے اور اب تو چہرے پر خراشیں تھیں۔ پیشانی کے زخم پر خون جم گیا تھا اور نچلے ہونٹ کے قریب بھی خون جمنا تھا۔

”بخت تم کہہ رہی تھیں کہ تمہیں فرسٹ ایڈ۔۔“ مسز اقبال نے اسے محو دیکھ کر کہا۔

”ہاں۔“ وہ چونکی۔

”اماں تم جلدی سے پانی گرم کرو اور روئی لے آؤ۔ پہلے زخم صاف کروں گی پھر دودھ گرم کرنا۔“ اس نے نبض پر ہاتھ رکھا۔ نبض بہت آہستہ چل رہی تھی۔

”گھبراؤ نہیں بخت۔ خطرے والی کوئی بات نہیں ہے۔“ مسز اقبال نے اسے دلاسا دیا مگر اس نے ساری رات جاگ کر گزار دی۔ صبح قصبے سے آکر ڈاکٹر اسے دیکھ گیا تھا۔

وہ ہوش میں آیا تو تھا لیکن پھر بھی ہوش میں نہیں لگتا تھا۔ ڈاکٹر نے اسے نیند کا انجکشن لگا دیا تھا اور بخت کو تسلی دی تھی کہ پریشانی کی کوئی بات نہیں لیکن بخت کو چین نہیں آ رہا تھا۔ وہ بڑی تندہی کے ساتھ اس کی تیمارداری کر رہی تھی۔ شروع شروع میں تو ایسا لگتا تھا جیسے وہ حواس میں نہ ہو، عجیب عجیب باتیں کرتا۔ مگر اب کئی دنوں سے بخت محسوس کر رہی تھی کہ وہ ہوش میں ہے اور اکثر اسے بہت گہری نظروں سے دیکھتا ہے جیسے اسے پہچان رہا ہو۔

مسز اقبال نے کئی بار اس سے پوچھا تھا کہ اسے کیا ہوا تھا مگر وہ ٹھیک سے کچھ بتا نہیں سکا تھا لیکن یقیناً واقعہ تھا کہ وہ اسی ویگن میں رہا ہوگا۔ اس روز وہ اسکول سے واپس آئی تو وہ دھوپ میں کرسی بچھائے بیٹھا تھا۔ بخت کو اسے یوں باہر بیٹھے دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ اس کی دلکش آنکھوں میں کسی گہری سوچ کی پرچھائیاں تھیں۔

”تمہاری طبیعت اب کیسی ہے؟“

”میری طبیعت۔“ اس نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

”خاتون! تم مجھے بتا سکتی ہو کہ میں یہاں کیسے آیا۔ تم کون ہو اور میں کون ہوں؟ اس کی پیشانی پر لکیروں کا جال سا بن گیا تھا۔ جیسے وہ بہت الجھن میں ہو بخت کا دل دکھ سا گیا۔ وہ جو اس کا تھا جس کے ساتھ اس نے زندگی گزارنے کے خواب دیکھے تھے اور جو اپنے خوابوں کی تعبیر پانے کے لئے اس سے بچھڑ گیا تھا اب ملا تھا تو اسے پہچانتا بھی نہ تھا۔

”آپ زخمی تھے اور آپ نے دروازے پر دستک دی تھی۔“

”میں شرمندہ ہوں خاتون کہ میری وجہ سے آپ کو بہت تکلیف اٹھانا پڑی۔“

”نہیں، تکلیف کیسی۔“

”میں اب بہتر ہوں، ایک دو روز میں چلا جاؤں گا۔“

”نہیں نہیں۔“ بخت نے بے اختیار کہا۔

”ابھی آپ بہت کمزور ہیں سفر کے قابل نہیں۔ پھر آپ جائیں گے کہاں۔ جب آپ کو یاد نہیں کہ آپ کو کہاں جانا ہے۔ آپ کہاں سے آئے تھے۔“

”ہاں مجھے کچھ یاد نہیں میں گھر سے کہاں جانے کے لئے نکلا تھا۔ مجھے اپنا آپ نہیں مل رہا خاتون۔ میں خود سے اپنا پتا پوچھتا پھر رہا ہوں اور خود کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے تھک گیا ہوں کھو گیا ہوں۔ خاتون آپ میری مدد نہیں کر سکتیں؟“

اس نے بے بسی سے اسے دیکھا۔

”آپ۔ آپ مجھے نہیں پہچانتے۔؟“

”آپ کو۔“ اقتدار کی نظریں اس کے چہرے پر تھیں۔

”کبھی کبھی لگتا ہے جیسے آپ کو کہیں پہلے بھی دیکھا ہے۔ لیکن پھر آنکھوں کے

آگے دھند سی چھا جاتی ہے۔ یاد نہیں آتا کہاں۔“

”میں بخت ہوں اُتی۔ مجھے پہچانو۔“ اس کی آواز میں آنسو سے گھل گئے تھے۔

”بخت۔“ اس نے زیر لب دہرایا۔

”بخت آور۔“

”ہاں بخت آور۔“

بخت کی آنکھیں چمکنے لگیں لیکن اس کے چہرے پر وہی پتھریلی اجنبیت تھی اور وہ سامنے خلا میں دیکھ رہا تھا۔

”تم اقتدار ہو، اقتدار احمد، ملک کے مشہور شاعر اور ادیب، تمہاری کتابیں چھپ چکی ہیں۔ ٹی وی پر تمہارے دو سیریز آچکے ہیں اور۔۔“

”مگر آپ یہ سب کچھ کیسے جانتی ہیں خاتون؟“ اس نے بے یقینی سے بخت کو دیکھا۔

”میں اتنا جانتا ہوں کہ میں ایک بے مایہ سا انسان ہوں اور ایک شب آپ کے

دروازے پر زخمی حالت میں پڑا تھا اگر میں اتنا بڑا آدمی ہوتا تو اس طرح۔“

”تم اقتدار ہو۔ خود کو پہچانو۔ ہم بہت جلد گھر چلیں گے بابا تمہیں یاد کرتے ہیں۔ مامی تو تمہیں یاد کر کر کے روتی ہیں اور اماں کو تو ہمیشہ سے بہت پیارے تھے اُتی۔ انہوں نے ہمیشہ تمہارے لئے دعائیں کیں۔ شاید انہیں بھی یقین تھا کہ تم کبھی نہ کبھی پلٹ کر ضرور آؤ گے۔“

”میرا تو کوئی گھر نہیں تھا خاتون۔ وہ گھر تو اس کا تھا اور وہ جب اس کا دل چاہتا مجھے گھر سے نکال دیتی تھی۔ وہاں تو کوئی بابا اور اماں نہیں رہتے تھے، وہاں تو۔“

”تمہارا ایک اور گھر بھی تو ہے اُتی جہاں تم پیدا ہوئے تھے جہاں تم نے وہ خواب اپنی آنکھوں میں بسائے تھے جو تمہیں اجنبی زمینوں کی طرف لے گئے۔“

”آپ تو بہت کچھ جانتی ہیں خاتون۔“ وہ ہنسا۔

”پتا نہیں کیوں آپ کی بات پر یقین کرنے کو دل بھی چاہتا ہے اور نہیں بھی۔“

”اُتی۔۔“ بخت نے اس کے ہاتھوں پر اپنے ہاتھ رکھ دیئے۔

”میں جھوٹ نہیں بولتی۔ تم اپنے خوابوں کی تعبیر پانے چلے گئے اور پھر وہاں تم

نے اپنے خوابوں کی تعبیر پالی، لیکن ہم سب کو کھو دیا۔ وہاں کراچی میں تمہاری بیوی ہے

اور شاید کوئی بچہ بھی ہو۔“

”بچہ۔“ اس نے پر سوچ نظروں سے اسے دیکھا۔

”وہ تو پیدا ہوتے ہی مر گیا تھا۔ ناراض ہو گیا تھا مجھ سے خفا ہو گیا تھا۔ اسے یہ دنیا

پسند ہی نہیں آئی۔ اچھی ہی نہیں لگی اس نے درد کی دنیا میں رہنا پسند ہی نہیں کیا

خاتون۔“

”اور تمہاری بیوی۔“

”میری بیوی۔“ اس نے آنکھیں بند کر کے پیشانی پر اپنے دائیں ہاتھ کی انگلی ماری۔

”وہ کہتی تھی تم اسی کے پاس چلے جاؤ جس سے تم شعر کی زبان میں باتیں کرتے ہو

جس کی جدائی میں تمہارا قلم لہو روتا ہے اور میں نے اس سے کہا تھا کہ میں اس سے محبت کرتا ہوں مگر اسے میری بات کا یقین نہیں آ رہا تھا وہ کہتی تھی تمہاری آنکھیں سچ بولتی ہیں۔ انہیں جھوٹ بولنا نہیں آتا۔ کیا میری آنکھیں سچ بولتی ہیں خاتون؟“ اس نے ایک دم آنکھیں کھول کر اسے دیکھا۔

”ہاں۔“ بخت کی نظریں جھک گئیں۔

”وہ سچ کہتی تھی۔“

”ہاں۔ وہ سچ ہی کہتی تھی۔“ اس نے پھر آنکھیں بند کر کے کرسی کی پشت سے سر ٹیک لیا۔

”اے میرا جھوٹ بولنا پسند نہیں تھا مگر جب اسے دورہ پڑتا تھا تو وہ چیخ چیخ کر کہتی تھی کہ میں اس سے جھوٹ بولوں اور جب میں جھوٹ بولتا تھا تو وہ یقین نہیں کرتی تھی۔ وہ بڑی معصوم تھی۔ اندر سے کسی ننھے بچے کی طرح تھی۔ محبت کی خواہشمند وہ ہولے ہولے بول رہا تھا جیسے اپنے آپ سے باتیں کر رہا ہو، بخت نے اسے ٹوکا نہیں بولنے دیا۔ شاید اس طرح ہی بولتے بولتے وہ ماضی کی گتھی سلجھالے۔ اسے یاد آ جائے کہ وہ کون ہے۔

”میں چاہتا تھا کہ اسے مجھ سے کوئی شکایت نہ ہو۔ میں اس کی ہر بات مانتا تھا لیکن پھر بھی وہ غصہ میں رہتی تھی۔ پتا نہیں کیوں حالانکہ ڈاکٹر نے اسے غصہ کرنے سے منع کیا تھا۔ اس نے مجھ پر بہت احسان کئے تھے اور میں ان احسانات کی قیمت چکانا چاہتا تھا لیکن مجھے آخر تک پتا ہی نہ چلا کہ میں ان احسانات کی قیمت کیسے چکاؤں۔ اور جب پتا چلا تو وہ زندہ ہی نہ رہی۔“

”کیا۔ کیا تمہاری بیوی مر گئی؟“ بخت نے بے اختیار پوچھا۔ لیکن اس نے جیسے اس کی بات سنی ہی نہیں اور بولنا گیا۔

میرے پاس اس کے لئے احسان مندی کا جذبہ تو تھا لیکن محبت نہیں تھی۔ پتا نہیں تھی۔ پتا نہیں کیوں میں اس کی زندگی میں اس سے محبت نہیں کر سکا تھا۔ میرے دل پر بہت سارے بوجھ تھے۔ میرے وجود کے اندر سے کوئی چیز مجھے شرمندہ کرتی رہتی اور مجھے پتھر مارتی۔ مجھ پر ہنستی طنز کرتی تھی اس لئے میں نے کبھی دھیان سے اسے دیکھا ہی نہیں۔ میں تو اپنے اندر سے اٹھنے والی آوازوں کے بوجھ تلے ہی دبا رہتا تھا اور وہ بھی مجھے اسیر کئے رکھتی۔ وہ جس سے میں محبت کرتا تھا اور جب وہ مر گئی تو مجھے احساس ہوا کہ وہ تو محبت کے قابل تھی اور میں اس سے محبت کر سکتا تھا۔ اس نے تو بڑی محروم زندگی گزاری تھی وہ جو دوسروں کے خوابوں کی تعبیر بخش سکتی تھی خود اس کی آنکھیں ہمیشہ بے خواب ہی رہیں اس نے آخری بار مجھ سے کہا تھا۔

”میں ہمیشہ تمہاری ہوں۔ بچپن سے ہی، تم سے ملنے کے بعد بھی اتنی ہی تمہارا کیلی جتنی ہمیشہ سے تھی اور اس تنہائی اور اکیلے پن کے دکھ نے مجھے اندر سے چاٹ لیا ہے۔“

میں نے اسے یقین دلایا تھا کہ آنے والا بچہ اس کی تنہائی کو ختم کر دے گا اور ہم دونوں ماضی کو بھلا کر نئے سرے سے زندگی کا آغاز کریں گے اور میں اسے اپنے گھر لے جاؤں گا وہ گھر جو میرا ہو گا اور جہاں وہ مجھے گیٹ آؤٹ نہیں کہہ سکے گی۔ لیکن شاید اسے میری بات پر یقین نہیں تھا اس نے مجھ سے کہا تھا۔ ”میرے بعد تم اس شہر میں مت رہنا اور اس کے پاس چلے جانا۔“

میں نے بہت کہا کہ اسے زندہ رہنا ہے مگر اسے میری بات کا یقین نہیں تھا۔ اس لئے وہ چلی گئی اور اپنے ساتھ اپنے بچوں کو بھی لے گئی۔ مگر مجھے وعدے کی زنجیروں میں جکڑ گئی اور اس کے بعد میں اسے ڈھونڈنے نکلا۔ مگر شاید اس کا پتا مجھ سے کھو گیا تھا۔ یا میں راستے گم کر بیٹھا تھا۔“

اس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے جھلملا رہے تھے۔ بولتے بولتے وہ ایک دم چپ

ہو گیا تھا۔

”اتی-اتی-گیتی مر گئی۔ کیا تمہیں اس سے بہت محبت تھی؟“ بخت نے اسے پکارا۔
مگر وہ شاید اپنے آپ میں نہیں تھا۔
”میں۔“ تھوڑی دیر بعد اس کے لب پھر کھلے۔

”میں دور زمینوں کو سر کرنے کے لئے گھر سے نکلا تھا۔ سمندروں میں میرا جہاز مدتوں سفر کرتا رہا۔ اور پھر ایک دن کسی چٹان سے ٹکرا گیا۔“
”اتی-اتی۔“ بخت نے اسے جھنجھوڑا ڈالا۔ اس نے آنکھیں کھول کر خالی خالی نظروں سے اسے دیکھا۔ اسے لگ رہا تھا جیسے وہ ڈوبتے جہاز کے عرشے پر کھڑا اے ڈے سے ڈے پکار رہا ہو اور کوئی اس کی پکار نہ سن رہا ہو۔

”میں بخت ہوں۔ مجھے پہچانو۔ تم نے کہا تھا رونا نہیں ورنہ میں ان نمکین پانیوں کی جھیلوں کو جو تمہارے آنسوؤں سے بن جائیں گی عبور نہیں کر پاؤں گا اور یقین کرواتی میں روئی نہیں۔“

اور تم نے یہ بھی کہا تھا کہ دھوپ کی تمازتوں سے تھک کر کسی شجر سایہ دار تلے بیٹھ جانا کوئی بہت بڑا جرم نہیں ہے اور یہ تو محض پڑاؤ ہے منزل نہیں اور میں نے تو تمہارے ایک ایک لفظ کا یقین کیا تھا اتنی۔ میں تمہاری منتظر تھی۔“

”اور میری پکار کوئی نہیں سنتا۔“ اقتدار نے بے بسی سے سوچا۔ ”اور کوئی دیر کی بات ہے، میرا جہاز ڈوب جائے گا۔“

”اقتدار پلیز ہوش کرو۔ کوشش کرو پار کرنے کی۔ میں وہی ہوں جسے ڈھونڈنے تم نکلے ہو۔ جس کو تم شعروں میں پکارتے رہے۔ میں نے ہمیشہ تمہاری پکار کا جواب دیا اتنی۔“
”تم نے میری پکار سنی۔“ اس نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا اور سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔
”تم۔۔“ اس کی آنکھوں کے آگے روشنی سی لہرائی۔۔

”تم بخت ہو۔“

”ہاں میں بخت ہوں۔ تمہارا بخت۔“ وہ آنسوؤں میں مسکرائی۔

”تم بخت ہو۔ تم بخت ہو۔“ وہ کرسی سے اٹھا اور گھٹنوں کے بل اس کے پاس بیٹھ گیا۔ کسی قریب سے گزرتے جہاز نے شاید اس کی پکار سن لی تھی۔ اسے لگا جیسے اب وہ بچ جائے گا۔

”تم بخت ہونا۔“

”ہاں اتنی۔ میں بخت ہوں۔“

”بخت۔“ اس کی آنکھیں گیلی ہو گئیں۔ اس نے بخت آور کے گھٹنوں پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

”میں شاید تمہیں ہی ڈھونڈ رہا تھا۔ میں نے گیتی سے وعدہ کیا تھا کہ اگر وہ زندہ رہی تو اسے ساتھ لے کر اور اگر وہ نہ رہی تو اکیلا تمہارے پاس آؤں گا۔ لیکن تم یہاں اکیلی؟ نہیں تم بخت نہیں ہو۔“ اس کی آنکھوں کے آگے پھر دھند چھانے لگی تھی۔

”میں بخت ہوں۔“ وہ بڑے اعتماد کے ساتھ مسکرائی۔

”اور مجھے یقین ہے اقتدار احمد کہ اب ہم کبھی جدا نہ ہوں گے۔ آج نہیں تو کل تم پورے یقین سے کہو گے۔“

”چلو بخت ماضی کو بھول کر نئے سفر کا آغاز کریں۔ یوں بھی وہ تو محض ایک پڑاؤ تھا نا۔“ اس نے اپنے گھٹنوں پر رکھے اپنے ہاتھ پر اس کا ہاتھ رکھ دیا۔

”تم تھک گئے ہو گے اتنی۔ چلو آرام کر لو اب۔“

”ہاں میں تھک گیا ہوں خاتون، مگر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کون ہوں۔“

”چلو کمرے میں۔ میں دودھ گرم کر کے لاتی ہوں۔“

”میں نے تمہیں بہت تکلیف دی ہے خاتون۔“

”ایسا نہ کہا کرو۔ تمہیں کیا خبر کہ تم میرے لئے کیا ہو۔“

”میں۔“ اس نے بخت کے ساتھ چلتے چلتے اسے دیکھا۔

”میں تو ڈوبتے جہاز کا مسافر ہوں خاتون اور ڈوبتے جہاز کے مسافر سے پیار نہیں

کیا جاتا۔“

”نہیں تمہارا جہاز کنارے آگیا ہے۔“

”تمہیں نہیں پتا خاتون گیتی مر گئی تھی اور اس کا بچہ بھی۔ اس نے دنیا میں آکر

آنکھیں کھولیں اور پھر بند کر لیں اور گیتی نے اس کے پندرہ منٹ بعد۔ ٹھیک پندرہ

منٹ بعد دنیا سے ناپا توڑ لیا۔ مماندن تھیں۔ پایا بیمار تھے اور میں۔ میں کہاں تھا۔ ہاں

شاید اکرام الحق صاحب کے ہاں تھا یا پھر پتا نہیں کہاں۔ پھر وہ آیا شامی اس نے کہا کہ وہ

مجھ سے محبت کرتی ہے۔

میں نے کہا نہیں، وہ تو مجھے اپنا پالتو جانور سمجھتی ہے مگر وہ مجھے ساتھ لے آیا اور پھر

ہاسپٹل کے کمرے میں میرے سامنے اس نے آنکھیں بند کیں اور اس وقت میں نے

اس کی آنکھوں میں اپنے لئے محبت دیکھی۔ نہیں شاید وہ جہاز کے عرشے پر تھی اور

میں کھڑا مے ڈے پکار رہا تھا۔ مگر وہ ڈوب گئی اور میں بھی اب ڈوب رہا ہوں۔“

”نہیں اتی۔ تم نہیں ڈوبو گے۔ ہم سب تمہیں اس جہاز سے باہر لے آئیں گے،

میں، بابا، ماما اور اماں۔“

”بابا۔“ اپنے بستر پر بیٹھے ہوئے اس کی نگاہیں پھر بخت کے چہرے پر ٹنگ گئیں۔

”تم۔“ اس نے انگلی سے اس کی طرف اشارہ کیا۔

”بخت۔“ وہ مسکرائی۔

”کس کا۔“ بے اختیار اقتدار کے منہ سے نکلا۔

”تمہارا۔“

بخت کے ہونٹوں پر بے اختیار مسکراہٹ آگئی۔ یقین اور اعتماد سے پر مسکراہٹ۔

اس نے چمکتی آنکھوں سے اقتدار کو دیکھا جس کی آنکھوں کے آگے پھر روشنیاں لہرا

رہی تھیں اور پہچان کے رنگ اتر رہے تھے اور وہ ایسی نظروں سے بخت کو دیکھ رہا تھا

جیسے پہلے کبھی دیکھا کرتا تھا اور بخت کے رخساروں پر شفق اتر آئی تھی۔ آج بھی اس

کے رخسار شفق رنگ ہو رہے تھے۔

”بخت۔“ اقتدار نے سرگوشی کی اور بخت کی آنکھیں جھلجھلا اٹھیں۔

آنے والے اچھے دنوں کی امید کی روشنی سے۔

اور وہ دونوں ہاتھ اپنے چہرے پر رکھے خوفزدہ سا ہو کر پیچھے ہٹنے لگا۔

ام کلثوم کا ننھا سادل کانپ کر رہ گیا اور بے اختیار اس کی نگاہیں اپنی گلابی ہتھیلیوں کی طرف اٹھ گئیں کہ بید کی یہ چھڑی کئی بار ان گلابی ہتھیلیوں کو چوم چکی تھی۔ کیونکہ قرآن پاک کی تلاوت کرتے وقت وہ قاف کی آواز صحیح طرح سے حلق سے نہیں نکالتی تھی۔

”بے حیا، نافرمان۔“

میاں جی کی چھڑی نے پھر حرکت کی تو نہ جانے بے اختیار جذبے کے تحت وہ ایک قدم آگے بڑھی۔

”کیا ہو امیاں جی؟“

نہ جانے کیسے اس کی زبان سے نکلا۔

”ہزار دفعہ اسے سمجھایا ہے کہ شرعی طریقے سے شلوار باندھا کرو لیکن دیکھو یہ دیکھو اس کے پانچ زمین پر جھاڑ دے رہے ہیں ٹخنوں سے اونچے شلوار باندھا ہوا حق انسان۔“

میاں جی کی چھڑی نے ایک بار اس کی پیٹھ کو اپنا نشانہ بنایا۔ ام کلثوم کی کچھ سمجھ میں آیا کہ یہ کیسا جرم ہے اور کیسی سزا ہے لیکن پھر وہ زرد پڑ گئی اور اس نے غیر ارادی طور پر اپنی شلوار کو اوپر کھینچا کہ کہیں میاں جی اسے بھی نہ مار بیٹھیں۔

سات سالہ عبد الحفیظ کی سمجھ میں بھی بات نہیں آئی تھی لیکن اس نے کھینچ کر شلوار اوپر کر لی تھی اور اب روتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

”معاف کر دیجئے میاں جی اب ایسے نہیں ہوگا۔“

”اچھا جااب۔“

میاں جی چھڑی کا رخ زمین کی طرف ہو گیا اور تب ہی ان کی نگاہیں ام کلثوم کی طرف اٹھ گئیں جو وہیں کھڑی تھی۔ اور اس کے پاؤں من من بھر کے ہو گئے تھے۔ حالانکہ اس نے دوبارہ واپس جانے کے لئے قدم اٹھایا تھا لیکن پھر وہیں کھڑی رہ گئی

نایافت

تپتے پتھر کی سلوں پر کوئی چشمہ لکھ دے
اس کڑی دھوپ کے آنگن کوئی سایہ لکھ دے
ان سراپوں سے کوئی موج رواں بھی ابھرے
خشک صحرا کے ورق پر کوئی دریا لکھ دے

اور عبد الحفیظ کے چلانے کی آواز پر ام کلثوم یونہی ننگے سر ننگے پاؤں بھاگتی ہوئی باہر نکل آئی لیکن پھر بڑے کمرے کے دروازے پر ٹھک کر، سہم کر رک گئی کھلے ہوئے دروازے سے میاں جی کا غصے میں تپا ہوا لال سرخ چہرہ صاف نظر آرہا تھا ان کے ہاتھ میں بید کی وہ پتلی سی چھڑی تھی جسے بچوں کو قرآن شریف پڑھاتے وقت وہ اپنے ہاتھ میں رکھا کرتے تھے اور ام کلثوم کے دیکھتے ہی دیکھتے وہ چھڑی ایک بار پھر عبد الحفیظ کی پیٹھ پر پڑی اور وہ بلبلاتا اٹھا۔

”نہیں۔ نہیں میاں جی۔“

تھی۔ میاں جی نے جیسے پہلی بار اسے دھیان سے دیکھا۔
”ام کلثوم۔“

اور ام کلثوم کو یوں لگا جیسے ابھی اس کا دل ڈوب جائے گا۔ وہ سہم کر اپنے آپ میں
سمٹ گئی۔ ان کی آنکھیں بے حد سرخ ہو گئی تھیں۔
”تمہارا دوپٹہ کہاں ہے؟“

”جی۔ وہ میاں جی۔“

اس نے بمشکل تھوک نکلتے ہوئے کہا۔

”وہ بڑی آپاسر پر تیل لگا رہی تھیں۔ عبدالحفیظ کے چلانے کی آواز سن کر یو نہی
بھاگی چلی آئی۔“ میاں جی نے چبھتی نگاہوں سے آنکھوں میں اس کے پورے وجود کا
جائزہ لے لیا۔ ایک غصیلی نظر اس پر ڈالی اور وہیں کھڑے کھڑے آواز دی۔

”امت الرشید، امت الرشید۔“

اور ان کی آواز سنتے ہی بڑا سادو پیٹہ چاروں طرف لپیٹے بڑی آپا نگاہیں جھکائے
دروازے کے پاس آکر کھڑی ہو گئیں۔

”آپ نے بلایا ہے میاں جی۔“

”امت الرشید آپ کو یاد ہے آپ نے کتنے برس کی عمر میں برقع اوڑھا تھا۔“ میاں
جی بغیر تمہید کے باتیں کرنے کے عادی تھے۔

”جی۔ شاید سات سال کی عمر میں۔“

بڑی آپا کی نگاہیں بدستور جھکی ہوئی تھیں۔

”ام کلثوم کی عمر کیا ہے۔“

”تقریباً نو سال ہو گی جی۔“

”تو آپ نے انہیں بتایا نہیں کہ اس طرح ننگے سر باپ اور بھائیوں کے سامنے

نہیں آتے۔“

وہ غصے سے گرجے اور اپنے جسم کو چراتی ہوئی ام کلثوم کی ٹانگوں سے جیسے جان نکل
گئی اور وہ ہولے ہولے جھکتی ہوئی نیچے بیٹھ گئی۔

”عبدالمتین کو بازار بھیج کر برقعے کے لئے کپڑا منگوالو اور ام کلثوم کے لئے برقع
بنوالو اور آج سے اس کا باہر یا بازار بھیجنا بند۔“

وہ چھڑی ہاتھوں میں پکڑے باہر نکل گئے کہ مسجد میں قرآن شریف پڑھنے کے
لئے بچے اکٹھے ہو گئے تھے اور ان کے درس کی آواز یہاں تک آرہی تھی۔

ام کلثوم کی آنکھوں میں نمکین پانی اکٹھا ہونے لگا تو اب وہ باہر نہ جاسکے گی پیو اور
بوہی سے ”کیڑا کیڑی“ اور ”لکڑی میٹھی“ نہ کھیل سکے گی اور نہ ہی ”پٹھو گرم“ اور ”پٹھو
گرم“ کھیلتے ہوئے مزا آتا تھا ابھی تو پیو نے کچے کھیلتے ہوئے اس پر جو دو ”بازے“
چڑھائے تھے وہ بھی اتارنے تھے۔ اور اسے یوں لگا جیسے ان دو ”بازوں“ کا بوجھ اس کے
سینے کو دبا رہا ہو پیس رہا ہو۔

تینو تارا

رنگاں والا

رنگ پیازی

آیاتا قاضی

اس نے زیر لب کہا اور تصور ہی تصور میں رنگ برنگی گولیوں سے کھیلنے لگی۔

کھلو کھانچا

جیوے مہرا چچا

چاچا جی حیندے رہو۔

وہ بے آواز گارہی تھی کہ بڑی آپا نے اسے پکارا۔

”ام کلثوم۔“ اس نے بے بسی سے ان کی طرف دیکھا۔

”بڑی آپا میں پیو کے ”بازے“ اتار آؤں۔“

شاید اسے آگہی ہو گئی تھی کہ اب میاں جی اسے کبھی باہر جانے نہیں دیں گے اور یہ بوجھ ہمیشہ اس کے دل کو پیتا رہے گا۔

لیکن بڑی آپا نے اس کی بات پر دھیان ہی نہیں دیا وہ تو یوں حیرانی سے اسے دیکھ رہی تھیں، جیسے پہلی بار دیکھ رہی ہوں۔

”ارے تو سچ سچ اتنی بڑی ہو گئی ہے ام کلثوم اور مجھے خبر تک نہیں ہوئی۔“

ام کلثوم نے بیٹھے، بیٹھے اپنے دونوں بازو اپنے ارد گرد یوں لپیٹ لئے جیسے اپنے بڑھتے ہوئے جسم کو ان کی نظروں سے چھپانا چاہتی ہو۔

”چل اٹھ چل کر دو پٹا اوڑھ اور کنگھی کر لے۔“

بڑی آپا نے کہا تو اس نے ایسی نظروں سے انہیں دیکھا جیسے کوئی ڈوبتا ہوا شخص کنارے پر کھڑے ہوئے شخص کی طرف دیکھتا ہے لیکن بڑی آپا کی آنکھوں میں سرد مہری اور بیگانگی تھی، جیسے وہ اس بات سے قطعی بے خبر ہوں کہ وہ ڈوب رہی ہے۔ اس کا سارا جسم ٹھنڈے ٹھنڈے پسینے میں بھیگ گیا اور ہاتھوں پیروں سے جان جاتی رہی اسے لگا جیسے کوئی ان دیکھے ہاتھ اس کا گلا گھونٹ رہے ہوں۔ اس نے بے اختیار اپنے ہاتھ گلے پر رکھ لئے اور زور سے چلانا چاہا لیکن اس کی آواز نہ نکل سکی اور بڑی آپا اس کی اس کیفیت سے بے خبر عبد المتین کو آوازیں دیتی ہوئی باہر نکل گئیں۔

”کلکلی کلیر دی“

پگ میرے ویردی“

وہ پیو کا ہاتھ تھامے لٹو کی طرح گھوم رہی تھی اور رفتہ رفتہ اس کے قدموں میں تیزی آتی جا رہی تھی اور قدموں کی تیزی کے ساتھ آواز بھی اونچی ہوتی جا رہی تھی

اونچی اور اونچی۔

ویردی منکیدی آئی

چھن چھن کر بندی آئی

اس کا سر چکرانے لگا ارد گرد کی چیزیں آنکھوں کے سامنے دائروں کی طرح گھومنے لگیں مگر وہ پیو کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے دیوانوں کی طرح کلکلی ڈال رہی تھی اور پھر ہمیشہ کی طرح وہ دھب سے نیچے گر گئی۔

دونوں ہاتھوں سے اپنے گھومتے ہوئے سر کو تھامتے ہوئے اس نے آنکھیں کھولیں تو بڑی آپا اسے بازوؤں سے پکڑ کر جھنجھوڑ رہی تھیں اور وہ چارپائی کے پاس نیچے زمین پر گری ہوئی تھی۔

”ام، ام۔“

”جی۔ جی بڑی آپا۔“ اس نے چاروں طرف دیکھا۔

”ماسی رحمتاں کے تندور کے سامنے والا میدان۔ وہ اور پیو اور کلکلی سب کہاں چلا گیا۔“

”کیا ہوا تھا ماسو تے میں چارپائی سے گر پڑی ہو شاید۔“

”جی!“

وہ اٹھ کر بیٹھ گئی اور اسے یاد آگیا کہ وہ یہاں بیٹھی ان دو بازیوں کے متعلق سوچ رہی تھی جو کچھ کھیلتے ہوئے پیو نے اس پر چڑھا رکھے تھے کہ پھر بجلی بند ہو گئی اور گرمی سے گھبرا کر وہ یونہی ذرا لیٹی تھی کہ پھر سو گئی اور اب شاید باہر دھوپ ڈھل گئی تھی کیونکہ باہر سے بچیوں کے قرآن شریف پڑھنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ محلے کی کچھ بڑی لڑکیاں جو مسجد نہیں جاتی تھیں سہ پہر میں بڑی آپا کے پاس پڑھنے آ جاتی تھیں۔ اس نے تو آٹھ برس کی عمر میں ہی قرآن شریف ختم کر لیا تھا۔ بڑی آپا اسے ٹھیک ٹھاک بیٹھے دیکھ کر باہر چلی گئیں وہ اٹھ کر کھڑکی کے پاس آگئیں یقیناً پیو اور دوسرے

بچے کھیلنے آگئے ہوں گے اس نے جھجکتے ہوئے کھڑکی کھولی، یہ کھڑکیاں ہمیشہ بند ہی رہتی تھیں کیونکہ میاں جی کا یہی حکم تھا اور اگر میاں جی نے دیکھ لیا تو؟ اس نے خوف سے ایک جھرجھری سی لی۔ مگر شوق خوف پر غالب آگیا تھا۔ سامنے ہی ماسی رحمتاں کا تندور تھا اور میدان میں بچے اکٹھے ہو رہے تھے۔ کچھ بچے دائرہ بنائے بیٹھے تھے۔ اور کوئی سرخ کپڑوں والی بچی دائرے کے ارد گرد بھاگ رہی تھی۔ اس نے اپنے کان آوازوں سے لگا دیئے، اگرچہ اتنی دور سے آواز اس تک ٹھیک طرح سے نہیں آرہی تھی لیکن آوازیں تو اس کے کانوں میں گونج رہی تھیں۔ اس کے ہونٹ بھی ہلنے لگے۔

”گولڑہ چھپا کی جمرات آئی اے۔“
 اُس نے اپنے رخسار کھڑکی کی جالی سے نکالے۔
 ”کسی کڑی منڈے دی شامت آئی اے۔“

اور پھر کسی نے ہاتھ پیچھے کر کے اپنی پیٹھے پڑا ہوا دوپٹا اٹھا لیا اور پھر سب میدان میں بھاگنے لگے۔ اس کے پاؤں میں سنناہٹ ہونے لگی۔ وہ بھی بھاگنا چاہتی تھی ان سب کے ساتھ مل کر۔ لیکن میاں جی کہتے ہیں وہ بڑی ہو گئی ہے۔
 اس نے اپنے آپ کو تنقیدی نظروں سے دیکھا۔
 ”کیا میں بڑی ہو گئی ہوں۔“

اور پھر اس کا قد بڑھنے لگا اور بڑھتے بڑھتے چھت سے جا لگا۔
 ”نہیں۔ نہیں میں بڑی نہیں ہونا چاہتی۔“

وہ بے آواز چیخی اور اس نے خوف زدہ ہو کر آنکھیں بند کر لیں۔ اور جب اس نے دوبارہ آنکھیں کھولیں تو اسے بڑا اطمینان ہوا کہ وہ بڑی نہیں ہوئی تھی وہ تو چھوٹی تھی ان سب بچوں کی طرح جو باہر ابھی تک میدان میں کھیل رہے تھے۔ البتہ کھیل بدل گیا تھا۔ بچے سارے میدان میں بکھر گئے تھے پھر بوبی بھاگتی ہوئی کھڑکی کے بالکل نیچے

آکھڑی ہوئی۔“ اس نے دیکھا اس کے ہاتھ میں مٹی کے کسی ٹوٹے ہوئے برتن کا ٹکڑا تھا جسے وہ ٹھیکری کہتے تھے اور وہ کونسلے سے اس پر جلدی جلدی لکیریں ڈال رہی تھی۔
 ”بوبی۔ بوبی۔“

اس نے کئی آوازیں دیں وہ اسے بتانا چاہتی تھی کہ وہ اس ٹھیکری کو کہاں چھپائے اسے بہت سی پوشیدہ جگہیں بتا تھیں جہاں اس کے چھپائے ہوئے کاغذ اور ٹھیکریاں کوئی نہیں ڈھونڈ سکتا تھا۔ مگر بوبی نے اس کی آواز نہیں سنی تو وہ بھاگتی ہوئی باہر چلی گئی۔ گھڑونچی کے پاس سے یقیناً اس کی آواز باہر جا سکے گی۔ گھڑونچی پر تین گھڑے پڑے تھے اور پیچھے اینٹیں اس طرح لگی ہوئی تھیں کہ جالی بنی ہوئی تھی وہ باہر جھانکنے لگی مگر کوئی نظر نہیں آ رہا تھا البتہ ان کی آوازیں آرہی تھیں، شونخ زندگی سے بھرپور آوازیں۔
 چوچ گلیاں

دو تیریاں دو میریاں

اس نے بے بسی سے چاروں طرف دیکھا اور اس کا حلق خشک ہونے لگا حتیٰ کہ اس میں کانٹے سے پڑنے لگے۔ اس نے گھڑے پر پڑے ہوئے کٹورے کو اتار اور یکے بعد دیگرے ایک دو تین نہ جانے کتنے کٹورے پی گئی، اس کا پیٹ پھول گیا اور پانی جیسے واپس آنے لگا۔ لیکن حلق میں اسی طرح کانٹے پڑے ہوئے تھے تب ہی بڑی آپا نے جو صحن میں پیڑھی پر بیٹھی ہوئی بچیوں کو قرآن شریف پڑھا رہی تھیں اسے دیکھ لیا۔

”ام، ام وہاں کیا کر رہی ہو ادھر آ۔“

”جی۔“ وہ سر جھکائے ان کے پاس آکر کھڑی ہو گئی۔

”چل آکر قرآن شریف پڑھ لے۔“

”مگر بڑی آپا میں تو چھ دفعہ ختم کر چکی ہوں۔“

”پھر بھی ہر روز پڑھا کرو بھول جاؤ گی۔ صبح تو تمہیں اسکول جانے کی جلدی ہوتی

ہے اسی وقت کم از کم پڑھ لیا کرو ورنہ جانتی ہو اگر بھول گئی نا تو روز محشر اندھی ہو کر اٹھائی جاوے گی۔“

”اچھا تو جو قرآن شریف نہیں پڑھتا وہ قیامت کے روز اندھا ہو کر اٹھایا جاتا ہے۔“ وہ کانپ گئی اور اندر سے قرآن شریف اٹھالائی اور باقی بچیوں کے ساتھ ہی صحن میں زمین پر بیٹھ گئی اور قرآن شریف رحل پر رکھ کر ہل کر پڑھنے لگی۔

الف۔ لام۔ م۔ ذلک

”گولڑہ چھپا کی جمرات آئی ہے۔“

”نہیں۔ نہیں۔“ اس نے زور سے سر ہلایا

”لا۔“

چچو چیچ گولیاں۔

اس نے بے بسی سے بڑی آپا کی طرف دیکھا لیکن پیڑھی خالی تھی۔ بڑی آپا شاہ اٹھ کر کچن میں چلی گئی تھیں۔ اس نے لڑکیوں کی طرف دیکھا سب زور زور سے ہل کر پڑھ رہی تھیں۔ اس نے چپکے سے قرآن شریف کو جزدان میں لپیٹا اور رحل پر رکھ کر کھڑی ہو گئی اور ایک عجیب سی مقناطیسی کشش سے کھینچتی ہوئی دروازے تک آئی اور پھر ہولے سے کواڑ کھولتی ہوئی باہر نکل آئی۔ دروازے کو اپنے پیچھے بند کر۔ ہوئے وہ وہیں دروازے سے پیٹھ لگا کر کھڑی ہو گئی اور بچوں کی طرف دیکھنے لگی سامنے ہی لائن میں پیو، بوٹی، گلاب، جگنو چاند ہاتھوں میں ہاتھ پکڑے کھڑے تھے اور رہے تھے۔

”ہم تم کو لینے آئیں گے آئیں گے ٹھنڈے موسم میں۔“

اسے لگا جیسے وہ سب اسے بلارہے ہوں۔

”اور اس کے بدلے کس کو بھیجو گے بھیجو گے ٹھنڈے موسم میں۔“ اس۔

کانوں میں سیٹیاں سی بجنے لگیں۔

”ہم اس کے بدلے ام کو بھیجیں گے بھیجیں گے ٹھنڈے موسم میں۔“

”میں آرہی ہوں۔“ وہ سحر زدہ سی چلتی ہوئی ان کے پاس پہنچ گئی اور پھر وہ بھی ان میں شامل ہو گئی۔ اس کے ماتھے پر پسینے کے قطرے تھے۔ سرخ و سپید رنگت اور بھی سرخ ہو گئی تھی اور وہ بڑی سرخوشی کے عالم میں گائے جارہے تھے سب کے ساتھ مل کر ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے اور پھر اس کے ساتھیوں نے اس کا نام لیا اس کا ہاتھ ٹپو کے ہاتھ میں تھا اور وہ دونوں زور لگا رہے تھے، پھر ٹپو نے اسے کھینچ لیا تھا سب ہنس رہے تھے لیکن اس کی آنکھوں کے سامنے دھواں بھرنے لگا۔ میاں جی مسجد سے آرہے تھے۔ ان کی وہ سرخ سرخ آنکھیں اس نے کبوتر کی طرح خوف سے آنکھیں بند کر لیں جگنو اور بے بی کی آڑ میں چھپنا چاہا لیکن میاں جی تو اسے دیکھ رہے تھے اور پھر میاں جی نے قریب آکر اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور پھر شاید وہ اسے گھسیٹتے ہوئے اندر لائے تھے۔ اسے کچھ یاد نہیں تھا سوائے اس کے کہ اس کی ناگلوں میں سے جان نکل گئی تھی اسے تو یہ بھی یاد نہیں تھا کہ ان کے بید کی چھڑی اس کے جسم کے کس کس حصے پر پڑی تھی۔ اسے تو جب ہوش آیا تو اس کا سارا جسم دکھ رہا تھا اور بڑی آپا اور چھوٹی آپا اس کے پاس بیٹھی ہوئی تھیں چھوٹی آپا کے چہرے پر تاسف تھا اور ان کی آنکھوں میں مہربان سی نرمی جبکہ بڑی آپا کا چہرہ سپاٹ تھا۔ ہر قسم کے تاثر سے عاری۔

”اسے کیا ہوا تھا؟“

اس نے سوچا اور پھر درد کی ایک لہر سی سارے جسم میں اٹھی۔ میاں جی نے اسے مارا تھا۔ وہ باہر گلی میں کھیل رہی تھی۔

مگر وہ کیا کھیل رہی تھی اور ہزار کوشش کے باوجود اسے یاد نہ آیا کہ وہ کیا کھیل رہی تھی اور کیا بول تھے جو وہ گارہی تھی پھر اس نے وہ سارے کھیل یاد کرنے کی کوشش کی

جو وہ کھیلنا کرتی تھی لیکن کوئی بول بھی اس کے ذہن میں نہ آیا۔ شاید میاں جی نے اس پر کچھ پڑھ کر پھونک دیا ہے اس نے سوچا تب اس کا دل چاہا وہ بڑی آپا سے پوچھے کہ جب کچھ کھیلتے ہیں یا پھر کلکلی ڈالتے ہیں تو کیا گاتے ہیں مگر بڑی آپا کو کیا پتا اور انہیں تو کسی بات کا پتا ہی نہیں ہوتا۔ اس نے بے بسی سے بڑی آپا کی طرف دیکھا اور خود ہی سوچتی رہی مگر بے فائدہ کچھ یاد نہ آیا۔ اسے لگا جیسے اس کے دماغ کا ایک حصہ مفقود ہو گیا ہے اور اس نے آنکھیں بند کر کے چادر اپنے اوپر اوڑھ لی اور گرم گرم آنسو اس کی بند آنکھوں سے نکل کر رخساروں کو بھگوتے ہوئے تنکے میں جذب ہونے لگے۔

اور چھوٹی آپا نے اس کا دکھ اپنے دل میں محسوس کیا شاید وہ رورہی ہے اور اس نے میاں جی کی مار کو بہت محسوس کیا ہے۔ شاید وہ کچھ مختلف ہے ہم سب سے۔

انہوں نے سوچا۔

اور یہ کہ اس میں کچھ میری غلطی بھی ہے۔

یہ وہی تو تھیں جنہوں نے اس قفس کی چڑیا کو آزاد فضاؤں کی جھلک دکھائی تھی وہی تو بڑی آپا کے منع کرنے کے باوجود اسے کھیلنے کے لئے باہر میدان میں بھیج دیا کرتی تھیں اور کیا یہ واقعی ان کی غلطی تھی جبکہ انہوں نے تو سوچا تھا کہ وہ ان کی طرح گھر میں بند نہ رہے۔ باہر کی دنیا دیکھے اور کچھ جان لے وہ سب کچھ جو وہ نہیں جانتی تھیں اور وہ پچھتاوے جو قسمت نے ان کی جھولی میں ڈال دیئے تھے اسے یہ پچھتاوے نہ ملیں مگر یہ تو انہوں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ میاں جی کی بیٹی ہے اور میاں جی بھلا کب چاہیں گے کہ ان کی بیٹی محلے کی عام لڑکیوں کے ساتھ گلی میں کھیلے کودے اور بے پردہ پھرے۔

خود انہیں یہ تک پتا نہیں تھا کہ گلی میں بچے بچیاں کیا کھیلتے ہیں اور وہ تو سات برس کی عمر میں ہی گھر سے کبھی باہر نہیں نکلی تھیں۔ ان کے دادا حاجی صاحب کی شہر میں بڑی عزت تھی۔ وہ اس چھوٹے سے شہر کی جامع مسجد میں امام تھے ان کا گھر انا سارے

شہر میں بڑا معتبر تھا۔ شہر میں ان کی دو تین دکانیں بھی تھیں جہاں ان کے بیٹے حافظ جی اور وہ خود بیٹھا کرتے تھے حاجی صاحب کی وفات کے بعد ان کے بیٹے حافظ جی امام مسجد بنے وہ بھی حاجی صاحب کی طرح بڑے پرہیزگار تھے ان کے دو بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں۔ بڑے بیٹے تھے میاں جی ان سے چھوٹی بڑی آپا پھر چھوٹی آپا تھیں اور ان سے پورے آٹھ برس چھوٹے عبدالمتمین تھے۔ گھر کے اندر کا ماحول بڑا مہذب ہی تھا۔ حافظ جی بڑی سخت طبیعت کے تھے۔ بچپن سے ہی سب باقاعدگی سے نماز پڑھتے تھے۔ لڑکے تو اسکول جاتے تھے لیکن لڑکیوں نے اسکول یا مدرسہ کی شکل تک نہیں دیکھی تھی۔

حسن اور خوبصورتی تو جیسے حافظ جی کے گھرانے کی میراث تھی۔ سرخ و سپید رنگتیں بڑی غلامی آنکھیں اونچے لمبے قدر عب حسن کچھ اتنا کہ نگاہ چہرے پر نہ ٹھہرتی تھی۔

بڑی آپا، ابھی تیرہ برس کی بھی نہ ہوئی تھی کہ گھر میں بے شمار رشتے آنے لگے اور یوں حافظ جی نے دیکھ بھال کر دونوں بہنوں کو ایک ہی گھرانے میں رخصت کر دیا تھا لیکن نئی زندگی انہیں راس نہ آئی۔ اس نئی زندگی کے بارے میں انہیں کچھ علم نہ تھا اور نہ ہی دادی یا ماں نے انہیں کوئی نصیحت کی تھی۔ چھوٹی آپا گیارہ برس کی اور بڑی آپا تیرہ برس کی تھیں وہ اس ماحول میں ایڈجسٹ نہ ہو سکیں۔ حافظ جی کے گھر اور اس گھر کے ماحول میں بہت فرق تھا۔ اگرچہ نورالامین اور افضل علی صرف مڈل پاس تھے لیکن خوش حالی تھی۔ ٹی وی اور فلموں نے انہیں خاصا ماڈرن اور بے باک بنا دیا تھا۔ پھر بیویوں کا پاگل کر دینے والا حسن وہ چاہتے تھے کہ ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے وہ ان کے ساتھ گھومیں پھریں۔ لوگ دیکھیں اور رشک کریں چھوٹی آپا ان نئے راستوں پر چل نہ پارہی تھیں وہ بار بار ٹھوکر کھا کر گریں انھیں اور پھر گر گئیں۔ نورالامین کو دیکھتے ہی ان پر گھبراہٹ طاری ہو جاتی تھی ان کا دل چاہتا وہ کہیں چھپ جائیں بھاگ جائیں۔

انہوں نے کبھی کوئی کتاب، رسالہ یا کہانی نہیں پڑی تھی، سوائے قرآن شریف

کے جو بغیر ترجمے کے پڑھا تھا حتیٰ کہ بہشتی زیور بھی نہیں پڑھا تھا اور نور الامین ایسی ایسی باتیں کرتا کہ وہ چھوٹی موٹی بن جاتیں اور اب اٹھارہ برس بعد بھی انہیں نور الامین کی کوئی بات یاد آتی تو وہ سرخ ہو جاتیں۔ وہ دونوں ہی نئے ماحول سے سمجھوتا نہ کر سکیں تھیں۔ یا پھر افضل علی اور نور الامین ان کی ست رفتاری سے اکتا گئے تھے کہ چھ ماہ بعد ہی طلاق لے کر آگئیں دونوں۔ شاید وہ کچھ صبر کر لیتے مگر ایسا نہ ہوا اور حافظ جی مارے دکھ کے بیمار پڑ گئے وہ چاہتے تھے کہ دوبارہ ان کا نکاح کر دیں کہ یہی اللہ کے رسول کا حکم تھا، لیکن چھوٹی آپا نے تو خود کو کروں میں بند کر لیا تھا بہت کم بات کرتیں۔ سہمی سہمی اور خوف زدہ سی رہتیں شادی کا ذکر آتا تو رونا شروع کر دیتیں۔

پھر بھی حافظ جی نے اپنی سی کوشش جاری رکھی، کئی رشتے آئے مگر کوئی ذات برادری کا نہیں تھا اور کوئی دیدار نہیں تھا۔ پھر بھی بڑی آپا کا ایک اچھا اور برادری کا لڑکا دکھ کر دوبارہ نکاح کر دیا گیا۔ لیکن تقدیر کی بات تھی رخصتی سے پہلے ہی بڑی آپا بیوہ ہو گئیں اور یوں وہ اپنی تقدیر پر شاکر ہو کر بیٹھ گئیں۔ پھر میاں جی کی بھی شادی ہو گئی اور حافظ جی نے دنیا سے رخت سفر باندھا۔ اب میاں جی گھر کے سربراہ تھے اور امام مسجد بھی۔ حافظ جی کی طرح میاں جی بھی طبیعت کے بڑے سخت تھے۔ بلکہ ان سے بھی کچھ زیادہ ہی تھے۔ ہر بات پر سختی سے عمل کرواتے۔ گھر میں کوئی غیر بچہ بھی نہیں آسکتا تھا اگر وہ کچھ نرم پڑتے تھے تو چھوٹی آپا کے سامنے، انہیں اپنی اس چھوٹی بہن سے بڑی محبت تھی۔ پتا نہیں کیوں وہ ان کی کوئی بات نہیں ٹال سکتے تھے۔ حافظ جی کے مرنے کے بعد انہوں نے دونوں بہنوں کی شادیاں کرنے کی کوشش کی تھی ابھی ان کی عمریں ہی کیا تھیں۔ لیکن تقدیر نے یہ یادری نہیں کی۔

خود میاں جی کے تین بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔ بڑے بیٹے عبدالشکور پھر ام کلثوم پھر عبدالحفیظ اور سب سے چھوٹے عبدالماجد تھے۔ چھوٹے بیٹے کی پیدائش پر ان کی بیوی

وفات پا گئی تھیں۔ انہوں نے دوبارہ شادی نہیں کی تھی زیادہ وقت عبادت میں گزرتا تھا بیوی کی وفات کے بعد عبدالماجد کو انہوں نے چھوٹی آپا کی گود میں ڈال دیا تھا۔
”امت الحبیب ہم آپ کا گھر تو نہ بسا سکے البتہ عبدالماجد آج سے آپ کا بیٹا ہے۔
اس اپنے بڑھاپے کا سہارا بنائیے گا۔“

اور چھوٹی آپا جو تب صرف چوبیس برس کی تھیں اور زیادہ تر اپنے کمرے میں رہتی تھیں اور اتنی سی عمر میں بھی ان کے چہرے پر کچھ ایسا جلال اور نور تھا کہ میاں جی کی نگاہ بھی ان پر نہ ٹھہرتی تھی۔ اکثر نفل پڑھتی رہتی تھیں۔ انہوں نے عبدالماجد کو سینے سے تو لگا لیا مگر میاں جی سے یہ وعدہ بھی لے لیا کہ وہ عبدالماجد کے معاملے میں دخل نہیں دیں گے۔ اور وہ اپنی مرضی سے اس کی تربیت کریں گی۔ اور میاں جی نے ان کی بات مان لی۔

”ٹھیک ہے امت الحبیب عبدالماجد آپ کا بیٹا ہے آپ جیسے چاہیں اس کی تربیت کریں۔“

اور بڑی آپا نے بھابی کے مرنے کے بعد آپ ہی آپ خود بخود ہی سارا گھر سنبھال لیا تھا۔

چھوٹی آپا نے چار سالہ عبدالماجد کو کے۔ جی میں داخل کروایا تو ام کلثوم کو بھی اسکول بھیجنے کی سفارش کر دی۔ اس دور میں تعلیم بہت ضروری ہے میاں جی زیادہ نہیں تو تھوڑا بہت لڑکیوں کو بھی پڑھ لینا چاہئے۔ تاکہ انہیں اپنے اچھے برے کی پہچان ہو جائے پھر ہمارے پیارے رسول اللہ ﷺ نے بھی علم حاصل کرنے کی تلقین کی ہے۔“ اور میاں جی نے چھوٹی آپا کی بات مان لی۔

اور یوں آٹھ سالہ ام کلثوم میونسپل اسکول میں پہلی جماعت میں داخل ہو گئی۔ اور چھوٹی آپا نے بڑا اطمینان محسوس کیا وہ دراصل نہیں چاہتی تھیں کہ ام کلثوم ان کی

طرح زندگی کے کسی دور میں ناکام رہ جائے۔ ان کی طرح کسی نور الامین کا ساتھ نہ دے سکے۔ اس میں اتنا حوصلہ ہو کہ وہ اپنے شوہر کے ساتھ ساتھ بھاگ سکے۔ اور وہ بھاگنا تو کجا ساتھ چل بھی نہ سکی تھیں۔ کبھی کبھی اپنے تنہا کرے میں بیٹھے بیٹھے انہیں نور الامین یاد آ جاتا اس کی باتیں یاد آتیں تو وہ بے چین ہو جاتی تھیں۔ وہ خود کو عبدالماجد کے کسی کام میں مصروف کر لیتیں۔ لیکن بے چینی پھر بھی ختم نہ ہوتی پھر وہ قرآن شریف کھول لیتیں۔ لیکن دل یو نہی مضطرب رہتا اس لئے تو انہوں نے ام کلثوم کے لئے راہیں ہموار کرنے کی کوشش کی تھی تاکہ راستے اس کے لئے بالکل اجنبی نہ ہوں۔ اجنبی راہوں میں گرنے کا زیادہ خطرہ ہوتا ہے مگر کچھ غلط ہو گیا تھا شاید۔ ام کلثوم کے خون میں کچھ بغاوت تھی جو وہ میاں جی کے حکم کی پروا کئے بغیر باہر نکل گئی اور اب احتجاج کے طور پر رو رہی تھی۔

”ام سو گئی ہو کیا؟“

بڑی دیر بعد چھوٹی آپا نے ہمیشہ کی طرح بڑی نرمی اور آہستگی سے پوچھا۔
چادر کے اندر ہی اندر ام کلثوم نے ہتھیلیوں سے رگڑ کر آنسو صاف کیے اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔

”نہیں تو۔“

چھوٹی آپا نے اس کے سرخ سرخ پونوں اور دکتے رخساروں کو دیکھتے ہوئے سوچا۔
پتا نہیں ام کلثوم کے لئے کیا بہتر تھا یہ کہ بچپن سے ہی وہ گھر کے اندر بند رہتی یا پھر یہ کہ۔

”چھوٹی آپا۔“ اس نے انہیں بلایا۔

”ہاں کیا بات ہے ام؟“

”چھوٹی آپا آپ کو پتا ہے جب کچھ کھیلتے ہیں تو ساتھ ساتھ میں کیا گاتے جاتے ہیں۔“

”مگر میں نے تو کبھی کچھ نہیں کھیلے۔ ام مجھے تو نہیں پتا ساتھ میں کیا گاتے ہیں۔“
چھوٹی آپا نے حیرانی سے کہا تو اس نے اپنی بڑی بڑی آنکھوں کو حیرت سے پھیلایا۔
”کبھی نہیں کھیلے چھوٹی آپا جب آپ چھوٹی سی تھیں تب بھی نہیں۔“
”تب بھی نہیں ام۔“

”پھر میں کیا کروں چھوٹی آپا مجھے تو بالکل یاد نہیں آرہا اور میں نے ابھی پینو کے بازو بھی اتارنے ہیں آپ کو پتا ہے جو بازو نہ اتارے نا اس کے سر پر ساری زندگی بوجھ رہتا ہے۔“ بازو ”کا بوجھ۔“

وہ ایک دم ہی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی چھوٹی آپ کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ وہ کیا کہہ رہی ہے شاید اس کا علم ان سے کچھ زیادہ تھا مگر وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے پاس آ گئیں۔

”ام۔“ انہوں نے اسے گلے لگا لیا۔

”پگلی مت رو ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں پر بھی کوئی روتا ہے۔“

”یہ چھوٹی بات نہیں ہے شاید میرا دماغ ناکارہ ہو گیا ہے مفلوج ہو گیا ہے۔“ اس نے سوچا اور ان کے سینے پر سر رکھے روتی چلی گئی۔ اور روتے روتے یکایک اسے یوں لگا جیسے کوئی اُن دیکھے ہاتھ اس کا گلا گھونٹ رہے ہوں۔ اس نے بے چینی سے اپنا گلا مسلا اور بے بسی سے سراٹھا کر چھوٹی آپا کی طرف دیکھا۔ اور پھر نڈھال سا چوکرا اپنا سر ان کی گود میں رکھ دیا۔

”چھوٹی آپا مجھے ڈر لگ رہا ہے۔“

”ڈرتے نہیں ام گڑیا۔“

چھوٹی آپا پیار سے ہولے ہولے اسے تھپکنے لگیں۔



”میں برقع پہن کر اسکول نہیں جاؤں گی بڑی آپا۔“

اگلی صبح جب بڑی آپا نے اسے برقع پہن کر اسکول جانے کے لئے کہا۔ تو ام کلثوم بستہ ایک طرف رکھ کر بیٹھ گئی۔

”کیوں؟“

بڑی آپا نے اپنی لمبی گھنی پلکوں والی آنکھیں اٹھا کر سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔
”میری جماعت کی کوئی لڑکی برقع نہیں پہنتی وہ سب میرا مذاق اڑائیں گی اور پتا ہے وہ میڈم خلیل ہیں نادہ مس جعفری سے روز کہتی ہیں کہ مس جعفری یہ چھوٹی سی لڑکی اتنا اڑھائی گز کا دوپٹہ اوڑھ کر آتی ہے اسے سمجھائیں۔“
وہ بالکل بڑے بوڑھوں کی طرح بڑی آپا کو سمجھا رہی تھی۔

”اور بڑی آپا برقع تو بڑی جماعت کی لڑکیاں پہنتی ہیں میں تو ابھی دوسری جماعت میں ہوں۔ میں بھی جب بڑی جماعت میں جاؤں گی تو پہن لوں گی۔“

”لیکن یہ میاں جی کا حکم ہے ام کلثوم اور میاں جی حکم عدولی پسند نہیں کرتے۔“
”جی بڑی آپا۔“

اس کی گلابی رنگت یکدم پیلی پڑ گئی اور اس کے ہاتھ بے اختیار اپنے بازوؤں کو سہلانے لگے۔ جہاں اب بھی ہلکی ہلکی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔

پھر بھی اس نے ہمت کر کے بڑی آپا کو قائل کرنا چاہا مگر بڑی آپا میں برقع پہن کر کیسے چلوں گی۔ میں تو گر جاؤں گی۔“

وہ روہانسی ہو گئی۔

”اور لڑکیاں بھی تو مجھ پر نہیں گی۔“

”اچھا تو پھر یوں کرو مت جاؤ اسکول۔“ بڑی آپا کو آسان حل یہی نظر آیا۔

”مگر پھر میں پڑھوں گی کیسے؟“

”نہ پڑھنا۔“ بڑی آپا ٹھکر چلی گئیں۔

”ٹھیک ہے نہیں پڑھوں گی۔ نہ سختی لکھنی پڑے گی نہ پہاڑے یاد کرنے پڑیں گے خوب مزہ آئے گا۔ سارا دن کھیلوں گی۔“ وہ بستہ وہی چھوڑ کر بڑی آپا کے پیچھے پیچھے کچن میں آگئی۔

”ٹھیک ہے بڑی آپا میں اسکول نہیں جاؤں گی۔“

اس نے فیصلہ تو کر لیا لیکن گھر میں وقت گزرنا مشکل ہو گیا۔ حفیظ اور ماجد صبح اسکول چلے جاتے چھوٹی آپا دیر تک قرآن شریف پڑھتی رہتیں۔ بڑی آپا منزل ختم کر کے کچن میں گھس جاتیں۔ عبدالحفیظ اور ماجد اسکول سے آتے تو کھانا کھا کر مسجد چلے جاتے وہ بولائی بولائی سی پھر پرتی رہتی۔ وہ تو دو دن میں ہی گھبرا گئی تھی اور پھر چھوٹی آپا نے اسے بہت سمجھایا۔

”دیکھو ام اسکول جانا مت چھوڑو۔ اور پھر برقع پہننا کوئی بری بات نہیں ہے اور مسلمان لڑکیاں پردہ کرتی ہی ہیں بس میاں جی نے زرا جلدی کی ہے۔“ اور ام کلثوم کی سمجھ میں چھوٹی آپا کی بات آگئی اور یوں وہ اگلے دن سے برقع پہن کر اسکول جانے لگی۔ شروع شروع میں تو وہ گیٹ کے پاس ہی برقع اتار کر بستے میں رکھ لیتی تھی لیکن پھر بھی کچھ لڑکیوں نے اسے دیکھ لیا اور اس کا مذاق اڑانے لگیں۔ دوسری جماعت کی چھوٹی چھوٹی بچیاں حیرت سے پوچھتیں۔

”ام تم برقع پہن کر آتی ہو؟“ اور پھر ایک دوسرے کو بتاتیں۔

”ام کلثوم مس کی طرح برقع پہن کر آتی ہے۔“ اور پھر منہ چھپا چھپا کر ہنستیں اور وہ چڑ جاتی تب ایک روز تنگ آکر اس نے مس جعفری سے ان کی شکایت کر دی اور مس جعفری نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کلاس کو سمجھایا کہ وہ کوئی عام لڑکی نہیں ہے بلکہ میاں جی کی بیٹی ہے جو بڑے معزز اور نیک بزرگ ہیں اور انہیں چاہئے کہ وہ اس کا

احترام کریں نہ کہ اس کا مذاق اڑائیں۔

مس جعفری نے کلاس کی بچیوں کو تو سمجھا دیا لیکن خود اسی شام گھر آکر بڑی آپا سے شکوہ کیا۔

”اتنا ظلم تو نہ کریں آپا جی۔ اتنی ذرا سی بچی کو آپ نے برقع اوڑھا دیا ہے کسی دن کسی ٹانگے، ریڑھے کے نیچے آجائے تو پھر۔“

لیکن بڑی آپا انہیں صرف بے بسی سے دیکھ کر رہ گئیں ان کے اختیار میں کیا تھا اگر وہ میاں جی سے کہتیں بھی تو میاں جی یہی کہتے۔

”چلو مت بھیجو اسکول اسے۔“

اور اسے تو جنون تھا اسکول جانے کا۔ اور اب تو وہ ان لڑکیوں کے ہنسنے پر چڑتی بھی نہیں تھی اس کے اندر ایک احساس تفاخر پیدا ہو گیا تھا کہ وہ عام لڑکی نہیں ہے۔ ان سب سے مختلف اور اونچی ہے اس لئے برقع پہنتی ہے۔ بڑی لڑکیوں کی طرح مس کی طرح۔

وہ جتنی دیر اسکول میں رہتی اسے عجیب سی خوشی اور آزادی کا احساس ہوتا لیکن گھر آتے ہی بے چینی اور اضطراب اس کی جگہ لے لیتے۔ شام ہوتے ہی کبھی وہ گھڑونچي کی جالی کے پاس کھڑی ہو جاتی اور کبھی اندر کھڑکی کے پاس کھڑی ہو جاتی ایسی ہی ایک شام کو اس نے کھڑکی سے آواز دے کر پیٹو کو بلا لیا۔

”آؤ پیٹو کھیلتے ہیں۔“

”چلو، مگر تم باہر کیوں نہیں آتیں سب کے ساتھ کھیلتے سب روز کہتے ہیں کہ ام کو بلاؤ۔“

”میاں جی نے منع کر دیا ہے نا۔ تم آجایا کر دنا ہمارے گھر مل کر کھیلیں گے۔“

”اچھا۔“ پیٹو نے وعدہ کر لیا کہ وہ آیا کرے گی۔

اور پھر وہ اس کا ہاتھ تھامے برآمدے میں آگئی۔

”چل کچھ کھیلتے ہیں اور پھر میں نے تمہارے دو بازے، بھی اتارنے ہیں یاد ہے نا تمہیں۔“

”ہاں۔“

پیٹو کو یاد آگیا اور اس نے فراک کی جیب سے گولیاں نکالیں۔

”کچ دیاں کچیاں“

پیٹو نے کھیلنا شروع کیا۔

وہ دل ہی دل میں اس کے بول دہرانے لگی۔ اور تب ہی میاں جی تسبیح ہاتھ میں لئے اپنے کمرے کے دروازے سے باہر نکلے۔ ان کی نگاہیں زمین پر آلتی پالتی مار کر بیٹھی ہوئی ام کلثوم پر پڑیں۔ ام کلثوم کا سارا دھیان پیٹو کے تیزی سے حرکت کرتے ہوئے ہاتھوں پر تھا۔ کھیلتے کھیلتے پیٹو نے سر اٹھا کر دیکھا۔

”تمہارے میاں جی ام۔“

”میاں جی۔“

وہ سہم کر کھڑی ہو گئی اور پھر میاں جی کا ہاتھ اٹھا اور اس کے رخساروں پر نشان چھوڑ گیا۔

”یہ کیا شیطانی کھیل کھیل رہی ہو۔“

پیٹو نے جلدی جلدی اپنی گولیاں سمیٹیں اور بھاگ گئی۔ میاں جی غصے سے اسے دیکھتے ہوئے تسبیح ہلاتے باہر نکل گئے اور وہ میاں جی کا تھپڑ کھا کر روئی نہیں بلکہ رخسار پر ہاتھ دھرے دھرے اس نے بڑی مایوسی سے سوچا۔

اب پیٹو اس کے گھر کبھی کھیلنے نہیں آئے گی اور اس کے سر پر سے بازوؤں کا بوجھ کبھی نہیں اترے گا۔

اب اس نے میاں جی کے خوف سے کھڑی اور جالی سے جھانکنا چھوڑ دیا تھا۔ لیکن

گرمیوں کی لمبی دوپہریں کاٹنے نہ کنتیں۔ اسکول میں چھٹیاں ہو گئی تھیں اور گھر میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اسکول کی کتابیں اتنی بار پڑھ چکی تھی کہ اب پڑھنے کو دل نہیں چاہتا تھا، کہانیوں والی کتابیں اسے اچھی لگتی تھیں چھوٹی چھوٹی کہانیوں والی کتابیں۔ لیکن میاں جی نے ایک بار عبدالحفیظ کے ہاتھ میں ”شریر بونا“ جو وہ محلے کی لائبریری سے لایا تھا دیکھ کر اس کی اتنی مرمت کی تھی کہ کہانی پڑھنے کے تصور سے ہی وہ کانپ اٹھتی تھی۔

تب ایک روز دوپہر میں جب سب سو رہے تھے اس نے کپڑے کی کترنیں اکٹھی کر کے ایک منی سی گڑیاں بنالی پینو اور بوبی کے ساتھ کھیلنے ہوئے کئی بار اس نے گڑیا بنائی تھی۔ گڑیا سے کھیلنا اسے اچھا لگا تو اس نے گھر میں سے کئی پرانے اور نئے کپڑوں کی کترنیں اکٹھی کر لیں اور کسی ٹوٹی ہوئی پیالی کا ٹکڑا۔ کئی اور ٹوٹی پھوٹی چیزیں وغیرہ بھی جمع کر لیں اور اب مزے سے اپنی گڑیوں سے کھیل کرتی۔ اس نے تین چار گڑیاں بنالی تھیں کبھی کبھی وہ اپنے کھیل میں عبدالماجد اور عبدالحفیظ کو بھی شامل کر لیتی۔ اور کھیلنے کے بعد اپنی چیزیں سنجال کر گتے کے ڈبے میں رکھ دیتی۔ لیکن ایک روز یہ ننھی سی خوشی بھی اس سے چھین گئی۔ میاں جی نہ جانے کیا تلاش کر رہے تھے کہ ان کے ہاتھ اس کا یہ ڈبا لگ گیا۔ اور ڈبے میں چھوٹی بڑی کپڑے کی بنی ہوئی کئی گڑیوں کو دیکھ کر انہوں نے اتنے غصے سے ام کلثوم کو پکارا کہ قرآن شریف پڑھتی ہوئی چھوٹی آپا قرآن شریف یونہی رحل پر کھلا چھوڑ کر باہر نکل آئیں۔

ام کلثوم میاں جی کے سامنے کھڑے تھر تھر کانپ رہی تھی۔

”یہ گڑیاں تم نے بنائی ہیں ام کلثوم۔ گناہ عظیم کیا ہے تم نے۔ جان ڈالنی پڑے گی

اس میں اور روز محشر آگ میں جلائی جاؤ گی۔“

اور ام کلثوم زرد پڑ گئی اور اسے لگا جیسے اس کی ٹانگوں میں سے جان نکل رہی ہو

لیکن اس نے بمشکل سر اٹھا کر میاں جی کی طرف دیکھا۔

”آئندہ نہیں۔ گڑیوں سے کھیلوں گی میاں جی۔“

”جاؤ ان سب خرافات کو آگ لگا دو اور توبہ کر لو۔ وہ بڑا رحیم و کریم ہے۔“

”جی۔“

اس نے کانپتے ہاتھوں سے گتے کا ڈبا تھام لیا اور پھر اس کی محنت سے بنائی ہوئی گڑیاں آگ کی نذر ہو گئیں مگر اس کے دل پر ایک عجیب سا خوف طاری ہو گیا۔ وہ راتوں کو سوتے سوتے چیخ مار کر جاگ اٹھتی۔ اسے لگتا جیسے اسے دہکتی ہوئی آگ میں ڈالا جا رہا ہو اور جب اس کی چیخیں سن کر سب سے چھوٹی آپا، بڑی آپا، عبدالمعین، عبدالشکور اس کی چارپائی کے گرد اکٹھے ہو جاتے۔ تو اس کے حلق میں کانٹے سے پڑنے لگتے جیسے وہ ہفتوں سے مہینوں سے پیاسی ہو۔ اور وہ چھوٹی آپا کے سینے سے لگ کر لمبے لمبے سانس لینے لگتی۔

چھوٹی آپا کچھ پڑھ پڑھ کر اس پر پھونکتی رہتیں اور اسے بڑا سکون ملتا۔

اس کے یوں بار بار ڈر جانے کی وجہ سے چھوٹی آپا اسے اپنے کمرے میں ہی لے آئیں۔ اپنی عبادت سے فارغ ہو کر وہ اس سے ہولے ہولے نرم نرم لہجے میں باتیں کرتی رہتیں اس سے اسکول کی ایک ایک بات پوچھتیں اور یوں ہولے ہولے اس کا خوف کم ہوتا چلا گیا۔

یونہی وقت گزر رہا تھا اور ہر گزرتے دن کے ساتھ وہ سمجھدار اور سنجیدہ ہوتی چلی جا رہی تھی۔ اب اس کی عمر تقریباً گیارہ برس تھی اور وہ تیسری جماعت میں آگئی تھی لیکن وہ اپنی عمر سے کہیں زیادہ بڑی بڑی باتیں سوچنے لگی تھی اور اکثر چھوٹی آپا سے یوں بات کرتی جیسے وہ ان کی ہم عمر ہو۔ بڑی عقل مند اور سمجھ دار۔ چھوٹی آپا کو حیرت ہوتی۔ اس کی دوست اب صرف کتابیں تھیں اور ہر وقت پڑھنے کی وجہ سے وہ کلاس میں فرسٹ آنے لگی چھوٹی آپا کو اس کی کامیابی سے بڑی خوشی ہوتی تھی۔ عبدالماجد جو

اس سے چار برس چھوٹا تھا اور اس کے ساتھ ہی ماڈل اسکول میں نرسری میں داخل ہوا تھا اب وہ ان میں تھا اور عبدالحفیظ جو اس سے دو برس چھوٹا تھا چوتھی جماعت میں تھا۔ اس سے ایک گلاس آگے۔ لیکن چھوٹی آپا نے ماجد کو ہوم ورک کروانے کی ذمہ داری اسے سونپ دی تھی۔ وہ دونوں باقاعدگی سے رات کو چھوٹی آپا کے پاس بیٹھ کر اپنا اپنا کام کرتے لیکن عبدالحفیظ کو پڑھائی سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ وہ نظر بچا کر ادھر ادھر کھسک جاتا تھا۔ ابھی تک اس نے پورا قرآن شریف بھی حفظ نہیں کیا تھا اور اس بات پر اسے تقریباً روزانہ ہی میاں جی کی ڈانٹ پڑتی تھی۔ وہ اس کے لئے افسردہ رہتی، اس کا دل دکھتا لیکن وہ اس کے لئے کچھ نہیں کر سکتی تھی سوائے اس کے کہ اسے روزیاد دلا دیتی کہ اسے سبق یاد کرنا ہے۔ مگر وہ ایک کان سے سن کر دوسرے سے اڑا دیتا۔ البتہ میاں جی عبد الشکور سے بہت خوش تھے کیونکہ نہ صرف یہ کہ اس نے کم عمری میں ہی قرآن شریف حفظ کر لیا تھا بلکہ ان کی ہر بات ہر حکم ماننا تھا۔

عبد المتین سے میاں جی ناخوش تھے۔ کیونکہ وہ اکثر نماز قضا کر جاتا۔ کبھی دکان پر گاہکوں کا بہانا اور کبھی کوئی بہانا۔ لیکن یہ بات تو ان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھی کہ عبد المتین راہ سے گزرنے والی کسی لڑکی کو یوں سر راہ چھیڑ سکتا ہے یہ تو محض ایک اتفاق تھا کہ انہوں نے خود راہ سے گزرتے ہوئے وہ فقرہ سن لیا تھا اور شرم سے پانی پانی ہو گئے تھے کہ لوگ کیا کہیں گے کہ میاں جی کا بھائی اور حافظ جی کا بیٹا ہو کر وہ ایسی گندی حرکتیں کرتا ہے۔ عبد المتین تو انہیں دیکھتے ہی وہاں سے کھسک گیا تھا لیکن وہ خود وہیں سے پلٹ آئے تھے اس روز وہ مسجد بھی نہ گئے اور جب شام کو عبد المتین دکان سے لوٹا تو انہوں نے اسے بید کی چھڑی سے دھنک ڈالا اور کسی میں اتنی ہمت نہ ہوئی تھی کہ انہیں بڑھ کر روک لیتا۔ تب چھوٹی آپا نے ہی ہمت کی تھی لیکن تب تک بید کی چھڑی ٹوٹ چکی تھی۔

”کیا ہوا میاں جی؟“

چھوٹی آپا نے بڑی دل گر فنگی سے پوچھا۔

”اس نے تو مجھے کسی کے سامنے نگاہ اٹھانے کے قابل نہیں چھوڑا امت الحیب۔“

اور وہ سب کو وہیں چھوڑ کر تھکے تھکے سے اپنے کمرے میں چلے گئے۔“

اور سکتے کر اچھے عبد المتین کو سہارا دے کر بڑی آپا اپنے کمرے میں لے گئیں اور سہمی سہمی سی ام کلثوم اس کے سر ہانے بیٹھ کر اس کا سر دبانی لگی۔ مگر غصے، جھنجھلاہٹ اور بے چارگی سے عبد المتین نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔

”اتنا غصہ نہیں کرتے عبد المتین۔“

چھوٹی آپا نے نرمی سے اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھا اور یہی بات آپ میاں جی سے نہیں کہہ سکتی تھیں چھوٹی آپا۔“ اس کے لہجے میں تلخی تھی۔

”وہ ہمارے بزرگ ہیں، ہمارے بھلے کے لئے ہی کچھ کرتے ہیں۔“

”کیا، کیا تھا میں نے؟“

وہ غصے سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔

”یہی ناکہ راستے میں سے گزرتی ہوئی ایک لڑکی کو دیکھ کر کہہ دیا تھا کہ۔“

پھر اس کی نگاہ ام کلثوم پر پڑی تو اس نے بات نامکمل چھوڑ دی۔

”اور یہ کوئی گناہ تو نہیں ہے چھوٹی آپا۔“ ذرا سی دیر بعد اس نے پھر کہا۔

”ذرا لگی میں کھڑے ہو کر کبھی دیکھیں نالڑ کے تو اور بھی بڑی بڑی باتیں کہہ دیتے

ہیں اور ایک میاں جی ہیں۔ نگاہ جھکا کر رکھو عبد المتین۔ آتی جاتی لڑکیوں کو مت گھورو۔

دکان پر آنے والوں سے حلیمی سے بات کرو۔ ہوں۔“

وہ غصے سے بولتا چلا گیا اور چھوٹی آپا تاسف سے اسے دیکھتی گئیں۔ ان کا جی چاہا وہ میاں جی سے کہیں۔

”پھرے ہوئے دریاؤں پر بند نہیں باندھے جاسکتے، میاں جی۔ ان کا رخ تو عقلمندی سے موڑا جاتا ہے آپ تو بس نیکی کی راہ دکھاتے رہیں۔ جبر نہ کریں زبردستی کریں کہ یہ آپ کا اور ہمارا دور نہیں ہے کہ جو کچھ حافظ جی اور میاں جی نے کہا آنکھیں بند کر کے اس پر ایمان لے آئے۔“

مگر وہ وہیں بیٹھی عبد المتین کے غصے کو کم کرنے کی کوشش کرتی رہیں اور ام کلثوم کے ہاتھ ایک بار پھر اس کے بالوں میں الجھ گئے اور وہ ہولے ہولے عبد المتین کا دباتی رہی اور اس کے حلق میں کانٹے سے پڑتے رہے جیسے وہ ہفتوں سے مہینوں۔ پیاسی ہو۔ اور کوئی ان دیکھے ہاتھ اس کا گلا پھینچتے رہے ہوں۔ لیکن وہ ہونٹ دانتوں۔ دبائے وہیں عبد المتین کے سر ہانے بیٹھی رہی البتہ بڑی آپا کو میاں جی نے اپنے کمر میں بلا لیا تھا اور دیر تک عبد المتین کے بارے میں باتیں کرتے رہے تھے اور بڑی آپا سوچا واقعی انہیں اس کا خیال نہیں آیا تھا۔ حافظ جی اور ماں جی نہیں رہے تھے تو اب ان کا فرض تھا کہ وہ عبد المتین کے لئے دلہن تلاش کر دیں اور میاں جی تو اس عمر میں بچوں کے باپ بھی بن گئے تھے۔ دراصل کو تا ہی انہی کی تھی اور اگلے دن سے ہی آپا عبد المتین کے لئے دلہن تلاش کرنے لگیں۔ محلے کی ایک دو عورتوں سے کہار داروں اور برادری میں پتا کیا اور یہ جان کر انہیں بڑا دکھ ہوا کہ وہ لوگ جو ان گھرانے کا بڑا احترام کرتے تھے اپنے اور اپنے بچوں کے لئے میاں جی سے پانی دم کرا لے جاتے تھے۔ رشتہ کے ذکر پر کتر جاتے، کوئی کہتا۔

”نہ جی ہم اپنی بیٹی کسی مولوی کو نہیں دیں گے۔“

کوئی کہتا۔

”عبد المتین کی اتنی بڑی داڑھی ہے۔“

اور کسی کو اعتراض ہوتا ہماری بیٹی تو کھلے ماحول کی عادی ہے اور وہاں تو جی

گھٹن ہے۔“
گھٹن۔

بڑی آپا کی بڑی بڑی آنکھوں میں حیرانی سی بھر جاتی۔

”گھٹن کہاں ہے امت الحلیب۔“

وہ سادگی سے چھوٹی آپا سے پوچھتیں۔

”اتنا بڑا گھر، اتنے بڑے بڑے کھلے کمرے، اتنا بڑا صحن اور برآمدے ہمارا گھر تو بڑا ہوا دار ہے امت الحلیب پھر گھٹن کیسی؟ لوگ تو یو نہی بہانے گھڑتے ہیں دراصل وہ لالچی ہو گئے ہیں اپنی بیٹیوں کی شادیاں ایسے گھرانوں میں کرنا چاہتے ہیں جو باہر سے پیسا کما کر لارہے ہوں۔“

”ہاں گھٹن۔ گھٹن تو واقعی نہیں ہے۔“

چھوٹی آپا سوچتیں۔

مگر پھر بھی پتا نہیں کیوں کبھی کبھی دم گھٹنے لگتا ہے۔ دل چاہتا ہے کہ ساری قیود۔۔۔ ساری پابندیاں توڑ کر باہر نکل جائیں چلتے رہیں چلتے رہیں نامعلوم دنیاؤں کی طرف وہ سو جتی رہتیں اور بڑی آپا انہیں خاموش پا کر اٹھ جاتیں تو وہ ام کلثوم سے ہی پوچھتیں۔

”ام کلثوم کیا تمہیں بھی یہ گھرا چھا نہیں لگتا؟“

”اچھا لگتا ہے چھوٹی آپا لیکن بہت سی باتیں جو مجھے اچھی نہیں لگتیں۔“

”کیا؟“

”میں اپنی مرضی سے کھیلنا چاہتی ہوں، سونا چاہتی ہوں جاگنا چاہتی ہوں۔ میرا

دل چاہتا ہے میں اپنی مرضی سے کچھ کروں اور کوئی مجھے ٹوکے نہ منع کرے لیکن مجھے

میاں جی سے ڈر لگتا ہے۔“

”لیکن چھوٹے بچوں کو کیا پتا ہوتا ہے کہ کون سی بات غلط ہے کون سی صحیح اس لئے

انہیں ٹوکنٹا پڑتا ہے، منع کرنا پڑتا ہے۔“

”ہاں چھوٹی آیا پھر بھی میرا دل چاہتا ہے کہ میں ایسا کروں۔“

”کیا؟ تیرا کیا دل چاہتا ہے ام۔“

”میرا دل کبھی کچھ چاہتا ہے چھوٹی آیا کبھی کچھ۔ کبھی میرا دل چاہتا ہے میں باہر میدان میں جا کر سب بچوں کے ساتھ کھیلوں خوب شور مچاؤں، خوب بھاگوں دوڑوں اور کبھی کبھی اسکول سے آتے ہوئے میرا دل چاہتا ہے میں بھی دوسرے بچوں کی طرح ٹھیلے والے کے پاس کھڑے ہو کر دہی بڑے یا چنے کھاؤں اور کبھی میرا دل عجیب عجیب باتوں کو چاہتا ہے جیسے اس وقت۔“

اس نے اوپر آسمان کی طرف دیکھا جہاں کئی پتنگیں اڑ رہی تھیں نیلی پیلی سرخ۔
”اس وقت میرا دل چاہ رہا ہے کہ کاش میں بھی ایک پتنگ ہوتی اور اوپر کھلے فضاؤں میں اڑتی نیلے آسمان کی وسعتوں کو چھوتی۔“

اور چھوٹی آیا حیران سی سوچا کرتیں۔

”یہ اس بند گھر میں رہ کر اس کے اندر کیسی باغی روح سما گئی ہے۔ ہم نے تو کبھی

ایسی باتیں نہیں سوچی تھیں۔“

اور کبھی کبھی عبدالحفیظ بھی وہاں آجاتا۔

”ہم کوئی غلط کام تو نہیں کرتے نا چھوٹی آیا۔ آخر اور بچے بھی تو ہیں وہ بھی تو بے

سارے کام کرتے ہیں۔ کیا وہ سارے غلط ہیں۔“

”پتا نہیں۔“ چھوٹی آیا خود الجھ جاتیں۔

”کون غلط ہے ہم یا وہ۔“

وہ سوچتیں۔

”لیکن حقیقت یہ ہے کہ تم میاں جی کی اولاد ہو اور تمہیں وہ کھیل نہیں کھیلتے

چاہئیں جو سب بچے کھیلتے ہیں تمہیں وہ کرنا چاہئے جو میاں جی کہتے ہیں اور وہ کوئی غلط بات نہیں کہتے۔ لوگ ان کی عزت کرتے ہیں، احترام کرتے ہیں ان کا اور وہ چاہتے ہیں تم بھی ان کی طرح باعزت بنو۔“

”بڑی عزت ہے۔“ عبدالحفیظ جڑ جاتا۔

”پتا ہے وہاں اسکول میں لڑکے مجھے چھیڑتے ہیں حلوہ کھانے والا مولوی کہتے ہیں۔“

اور چھوٹی آپاسن ہی ہو جاتیں۔

یہ سب کیا ہو رہا ہے پہلے تو ایسا نہیں تھا مگر اب کیوں ہو رہا ہے ایسا۔ پہلے تو لوگ ہماری عزت کرتے تھے، احترام کرتے تھے۔ عزت تو اب بھی کرتے ہیں مگر پھر بھی کچھ بدل ضرور گیا ہے ہاں وہ بھی کچھ بدل گئی ہیں انہوں نے عبدالماجد کو انگش اسکول میں داخل کروایا ہے اور پہلے روز جب میاں جی نے عبدالماجد کو نیکر پہنے اسکول جاتے دیکھا تھا تو ان سے کہا تھا۔

”یہ کیسا ننگا پہنا ہوا ہے امت الحبیب۔“

اور انہوں نے یونہی عبدالماجد کی انگلی پکڑے پکڑے میاں جی کی طرف دیکھا تھا۔

”عبدالماجد کے اسکول کا یہی یونیفارم ہے میاں جی۔“

اور پھر میاں جی چپ کر گئے تھے یوں بھی انہوں نے عبدالماجد کے معاملے میں

داخل نہ دینے کا عہد کر رکھا تھا کچھ بدلا تو ضرور تھا لیکن کوئی خامی ضرور رہ گئی تھی۔

وہ سوچتیں۔

شاید تربیت میں کہیں کمی ہے، کوئی فرق ہے جبھی عبدالحفیظ اور عبدالمجتہد اتنے

باغی ہو رہے تھے۔ ہاں عبدالشکور تھا جو میاں جی کے نقش قدم پر چل رہا تھا اور میاں جی

نے اسے حدیث و فقہ کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے مدرسہ نظامیہ میں بھیج دیا تھا۔ وہ

چاہتے تھے کہ عبدالمجتہد کو بھی کچھ عرصے کے لئے مدرسہ نظامیہ میں بھیج دیاں مگر وہ

وہاں جانے کے لئے تیار نہیں تھا بلکہ وہ دن بدن چڑچڑا ہوتا جا رہا تھا۔ دکان کے دروازے پر کھڑا آتی جاتی لڑکیوں کو گھورتا، چوری چھپے فلم دیکھنے چلا جاتا اور میاں جی اس کی حرکات سے بے خبر مسجد کی تعمیر کے سلسلے میں مصروف تھے اور کبھی کبھی جو انہیں فرصت ملتی تو وہ اپنی ساری توجہ عبدالحفیظ پر مبذول کر لیتے پھر عبدالحفیظ ہوتا اور میاں جی کی بید کی چھڑی اور ام کلثوم اپنے کمرے میں بیٹھی تھر تھر کانپا کرتی اسے کچھ سمجھ نہ آتا کہ وہ کیا کرے۔ کس طرح اس چھڑی کو عبدالحفیظ کے جسم پر پڑنے سے پہلے اپنے ہاتھوں پر روک لے مگر وہ کچھ نہ کر سکتی۔ اور چھڑی عبدالحفیظ کی خبر لیتی رہتی۔

بڑی آہاں آنے جانے والی سے عبدالمتمین کے رشتے کا ذکر کرتیں لیکن رشتہ طے نہیں ہو رہا تھا۔ اگر لڑکی والے رضامند ہو جاتے تو میاں جی کو وہ لوگ پسند نہ آتے اور لوگ اچھے ہوتے میاں جی کو پسند بھی آ جاتے تو پھر کسی نہ کسی وجہ سے رشتہ رہ جاتا۔

وقت تیزی سے گزر رہا تھا ایک جگہ کچھ بات بنی تھی کہ وہ حادثہ ہو گیا جس نے میاں جی کا سر جھکا دیا اس روز وہ مغرب کی نماز کے لئے گھر سے نکلے تھے کہ گلی میں شور اور اپنی دکان کے سامنے لوگوں کا ہجوم دیکھ کر رک گئے۔ لوگوں نے راستہ چھوڑ دیا تھا۔

”کیا بات ہے بھئی؟“

انہوں نے پوچھا۔

لوگوں نے نگاہیں جھکالیں اور سب کے درمیان مجرموں کی طرح سر جھکائے کھڑے عبدالمتمین کے ساتھ ایک عورت کو دیکھ کر (جس نے بڑی سی چادر سے اپنے چہرے کو چھپایا ہوا تھا) زمین ان کے پاؤں کے نیچے گئے نکل گئی۔ اس رات میاں جی نے عبدالمتمین کو اتنا مارا کہ مارتے مارتے ادھ موا کر دیا اور ام کلثوم چھوٹی آپا کے سینے سے لگی سسک سسک کر روتی رہی۔ حالانکہ اب وہ میسرک کی طالبہ تھی۔ چھوٹی آپا نے اسے تسلی دی۔

”تو کیوں اتنی بے حوصلہ ہو رہی ہے میاں جی نے اگر اسے مارا ہے تو اس کی غلطی تھی ام کلثوم۔“

”میں یہ تو نہیں پوچھوں گی چھوٹی آپا کہ متین چاچا نے کیا غلطی کی ہے لیکن میں اتنا جانتی ہوں کہ وہ کوئی بہت بڑی غلطی نہیں ہوگی اور میاں جی تو ہمیشہ چھوٹی غلطیوں پر بڑی سزا دیتے ہیں۔“

”تو کچھ نہیں جانتی ام کچھ نہیں۔ اس نے بہت بڑی غلطی کی ہے۔“

چھوٹی آپا نے دل گر فنگی سے کہا۔

”اس نے میاں جی کا سر جھکا دیا ہے ام، میاں جی کی عزت خاک میں ملا دی ہے۔“

”غلطی بڑی ہو یا چھوٹی، غلطیوں کی سزایوں تو نہیں دیا کرتے چھوٹی آپا۔“

ام کلثوم کے آنسو والی سے بہہ رہے تھے۔

”مس انصاری کہتی ہیں اگر کوئی غلطی کرے تو اسے اتنے پیار سے سمجھاؤ کہ وہ دوبارہ وہ حرکت نہ کرے نہ کہ ضد میں آکر بار بار وہی حرکت کرے۔ میاں جی کو چاہئے تھا کہ وہ متین چاچا کو پیار سے محبت سے سمجھاتے۔“

اور چھوٹی آپا نے حیرت سے اسے دیکھا۔

”ارے ام تو، تو بڑی بڑی باتیں کرنے لگی ہے۔“

”اور میں خود بھی تو بچی نہیں ہوں چھوٹی آپا اٹھارہ سال کی ہوں۔“

”اچھا۔“

چھوٹی آپا زبردستی ہنسیں، لیکن وہ ٹھوڑی پر ہاتھ رکھے سوچتی رہیں۔ آخر ہم لوگ اتنے انتہا پسند کیوں ہیں۔ ہمارے اصولوں میں پلک کیوں نہیں ہے۔ کچھ لوگ بہت آگے چلے گئے ہیں اور کچھ بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔ میانہ روی کسی نے اختیار نہیں کی ہے۔

”کیا سوچ رہی ہو ام؟“

چھوٹی آپا نے اسے یوں سوچ میں ڈبا دیکھ کر پوچھا۔

”کچھ نہیں چھوٹی آپا۔ آپ کو پتا ہے اجتہا، کیا ہوتا ہے؟“

”نہیں۔“ چھوٹی آپا نے سر ہلایا اور وہ پھر کچھ دیر کے لئے سوچوں میں کھو گئی۔ کافی دیر بعد اس نے سر اٹھا کر چھوٹی آپا کی طرف دیکھا جو ابھی تک اس طرح اسی انداز میں بیٹھی اسے دیکھ رہی تھیں۔

”زیادہ مت سوچا کرو ام۔ یہ سوچیں تمہیں بیمار کر دیں گی جو جیسا ہے صحیح ہے۔“

اسے اپنی طرف دیکھتا پھر چھوٹی آپا نے نرمی سے کہا۔

”میں۔ میں دراصل عبد الحفیظ کے متعلق سوچ رہی تھی۔ پتا نہیں کیوں میرا دل

عبد الحفیظ کے لئے ڈرتا ہے چھوٹی آپا۔ میاں جی اس پر بہت سختی کرتے ہیں اور پتا ہے

چھوٹی آپا اس روز وہ کہہ رہا تھا کہ اگر میاں جی نے عبد الشکور اور متین چاچا کی طرح اسے

بھی داڑھی رکھنے پر مجبور کیا تو وہ گھر سے بھاگ جائے گا۔“

”نہیں۔“ چھوٹی آپا کانپ سی گئیں۔

”آپ چھوٹی آپا میاں جی سے کہیں ناکہ وہ عبد الحفیظ کو پیار سے محبت سے سمجھایا

کریں اسے مارا مت کریں وہ پورے سولہ سال کا ہے اور.....“

چھوٹی آپا کو ام کلثوم کی ہر بات صحیح لگتی تھی۔ وہ سمجھتی تھیں کہ وہ بڑی ذہین، بڑی

فطین اور سمجھ دار ہے۔ علم نے اسے مزید نکھار دیا ہے۔ وہ جو خود بڑی سادہ اور بھولی بھالی

سی تھیں اس عمر میں بھی وہ لوگوں۔ دنیا اور زندگی کے فلسفوں کے بارے میں اتنا نہیں

جانتی تھیں جتنا ام کلثوم جانتی تھی۔ اور انسانی نفسیات کے بارے میں جتنا ام کلثوم کو پتا

تھا اس کا رتی بھر علم بھی انہیں نہ تھا وہ تو اس ایک مرد نور الامین کی نفسیات کو بھی نہیں

سمجھ سکی تھیں اور چپ چاپ اس کی زندگی سے نکل آئی تھیں اور بڑی خاموش بڑی

چپ ہو گئی تھیں۔ لیکن ام کلثوم نے ان کی توڑ دی تھی، اب وہ اس سے ڈھیروں

باتیں کرتی تھیں انہیں اس کی سوچ، اس کی فکر، اس کی باتیں سب اچھی لگتی تھیں اور

اس وقت بھی دل ام کلثوم کی ہر بات کی تصدیق کر رہا تھا۔ اگرچہ زبان سے وہ اسے سمجھا

رہی تھیں اور میاں جی کی حمایت کر رہی تھیں انہیں حق بجانب ٹھہرا رہی تھیں۔ مگر

دل ام کلثوم کی تائید کر رہا تھا تب دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر وہ انھیں تاکہ میاں جی سے

عبد الحفیظ اور عبد المتین کے بارے میں بات کریں کیونکہ میاں جی ان کی بات سن لیتے

تھے۔ ان کے دلائل سے قائل بھی ہو جاتے تھے اور مان بھی لیتے تھے لیکن جب وہ ان کے

کمرے میں پہنچیں تو وہ بے چینی سے ادھر ادھر ٹہل رہے تھے انہیں دیکھ کر وہ رک گئے۔

”دیکھا تم نے امت الحبیب دیکھا۔“

ان کی آواز بھر ا گئی۔

”ساری عزت خاک میں مل گئی۔“

اور چھوٹی آپا کی نظریں جھک گئیں۔

”اس نے تو ہمیں سر اٹھا کے چلنے کے قابل نہیں چھوڑا پتا نہیں کب اور کہاں ہم

سے غلطی ہوئی ہے۔ کیا گناہ سرزد ہوا ہے۔ کیا ہم نے اسے یہی تربیت دی تھی امت

الحبیب بتاؤ ہمیں۔“

انہوں نے بڑے درد سے پوچھا اور آنسو ان کی داڑھی کو بھگونے لگے۔

اور چھوٹی آپا کی اپنی آنکھیں نم ہو گئیں۔ انہیں یاد ہی نہ رہا کہ وہ کیوں آئی تھیں وہ

چپ چاپ میاں جی کے پاس بیٹھ گئیں۔

”صبر کریں میاں جی بچوں سے غلطیاں ہو ہی جاتی ہیں۔“

”بچہ ہے وہ امت الحبیب پورے تیس برس کا ہے۔“ ان کی آواز ٹوٹی ٹوٹی سی تھی۔

”غلطی تو ہم ہی سے ہوئی امت الحبیب، امت الرشید سے اتنا بھی نہ ہو سکا کہ بھائی

کے لئے کوئی لڑکی ہی تلاش کر لیں عورتیں نہ جانے کتنے بڑے بڑے کام کر لیتی ہیں۔“

”وہ اور عورتیں ہوتی ہیں میاں جی بڑے بڑے کام کرنے والی۔“

چھوٹی آپانے سوچا۔

”وہ سادہ دل معصوم عورت جسے سات برس کی عمر میں ہی گھر کے اندر بند کر دیا گیا

اب وہ دنیا کے رنگ ڈھنگ کیا جانے۔“

”جاؤ امت الحبیب پوچھو اس سے کون تھی وہ صبح ہی اس سے نکاح کر دیتا ہوں۔“

اور چھوٹی آپا کو یوں لگا جیسے میاں جی کے وجود کی عمارت میں دراڑیں پڑ گئی ہو

اور وہ ڈھسے رہے ہوں۔ وہ چپکے سے اٹھ کر عبد المتین کے پاس چلی آئیں۔ بڑی آپا

کی چوٹوں پر ٹکڑ کر رہی تھیں۔ انہوں نے میاں جی کی بات دہرا دی اور عبد المتین۔

چھوٹی آپا کی طرف دیکھتے ہوئے قسم کھائی۔

”مجھے نہیں پتا وہ کون تھی چھوٹی آپا وہ تو بس دکان میں سودا لینے آئی تھی اور؟

خود ہی مجھ سے باتیں کرنے لگی میں نے تو بس اس سے پیسے لینے کے لئے ہاتھ بڑھایا

اور میں اس سے پیسے لے رہا تھا۔۔۔ وہ لوگ اندر آگئے قسم لے لیجئے چھوٹی آپا میں ا۔

نہیں جانتا۔“

اور شاید اس کی باتیں سن کر میاں جی ہی آگئے تھے۔

”جھوٹ بک رہا ہے یہ امت الحبیب پوچھو اس سے کون تھی وہ؟“

”میاں جی!“ عبد المتین نے روتے ہوئے اپنا سر ان کے قدموں میں رکھ دیا۔

”مان لیجئے میاں جی ایک بار اعتبار کر لیجئے اس کا۔“

چھوٹی آپانے سفارش کی اور میاں جی سر جھکائے باہر نکل گئے مگر انہوں نے آ

ہفتے کے اندر ہی اندر عبد المتین کا نکاح اپنے ایک مرید کی بھانجی سے کر دیا جو یتیم

لاوارث تھی لڑکی نہ صرف شکل کی اچھی تھی بلکہ بڑی سنجیدہ اور سمجھ دار سی لگتی

اور چھوٹی آپا کو یقین تھا کہ اب عبد المتین کی زندگی سنور جائے گی۔



عبد الحفیظ کے کمرے کی صفائی کرتے ہوئے ام کلثوم نے اس کا بستر ٹھیک کیا تو

گدے کے نیچے سے ایک کتاب نکل آئی۔ لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ لئے ام کلثوم نے

کتاب اٹھالی۔ اسے خود کتابیں پڑھنے کا جنون تھا اچھی اچھی کتابیں وہ مس انصاری سے

لے کر پڑھا کرتی تھی۔ اسے اچھا ادب پڑھ کر عجیب سی خوشی ہوتی تھی اور اب

عبد الحفیظ کے گدے کے نیچے کتاب دیکھ کر وہ ہولے ہولے مسکرا رہی تھی۔

تو عبد الحفیظ کو بھی میری طرح کتابیں پڑھنے کا شوق تھا اور میاں جی سے چھپا کر وہ

یہاں کتابیں رکھتا ہے وہیں ایک طرف بیٹھ کر اس نے بڑے اشتیاق سے کتاب کھولی

اور ورق گردانی کرنے لگی۔ مگر یہ کیسی کتاب تھی اس کے رخسار تپ اٹھے۔ گھبرا کر اس

نے کتاب یوں پھینک دی جیسے کوئی ناگ اٹھا لیا ہو تھوڑی دیر تک وہ بو نہی اپنی جگہ پر

بیٹھی خوف زدہ نظروں سے کتاب کی طرف دیکھتی رہی پھر تیزی سے اٹھی اور کتاب کو

اسی جگہ چھپا دیا۔ جہاں سے اٹھایا تھا اور ادھر ادھر یوں دیکھا جیسے اسے ڈر ہو کہ کوئی اسے

دیکھ تو نہیں رہا۔ پھر محتاط انداز میں اس نے عبد الحفیظ کی کتابوں کی تلاشی لے ڈالی کوئی

اور کتاب تو نہ ملی البتہ کچھ فضول سی تصویریں اس کے کورس کی کتابوں میں پڑی نظر

آگئیں اور وہ گھبرائی گھبرائی سی سوچتی رہی کہ کہیں میاں جی کی نظر ان پر پڑ گئی تو وہ

عبد الحفیظ کو زندہ دفن کر دیں گے جبکہ ان دنوں وہ اس پر بہت مہربان تھے اور وہ بھی ان

کی ہر بات مان لیا کرتا تھا، لیکن میاں جی کو کیا پتا کہ وہ ایسی گندی کتابیں پڑھتا ہے اور

ایسی فضول تصویریں اپنے پاس رکھتا ہے۔ وہ پریشان سی باہر نکل آئی۔

یہ سب کچھ کتنا بے فائدہ اور بے کار ہے۔ میاں جی کی ساری احتیاطیں اور ساری

خفیاں اور عبد الحفیظ ویسا ہی ہے جیسا تھا اور میاں جی کی مارنے اسے اور ڈھیٹ بنا دیا ہے۔

باہر صحن میں دو تین چھوٹی چھوٹی بچیاں بیٹھی قرآن شریف پڑھ رہی تھیں اور

عبدالحفیظ ایک طرف برآمدے میں کھڑا اور بڑے دھیان سے قرآن پڑھتی بچیوں کو دیکھ رہا تھا کہ ام کلثوم نے اسے بلایا۔

”عبدالحفیظ وہاں کھڑے کیا کر رہے ہو۔“

ام کلثوم نے سوچا وہ اسے پیار سے، محبت سے سمجھائے گی کہ وہ ایسی گندی اور فضول کتابیں مت پڑھا کرے۔

”کچھ نہیں۔“

وہ اس کے پاس آکر کھڑا ہو گیا وہ عمر میں اگرچہ اس سے دو برس چھوٹا تھا لیکن اس کا قدم کلثوم سے نکلتا ہوا تھا اور اس وقت اس کی عمر سولہ سترہ سال تھی۔

”صبح سے کہاں گئے ہوئے تھے؟“

”میں۔“ اس نے ادھر ادھر دیکھ کر سرگوشی کی۔

”ایک دوست کے گھر دی۔ سی۔ آر پر فلم دیکھ رہا تھا ہائے ام کتنا مزا آیا کیا بتاؤں۔“ اس نے چٹخارہ لے کر کہا۔

”اور یہ لڑکی دیکھی ہے تم نے؟ اس نے قرآن شریف پڑھتی ہوئی لڑکیوں میں سے ایک کی طرف اشارہ کیا۔

ام کلثوم نے مڑ کر اسے دیکھا۔

وہ بمشکل نو دس برس کی ہوگی۔

”بالکل ہیسا مانی جیسی شکل ہے اس کی۔“

ام کلثوم حیران سی کھڑی اسے دیکھ رہی تھی اور اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس

سے کیا کہے۔ وہ تو اس سے اس کتاب کے بارے میں بات کرنا چاہ رہی تھی۔ جو اس کے تئیں کے نیچے پڑی تھی لیکن یہاں تو۔

اس نے غور سے عبدالحفیظ کی طرف دیکھا۔ جس نے سر پر سفید ٹوپی اوڑھ رکھی

تھی۔ شلوار ٹخنوں سے اوپر باندھی ہوئی تھی اور۔ اور تب ہی وہ بچی ان کے پاس سے گزری شاید وہ گھرنچی کی طرف پانی پینے جا رہی تھی۔

”سنو۔ سنو تو میں تم سے پیار کرتا ہوں۔“

عبدالحفیظ نے آہستگی سے کہا اور ام کلثوم کا ہاتھ بے اختیار اٹھا اور عبدالحفیظ کے رخسار پر انگلیوں کے نشان چھوڑ گیا۔ وہ رخسار پر ہاتھ رکھے حیرت سے اسے دیکھ رہا تھا اور ام کلثوم دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ بڑی آہا جو بچیوں کا سبق سننے صحن کی طرف جا رہی تھیں۔ اسے روتا دیکھ کر بھاگی چلی آئیں۔

”کیا ہوا ام۔“

”یہاں۔ یہاں بڑی گھٹن ہے آپا۔“

اس نے روتے ہوئے کہا تو بڑی آپا نے بڑی حیرانی سے اسے دیکھا تھا۔

”تو۔ یہ تو کہہ رہی ہے ام۔“

بڑی آپا نے اسے سینے سے لگا کر چوم لیا۔

”تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے ام۔“

”میرا دم گھٹ رہا ہے بڑی آپا۔“

وہ ان کے سینے سے لگی گہرے گہرے سانس لیتی رہی اسے یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی

غیر مرئی ہاتھ اس کا گلا گھونٹ رہے ہوں اور زمین اس کے پاؤں کے نیچے سے نکلی جا رہی ہو اور پھر یکایک وہ گردن پر ہاتھ رکھ کر چیخ اٹھی اور مسلسل چیختی چلی گئی۔

لاحاصل

ایک سے بے مہر موسم، ایک سے منظر رہے

عمر بھر آنکھوں میں اجڑے خواب کے کنکر رہے

آنکھ میں چمکے نہیں تھے قربتوں کے مابین
فرتوں کے جھللاتے عکس پلوں پر رہے
بھر کی تنہائیوں کا زہر آگن میں کھلا
چاپ سے نا آشنا اس گھر کے بام و در رہے

اور عادل علی کو یوں لگا جیسے ان کی آنکھوں کے سامنے بجلی سی کو ند گئی ہو۔ اسماعیل
سے باتیں کرتے کرتے اچانک ہی ان کی نگاہ سامنے کی طرف اٹھ گئی۔ اور پھر وہ پلک
جھپکتا تک بھول گئے تھے۔ اتنی خوبصورت اتنی سیاہ، اتنی قاتل آنکھیں اور ان پر ایسے
گھنی ایسی لابی پلکیں اور دہکتے رخسار یوں جیسے بلوریں پیالے کے اندر سے گلابی دودھ
اُس کریم جھلکیاں مار رہی ہو۔ اور چھوٹے چھوٹے گول سے خم کھائے ہوئے یا قوتی
لب اور ان پر مدھم سی مسکراہٹ اور وہ جو آدمی دنیا کی خاک چھان آئے تھے حیرت
سے سوچ رہے تھے کیا دنیا میں اتنا حسن، اتنی خوبصورتی اور پھر اس پر معصومیت بھی
ہے۔ انہوں نے بے شمار حسین چہرے دیکھے تھے لیکن یہ لب، یہ آنکھیں یہ رخسار تو
کچھ اور ہی تھے۔ اس کے حسن میں چاندنی جیسی ٹھنڈک کا احساس ہو رہا تھا اور یہ چاندنی
جیسے ان کے دل کی دنیا کو منور کئے ہوئے تھی تو کیا اب تک اس اتنی بڑی دنیا میں انہیں
اسی لئے کوئی لڑکی پسند نہیں آئی تھی کہ انہیں اس لڑکی کو دیکھنا تھا اس سے ملنا تھا
اور پسند کرنا تھا۔

اسماعیل نے ان کی نگاہوں کا تعاقب کیا اور پھر نگاہیں جھکائے ماجد سے باتیں کرتی
ٹومی کو دیکھ کر ہولے سے مسکرا دی۔ اور اپنا ہاتھ ان کے بازو پر رکھ دیا تو وہ چونکے۔
”یہی ٹومی ہے میری روم میٹ۔“

اس نے سرگوشی کی۔

”یہ۔ یہ اس قدر دلکش اور حسین لڑکی۔“

شوق وار فٹکی سے ان کی نگاہیں پھر اس کی طرف اٹھ گئیں۔
”تو آپ کا کیا خیال تھا کہ ہم اپنے بھائی کے لئے کوئی یونہی سی لڑکی پسند کریں
گے۔ جناب یہ ہمارا انتخاب ہے۔“ اسمانے شوخی سے کہا۔
”ریلی اسکی تمہارا انتخاب لاجواب ہے۔“

ان کی نگاہیں بار بار اس کی طرف اٹھ رہی تھیں۔ اس نے بھی شاید اجنبی نظروں
کی تپش محسوس کر لی تھی کہ اچانک ہی اس نے رخ موڑ لیا۔ لمحہ بھر کو تو انہیں یوں لگا
جیسے یک دم تاریکی چھا گئی ہو لیکن پھر ان کی نگاہیں اس کے گھنے سیاہ بالوں سے الجھ
گئیں۔ شاید وہ کچھ دیر پہلے ہی نہائی تھی اور اس نے اپنے بال یونہی کھلے چھوڑ رکھے تھے۔
سیاہ ریشمی بال گھنٹوں تک لہرا رہے تھے۔ وہ کھوئے کھوئے سے کھڑے تھے جیسے پوری
کائنات کا حسن اس ذرا سی جگہ پر سمٹ آیا ہو۔ وہ تھوڑی دیر تک یونہی ان کی طرف
پشت کئے اپنے سامنے کھڑے لڑکے سے باتیں کرتی رہی۔ لڑکے کی آنکھیں بھی ویسی
ہی سیاہ اور لمبی تھیں اور رنگت بھی ویسی ہی سرخ و سپید اور پھر یونہی دوپٹہ سر پر اوڑھے
واپس چل گئی۔

”اب واپس آجائیے بھیا۔ وہ تو گئی۔“

اسمانے ان کی آنکھوں کے سامنے ہاتھ لہرایا تو وہ چونکے اور شرمندہ سی مسکراہٹ
ان کے ہونٹوں پر نمودار ہو کر غائب ہو گئی۔

”نیو ماسنڈ۔“

اسمانے فراخ دلی سے کہا۔

”وہ ایسی ہی ہے اور جب پہلی بار میں نے اسے دیکھا تھا تو دم بخود رہ گئی تھی اور اسی
وقت میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ میں اس لڑکی کو اپنی بھابی بناؤں گی۔“
”تو پھر اتنی دیر کس لئے۔“

”اول تو آپ کی امریکہ سے واپسی کا انتظار تھا۔ کیا پتا آپ وہاں سے کوئی دم چھلا ساتھ لگلاتے۔ اپنے ہاں کے مردوں کا کیا اعتبار چینی چمڑی دیکھ کر پھسل جاتے ہیں۔ اور دوم آپ کی رضامندی۔ اور یہ اچھا اتفاق تھا کہ آپ نے اسے دیکھ لیا ورنہ وہ تو پردہ کرتی ہے اور اب اسی لئے میں اسے آپ کی شادی پر انوائٹ کر رہی ہوں تاکہ ماما ڈیڈی سب اسے دیکھ لیں۔“

”لیکن کیا پتا اس کی معنی وغیرہ ہو چکی ہو۔“ انہوں نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

”جی نہیں یہ بات تو میں نے پہلی ملاقات میں ہی پوچھ لی تھی۔“

”بڑی تیز ہو۔“ انہوں نے خوش دلی سے اس کے بال بکھیر دیئے تھے۔

”بہن کس کی ہوں جناب۔“

”اچھا اب میں چلتا ہوں ثابت انتظار کر رہا ہو گا کل پھر آؤں گا۔“

اب ان کا دل یہاں نہیں لگ رہا تھا۔

”ضرور آئیے گا لیکن اس امید میں مت آئیے گا کہ وہ پھر آپ کو نظر آئے گی۔“

وہ جھینپ سے گئے۔

”احتمق ہو تم اب میں اتنا بھی گیا گزرا نہیں ہوں کہ محض ایک لڑکی کو دیکھنے کے لئے تمہارے ہو مثل کے چکر لگاؤں گا میرا خیال ہے میں کل تم سے مل کر یہیں سے

سایہ وال چلا جاؤں گا اور پھر آپ کی بیاہ کی تاریخ مقرر ہوتے ہی تمہیں لے جاؤں گا۔

اور وہ اس سے ہاتھ ملا کر تیز تیز قدموں سے چلتے ہوئے گیٹ سے باہر نکلی گئے اور

عادل علی کو رخصت کر کے اسماء جب کمرے میں آئی تو ٹھوٹی ہتھیلیوں کے کنوڑے پر

ٹھوڑی ٹیکے جانے کیا سوچ رہی تھی اسے اسماء کی آمد کا پتا ہی نہ چلا۔

”کیا سوچا جا رہا ہے خاتون؟“

اسا بہت خوش نظر آرہی تھی۔

”کچھ نہیں۔“

ٹھوٹی نے آہستگی سے کہا۔

”کوئی خاص بات نہیں، البتہ تم بہت خوش نظر آرہی ہو۔“

”ہاں عادل بھیہا آئے تھے مجھ سے ملنے وہ اپنے ایک دوست سے ملنے یہاں آئے

ہوئے ہیں۔“

اچھا تو وہ شخص جو اتنی بے باکی اور دار فکری سے اسے دیکھ رہا تھا عادل تھا اسماء علی کا

بھائی اور جس کا ذکر اسماء نے اتنی بار کیا تھا کہ یہ نام اب اس کے لئے اجنبی نہیں رہا تھا اور

اس کے اس طرح دیکھنے سے گھبرا کر ہی وہ ماجد کو جلدی رخصت کر آئی تھی۔

”عادل بھائی بتا رہے تھے کہ چند دنوں میں ہی آپ کی شادی کی تاریخ طے پا جائے

گی۔ اب تم بتاؤ تمہارا کیا خیال ہے۔“

”کیسا خیال؟“

’انجان مت بنو ٹھوٹی میں نے تمہیں کہا تو تھا کہ تمہیں آپ کی شادی میں آنا ہے۔“

”مگر میں نے تمہیں بتا دیا تھا کہ میرا آنا بہت مشکل ہے۔“

”کوئی مشکل نہیں ہے کتابی کیڑا صاحب چند روز میں آپ کی پڑھائی ضائع نہیں

ہوگی اور پھر جہاں تک میرا خیال ہے شادی کی تاریخ چھٹیوں میں ہی رکھی جائے گی۔

چند دنوں بعد تو اپریل کی چھٹیاں ہونے والی ہیں۔“

”سوری اسماء میں نہیں آسکوں گی۔“ اس نے معذرت کر لی۔

وہ اسے کوئی جھوٹی امید نہیں دلانا چاہتی تھی اور پھر اس کا فائدہ بھی کیا تھا وہ جانتی

تھی کہ میاں جی کبھی اجازت نہیں دیں گے۔

”نخرے مت کرو ٹھوٹی تمہیں بہر حال آپ کی شادی میں آنا ہو گا۔“

”تم نہیں جانتیں اسی میرے میاں جی مجھ کو آنے کی اجازت نہیں دیں گے۔“

”تم میاں جی سے پوچھنا تو وہ اجازت دے دیں گے۔“
 ”نا ممکن ہے وہ کبھی اجازت نہیں دیں گے ٹومی نے افسردگی سے کہا۔“

”چھوڑو یا تم نے یونہی اپنے میاں جی کو ہوا بنا رکھا ہے وہ اگر ایسے ہی سخت مزاج کے ہوتے اور دقیانوسی ہوتے تو پھر تمہیں یہاں ہو شل میں کیوں بھیجتے بند کر کے رکھتے گھر میں۔ اس نے روٹھے روٹھے انداز میں تلخی سے کہا۔“

تو اس نے سر اٹھا کر ایک نظر روٹھی روٹھی سی اسماعلیٰ کو دیکھا اور سوچا۔

”تمہیں کیا پتا اسماعلیٰ میاں جی نے تو ہمیں بند کر کے ہی رکھا تھا اور تم کیا جانو میں نے یہاں تک آنے کے لئے کتنی اذیت برداشت کی ہے، کتنا کرب سہا ہے۔ آگ کے کیسے دریاؤں کو پاٹ کر آئی ہوں اسماعلیٰ تمہیں کیا پتا میرے دل سے ابھی تک خون رس رہا ہے میرے پاؤں میں ابھی تک آبلے پڑے ہیں اور میرا دامن ابھی تک تارتا رہے۔“

”دراصل تم خود آنا ہی نہیں چاہتیں۔“

وہ روہانسی ہو گئی۔

”نہیں۔ ایسی بات نہیں ہے اسی میرا تو بڑا دل چاہتا ہے کہ اس نے بات ادھوری چھوڑ دی اور دل ہی دل میں سوچا میں نے تو کبھی کسی کی شادی اٹینڈ نہیں کی۔ بس سنا ہے اور میرا تو بچپن سے ہی دل چاہتا ہے کہ کسی کی شادی ہو اور میں گوٹے والے چمکتے ہوئے کپڑے پہنوں اور گلے میں موتیوں کا ہار ڈالوں۔ کانوں میں لمبے لمبے جھمکے پہنوں اور میں چپکے چپکے متین چاچا کی شادی کی دعائیں مانگا کرتی تھی اور پھر متین چاچا کی شادی ہوئی مگر نہ ڈھول بجانہ میں نے چمکتے ہوئے سنہرے کپڑے پہنے نہ گوٹے والا دو پٹالہ بس مسجد میں ہی نکاح ہو گیا اور میاں جی نے کچھ جھوہارے اور میوہ گھر بھجوا دیا اور بس۔ میرا بڑا دل چاہتا ہے ٹومی کہ تم میرے ساتھ میرے گھر آؤ، ممی ڈیڈی آپلی، ناہیا اور عرفان سب تم سے مل کر بہت خوش ہوں گے۔“

”مگر میں تمہیں کیسے سمجھاؤں اسی۔“
 وہ دکھی سی ہو گئی۔

”میرے پاؤں میں تو بڑی بھاری زنجیریں ہیں نظر نہ آنے والی زنجیریں اور میں نے چھوٹی آپا سے وعدہ کر رکھا ہے کہ میں کبھی ان کا سر میاں جی کے سامنے جھکنے نہیں دوں گی اور کوئی ایسا کام نہیں کروں گا جس پر انہیں نادام ہونا پڑا اور میں انہیں مزید کسی امتحان میں ڈالنا نہیں چاہتی اور مجھ پر اس حقیقت کا ادراک ہو چکا ہے کہ تم مجھے اپنے گھر کیوں لے جانا چاہتی ہو۔“

وہ یونہی سر جھکائے سوچتی رہی۔

”کوئی ایسا طریقہ نہیں کہ تم میاں جی کو راضی کر سکو۔“ اسمانے پر امید نظروں سے اسے دیکھا لیکن اس نے نفی میں سر ہلادیا۔

”پتا ہے ٹومی میں نے گھر میں تمہارا اتنا ذکر کیا ہے کہ وہاں سب لوگ تمہیں دیکھنے کے مشتاق ہیں اور جب تم نہیں جاؤ گی تو سب کو بہت مایوسی ہوگی۔ عادل بھیانے بھی کہا تھا کہ اپنی فرینڈ کو ضرور انوائٹ کرنا۔“

اس کا دل یک بارگی بڑے زور سے دھڑکا لیکن وہ سر جھکائے ناخن سے میز کی سطح کریدتی رہیں۔

”اچھا پھر یوں کرو ٹومی اس ویک اینڈ پر میرے ساتھ چلو ہمارے گھر۔ دو دن رہ کر واپس آجائیں گے اور تمہارے میاں جی کو پتا نہیں چلے گا۔“
 ”نہیں!“ وہ ساری جان سے کانپ گئی۔

”میں ایسا نہیں کر سکتی اسی میں میاں جی کو دھوکا نہیں دے سکتی۔“

”پلیز ٹومی میرے لئے میری خاطر۔“ اسمانے التجا کی۔

”تمہارے لئے۔“ اس نے بے بسی سے اس کی طرف دیکھا۔

”تم میری بہت اچھی بہت پیاری دوست ہو لیکن میں کوئی ایسا کام نہیں کر سکتی جس پر بعد میں مجھے نادم ہونا پڑے۔“

”لیکن یہ کوئی۔“

”پلیز اسما سمجھنے کی کوشش کرو۔“

اسما نے منہ پھلایا۔

”جیسے تمہاری مرضی۔“

”ناراض ہو گئی ہو؟“

لیکن اسما اس کی بات کا جواب دیے بغیر اس کے پاس سے اٹھ کر اپنے بیڈ پر چلی گئی۔

”اسما پلیز دیکھ مجھ سے خفا مت ہو میری مجبوریوں کو سمجھو۔“

وہ اٹھ کر اس کے پاس آگئی اور اپنے بازو اس کے گلے میں حائل کر دیئے۔

”مجھ سے خفا ہو کر، مجھے رلا کر کیا ملے گا تمہیں۔“

”اور تم مجھے رلا رہی ہو۔“

”میں بہت مجبور ہوں اسما لیکن پھر بھی میں تمہاری خاطر وعدہ کرتی ہوں کہ چھوٹی

آپا سے بات کروں گی لیکن اگر وہ نہ مانیں تو تم ناراض مت ہونا۔“

”تم بات کرو گی نا۔“

اس نے خوش ہو کر پوچھا۔

”ہاں!“

اس نے افسردگی سے کہا حالانکہ وہ جانتی تھی کہ یہ سب کچھ بے فائدہ ہے۔ وہ

میاں جی کے متعلق اچھی طرح جانتی تھی۔ بیٹے دنوں کا ایک ایک لمحہ اس کی یادداشت

میں محفوظ تھا۔ وہ گلی میں ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر گانا۔

”ہم تم کو لینے آئیں گے آئیں گے ٹھنڈے موسم میں۔“ اور پھر وہ میاں جی کا بید

اور اس کا پھول ایسا جسم اس نے جھر جھری سی لی۔ اگرچہ اب میاں جی کمزور اور بوڑھے

ہو گئے تھے عبد المتین والے حادثے نے انہیں اندر سے توڑ دیا تھا لیکن پھر بھی وہ میاں

جی تھے اپنی بات منوانے والے اور عبد المتین کے احتجاج کے باوجود انہوں نے وہی کیا

جو چاہا۔ نہ بارات گئی نہ عبد المتین دو لہا بنا۔ بس مسجد میں چار آدمیوں کی موجودگی میں

نکاح ہوا اور دلہن گھر آگئی اور وہ جو سوچا کرتی تھی کہ عبد المتین چاچا کی شادی میں خوب

مہندی لگائے گی اور ہاتھ بھر بھر کے چوڑے پہنے گی، اس کا برسوں پرانا خواب چکنا چور

ہو گیا تھا اس کے دل پر ایک اور خواہش نا تمام کا بوجھ بڑھ گیا تھا۔ تہہ در تہہ اس کے دل

پر بوجھ بڑھتا ہی جا رہا تھا اور وہ خود کبھی کبھی اس بوجھ سے گھبرا کر ہوش و حواس کھو بیٹھتی

تھی اس کا دم گھٹنے لگتا تھا۔ جیسے کوئی غیر مرئی ہاتھ اس کا گلا گھونٹ رہے ہوں۔ وہ

دونوں ہاتھ گردن پر رکھے چیختی چلی جاتی تھی اور پھر چیختے چیختے نڈھال ہو کر گر پڑتی اور

کبھی کبھی اس کے اندر دھواں سا اٹھنے لگتا اور وہ چھوٹی آپا کے گھٹنوں پر سر رکھے روئے

چلی جاتی۔ چھوٹی آپا اس کے بالوں میں ہاتھوں سے کنگھی کرتیں۔ اس کی بھیگی پلکوں والی

آنکھیں چومتیں اور ساتھ ساتھ اپنی نرم دھیمی آواز میں پوچھتی جاتیں۔

”کیا ہوا ہے تجھے ام۔ کیوں حواس کھو بیٹھتی ہے۔“

”کچھ نہیں چھوٹی آپا۔“

وہ روئے چلی جاتی۔

”مجھے کچھ پتا نہیں۔ لیکن کبھی کبھی مجھے یوں لگتا ہے جیسے میرے اوپر منوں وزنی

بوجھ آگرا ہو اور میں اس بوجھ تلے دب جاؤں گی۔“

”اچھا مجھے بتا تیرا دل کیا چاہتا ہے؟“

”کچھ نہیں چھوٹی آپا۔“

”بس چھوٹی آپا کبھی کبھی میرا دل چاہتا ہے کہ میں باہر چلی جاؤں۔ ماسی رحمت کے

پھر اکر تھی تھی اور ذرا ذرا سی آہٹ پر چونک چونک جاتی۔ کونوں کھدروں میں چھپی پھرتی اور اس کا دم گھٹتا رہتا۔ وہ گردن پر ہاتھ رکھے دیوانوں کی طرح چیختی اور اس کی چیخیں میاں جی کو دہلا دیتیں۔

”کیا ہو گیا ہے اسے امت الرشید؟“

وہ پریشان ہو کر بڑی آپا سے پوچھتے اور بڑی آپا نہیں دیکھ کر رہ جاتیں کہ خود ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے کیا ہو گیا ہے۔

میاں جی اس پر دم کرتے تعویذ گھول گھول کر پڑتے مگر کچھ اثر نہ ہوتا۔ کسی نے کہا شادی کر دو مگر کوئی دست قلب دراز نہ ہوا کہ لوگوں کا خیال تھا کہ اس پر جن آتا ہے۔ میاں جی کی کوششیں بار آور نہ ہوئیں میاں جی تو اس کی بہت پہلے ہی شادی کر دینا چاہ رہے تھے مگر بد قسمتی سے کوئی مناسب رشتہ ہی نہ ملا تھا اور اب تو لوگ اسے بیمار سمجھ کر قریب ہی نہ آتے تھے اور بیماری تھی کہ بڑھتی جا رہی تھی تب چھوٹی آپا کے مجبور کرنے پر وہ اسے ڈاکٹر پر اچہ کے پاس لے گئے۔

”میرے خیال میں میاں جی ان کے لئے ماحول کی تبدیلی بہت ضروری ہے کچھ عرصے کے لئے انہیں کہیں اور بھیج دیجئے۔“

”مگر کہاں؟ میاں جی سوچ میں پڑ گئے۔“

”کوئی مصروفیت ہو ان کے لئے۔“

”مگر سارا دن تو گھر کے کاموں میں مصروف ہی رہتی ہے۔“

”گھر کے کاموں کے علاوہ بھی ان کے لئے کوئی مصروفیت، کوئی ذہنی مصروفیت۔“

ڈاکٹر پر اچہ نے سمجھایا۔

”ورنہ خدشہ ہے کہ کسی دن ان کا ذہنی توازن نہ بگڑ جائے۔“

اور جب میاں جی نے ساری بات چھوٹی آپا کو بتائی تو ان کا سارا وجود کانپ کر رہ گیا

تندور کے سامنے والے میدان میں جا کر کلکلی ڈالوں یا پھر چھو لے والی ریڑھی کے پاس کھڑے ہو کر چھو لے کھاؤں اور مجھے کوئی ڈر کوئی خوف نہ ہو۔“

اور چھوٹی آپا بڑے دھیان سے اس کی باتیں سنتی جاتیں اور اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتی رہتیں۔

”ارے تو تو بہت کم حوصلہ ہے ام بڑی تھر ڈلی ہے۔ تو تو پڑھی لکھی ہے میٹرک پاس ہے پھر بھی ایسی باتیں سوچتی ہے پگلی۔“

اور وہ سوچتی شاید یہی بنیادی غلطی ہے اور اس کے ساتھ یہی المیہ ہوا ہے کہ وہ کچھ پڑھ لکھ گئی ہے ورنہ وہ بھی چھوٹی آپا اور بڑی آپا کی طرح مطمئن ہوتی۔

”چھوٹی آپا کیا آپ اپنی زندگی سے مطمئن ہیں؟“

”پتا نہیں۔“ چھوٹی آپا نے کہا تھا۔

”لیکن مجھے میاں جی سے بھی کوئی شکایت نہیں انہوں نے تو ہمیشہ ہمارے بھلے کا

ہی سوچا اور یہ تو ہمارے اپنے مقدر کی بات ہے کہ ہم۔“

وہ منہ ہی منہ میں کچھ بددعا کر چپ ہو گئی تھیں۔

”ہاں۔“ میں نے بھی سوچا تھا۔

میاں جی نے اپنی طرف سے کبھی کوئی غلط بات نہیں کہی ہمیشہ اچھی باتیں کہی ہیں۔ لیکن شاید ان کا طریقہ کچھ غلط ہے اسے تو کبھی کبھی میاں جی پر بھی ترس آتا تھا اور عبد الحفیظ اور خود پر بھی غلطی پر کوئی بھی نہیں تھا مگر پھر بھی شاید کہیں نہ کہیں غلطی تھی ضرور۔ لیکن یہ غلطی کہاں تھی کچھ پتا نہیں چلتا تھا کبھی اسے میاں جی پر غصہ آتا اور کبھی عبد الحفیظ پر جو دوبار میٹرک میں فیل ہو چکا تھا اور اکثر دوستوں کے ساتھ وی سی آر پر انڈین فلمیں دیکھتا تھا اور کبھی کبھی جب میاں جی کو پتا چل جاتا تو پھر عبد الحفیظ کے بدن پر جانے کتنی چھڑیاں ٹوٹ جاتیں اور وہ سہمی ہوئی ہر نی کی طرح پورے گھر میں

اور وہ میاں جی کو دیکھ کر رہ گئیں۔

”اب کیا ہو گا میاں جی۔“

”جو خدا کو منظور ہو گا۔“

لیکن چھوٹی آپا سے یوں حالات کے دھارے پر نہیں چھوڑ سکتی تھیں وہ اس کے لئے کچھ کرنا چاہتی تھیں وہ چاہتی تھیں وہ خوش رہے، زندہ رہے تب بہت سوچنے کے بعد انہوں نے میاں جی سے کہا۔

”اسے کالج میں داخل کر دیجئے میاں جی۔ یوں بھی اسے پڑھنے کا بہت شوق ہے۔“

”مگر یہ کیسے ممکن ہے امت الحیب۔“

”نا ممکن تو کچھ بھی نہیں ہے میاں جی اور پھر علم حاصل کرنے میں کیا برائی ہے۔“

”ہاں برائی تو کوئی بھی نہیں ہے۔“ میاں جی سوچ میں پڑ گئے لیکن چھوٹی آپا نے

بالآخر دلائل دے دے کر انہیں قائل کر ہی لیا۔ میاں جی نے بہت سوچا لیکن ان کے

سامنے بھی کوئی اور راستہ نہ تھا۔ کوشش کے باوجود نہ تو کہیں اس کا رشتہ طے پار ہا تھا اور

نہ ہی وہ ٹھیک ہو رہی تھی۔ تب انہوں نے ہار مان لی لیکن مصیبت یہ تھی کہ اس چھوٹے

شہر میں لڑکیوں کے لئے کوئی الگ سے کالج نہیں تھا بس ایک لڑکوں کا کالج تھا اور

لڑکیاں بھی وہیں پڑھتی تھیں تب میاں جی نے فیصلہ کیا کہ اسے لاہور ہوسٹل میں

داخل کر دیا جائے اور عبدالماجد کو بھی وہیں داخل کر دیا جائے تاکہ وہ اس کی خبر گیری

کر سکا رہے۔ اگرچہ عبدالماجد اس سے چار برس چھوٹا تھا لیکن چونکہ ایک تو وہ پہلے ہی

بڑی عمر میں اسکول میں داخل ہوئی تھی دوسرے اسے میٹرک کئے ہوئے بھی دو سال

ہو گئے تھے یوں عبدالماجد اور وہ دونوں ہی فرسٹ ایئر میں داخل ہوئے تھے۔ وہ اگرچہ

بیس اکیس برس کی تھی لیکن دیکھنے میں بہت کم عمر اور معصوم لگتی تھی اور جب اس نے

اسماعیلی کو جو اس کی روم میٹ تھی بتایا تھا کہ اس کی عمر بیس سال ہے تو اسے یقین ہی

نہیں آیا تھا۔

ماحول کی تبدیلی نے واقعی اس کی صحت پر اچھا اثر کیا تھا کبھی کبھی اسے بے چینی کی

ضرور محسوس ہوتی تھی اور سانس بھی رکتا ہوا محسوس ہوتا تھا لیکن وہ شدید کیفیت

طاری نہ ہوتی جو گھر پر ہوا کرتی تھی۔ میاں جی اور چھوٹی آپا اس کی صحت کی طرف سے

مطمئن ہو گئے تھے البتہ چھوٹی آپا نے اس سے وعدہ لیا تھا کہ وہ کوئی ایسی حرکت نہیں

کرے گی جس کی بنا پر انہیں نادم ہونا پڑے اور اس نے چھوٹی آپا سے وعدہ کیا تھا کہ ایسا ہی

ہو گا چھوٹی آپا اور اب یہ اسماعیلی جو اسے بہت پیاری تھی اسے امتحان میں ڈال رہی تھی۔

”تم پریشان ہو گئی ہو ٹو ما۔“

اسے یوں سوچ میں ڈوبادیکھ کر بہت دیر بعد اسمانے پوچھا۔

”نہیں۔“ وہ زبردستی مسکرائی۔

”کیا میاں جی بہت سخت مزاج کے ہیں۔“

”پتا نہیں لیکن مجھے ان سے خوف آتا ہے اور اگر میاں جی نے اجازت نہ دی تو ما

تم ناراض مت ہونا۔“ اس نے رک رک کر کہا۔

”ناراض۔ میں چاہوں بھی تو تم سے ناراض نہیں ہو سکتی ٹو می آخر تم اتنی پیاری

کیوں ہو۔“

”میں۔ میں تو کچھ بھی نہیں ہوں اسی تم نے میری چھوٹی آپا کو نہیں دیکھا وہ کتنی

خوبصورت ہیں سچ نگاہ ان کے چہرے پر ٹھہرتی ہی نہیں ہے۔ مجھے آج تک یہ پتا نہیں

چل سکا کہ ان کے چہرے کی سب سے خوبصورت چیز کیا ہے۔ بس پہلی نظر ہی میں ان

کے چہرے کا سحر جکڑ لیتا ہے کہ پتا نہیں چلتا کہ ہم کس شے سے مسحور ہو رہے ہیں

آنکھوں سے ہونٹوں سے یا پھر۔ پتا ہے اسی ان کی رنگت اتنی سفید ہے کہ جب وہ بیٹھی

ہوتی ہیں تو یوں لگتا ہے جیسے ان کے ارد گرد روشنی کا ہالہ سا بنا ہے اور ان کے ہونٹ

مجھ یا قوت کے ہم رنگ ہیں اور ان کی آنکھیں یقین کرو اسما میں نے آج تک اتنی حسین آنکھیں کسی کی نہیں دیکھیں اب جبکہ وہ تقریباً چالیس برس کی ہیں تب بھی نگاہیں ایک بار آکر ٹھہر سی جاتی ہیں اور تم سوچو چودہ برس کی عمر میں چہرہ کتنی قیامت ڈھاتا ہو گا نگاہ اس چہرے پر کیوں کر رکتی ہوگی مگر پھر بھی چھوٹی آپا کو طلاق ہو گئی۔ اسما علی، کیونکہ وہ نورالامین کا ساتھ نہیں دے سکی تھی۔ یہ کتنا بڑا المیہ ہے اور وہ شخص کتنا بد نصیب ہو گا۔“ وہ ہولے ہولے۔ اسے چھوٹی آپا اور بڑی آپا کے متعلق بتاتی رہی اور اپنے ماحول کے بارے میں۔ اسما علی حیران حیران سی اس کی باتیں سنتی رہی۔ نہ جانے کتنا وقت گزر گیا کھانے کی بیل ہوئی تو وہ چونکیں۔

”ارے باتوں باتوں میں اتنا وقت گزر گیا۔“ اور اسما کھڑی ہو گئی۔

”چلو آؤ کھانا کھا آئیں۔“

”تم جاؤ اسی میرا جی نہیں چاہ رہا ہے۔“

پتا نہیں کیوں وہ بہت افسردہ سی ہو رہی تھی۔

”نہیں یار چلو بھوکا نہیں سونا چاہئے۔“

اور اس کے انکار کے باوجود اسما اسے کھینچ کر لے گئی۔



”آپ کے مہمان آئے ہیں جی۔“

پڑوسیوں کی نو دس سالہ لڑکی نے آکر بتایا تو چاول صاف کرتی بڑی آپا نے سراٹھ کر اسے دیکھا۔

”شاید میاں جی سے کوئی ملنے آیا ہو گا۔ اکثر گاؤں سے ان کے معتقد انہیں ملنے آ کرتے تھے۔“

”سنو زینہ۔ انہیں بیٹھک میں بٹھا دو اور بتا دو میاں جی تو مسجد گئے ہیں ابھی

آجائیں گے۔“

لڑکی فوراً ہی واپس آ گئی۔

”جی وہ تو ساہیوال سے آئے ہیں۔ کلثوم بی بی سے ملنا ہے اور خالی ٹرے ہاتھ میں لے کر کچن کی طرف جاتی ہوئی ام کلثوم کے کانپتے ہاتھوں سے ٹرے نیچے گر پڑی بڑی آپا نے چونک کر اسے دیکھا۔ لیکن وہ ان کی طرف پیٹھ کئے کھڑی تھی ورنہ اس کے چہرے پر یک دم اتر آنے والی زردیاں بڑی آپا سے پوشیدہ نہ رہ سکتیں۔“

”تو تم سچ مجھے لینے آ گئے عادل علی۔“

اس نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔

”میاں تمہیں اسما نے نہیں بتایا تھا کہ میرے میاں جی کتنے سخت اور۔ اور یہ کہ تم نے

یہاں آکر خود میرے قتل پر دستخط کر دیئے ہیں۔“

بڑی آپا نے چاول ایک طرف رکھے اور قرآن شریف پڑھنے والی بچیوں سے کہا کہ وہ چھٹی کر جائیں اور خود آنے والی خواتین کے استقبال کے لئے کھڑی ہو گئیں۔

”آئیے آئیے۔“

ام کلثوم وہیں کچن کے پاس اپنے تیزی سے دھڑکتے دل کو سنبھالے کھڑی تھی۔ لگتا تھا ابھی وہ گر جائے گی۔

”ام ام دیکھو کون آیا ہے؟“

بڑی آپا کی آواز اسے بڑی دور سے آتی ہوئی محسوس ہوئی وہ ہولے ہولے مڑی بالکل سامنے صحن میں بڑی آپا کے ساتھ اسما کھڑی تھی اور اسما کے ساتھ کوئی اور خاتون بھی تھیں۔ اسما اسے دیکھ کر آگے بڑھی وہ مرے مرے قدموں سے چلتی ہوئی اس کے قریب آئی۔ اس سے گلے بھی ملی ہاتھ بھی ملایا لیکن کچھ کھوئی کھوئی سی پریشان پریشان سی لگ رہی تھی۔

”یہ میری آئی ہیں اور یہ کلثوم ہے آئی۔“ اسانے تعارف کروایا اور پھر سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔

”تمہیں میرے آنے سے خوشی نہیں ہوئی تھی۔“

”نہیں۔ نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔“ وہ خواہ مخواہ ہی ہنسی۔
”بیٹھو نا تم۔“

”لیکن لگتا تو یوں ہے جیسے تم ہمیں دیکھ کر پریشان ہو گئی ہو۔“

اسانے چارپائی پر بیٹھتے ہوئے شکوہ کیا تو اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے ام کلثوم نے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے آہستگی سے کہا۔
”تم۔ تم اکیلی آئی ہو۔“

”تو کیا تمہیں کسی اور کا بھی انتظار تھا۔“ اسانے سرگوشی میں کہا۔

”ویسے اگر تم نے اپنے میاں جی سے اتنا ڈرانہ رکھا ہو تا تو اور ام کلثوم نے دل ہی دل میں اطمینان بھر اسانس لیا اور اس کی کھوئی ہوئی رنگت لوٹنے لگی۔“

”انہیں اندر لے جاؤ ام۔“

بڑی آپانے اٹھتے ہوئے کہا۔

”نہیں ہمیں یہیں کھلی فضا میں بیٹھنا اچھا لگ رہا ہے۔“ اسانے کہا تو بڑی آپا کچن کی طرف چلی گئیں۔

”ام تم اپنی سہیلی سے باتیں کرو۔ میں ابھی آتی ہوں۔“

”تم نے چھوٹی آپا سے بات کی تھی۔“ اسانے ان کے جاتے ہی پوچھا۔
”نہیں۔“

ام کلثوم نے سر جھکا لیا اسے یہاں آئے چار دن ہو گئے تھے اور ایک دو بار اس نے سوچا بھی تھا کہ وہ چھوٹی آپا سے کہے کہ اسما کی خواہش ہے کہ وہ اس کی باجی کی شادی میں

شریک ہو لیکن پھر ہمت ہی نہ ہوئی۔ یونہی ایک دن اس نے سز سزی ساڑ کر کیا تھا کہ اسما کی بہن کی شادی ان چھٹیوں میں ہے اور بس۔“

”مجھے پتا تھا کہ تم کچھ نہیں کرو گی اسی لئے تو میں خود ہی چلی آئی۔“

”مگر تم صرف میرے لئے آئی ہو؟“

ام کلثوم کو حیرت ہوئی۔ آئی نہیں ہوں بھیجی گئی ہوں۔

اسانے اس کے کان میں سرگوشی کی تو اس کے رخسار دھک اٹھے۔

”اگر آپ نہ آئیں تو ہم خود ہی آپ کو لینے آ جائیں گے۔“

ایک گمبیر آواز اس کے کانوں میں گونج اٹھی اور پھر پچھلے چار دنوں میں کتنی ہی بار اس کے کانوں میں یہ سرگوشیاں گونجتی رہی تھیں اور وہ چونک چونک کر گھبرا گھبرا کر ادھر ادھر دیکھتی اندر ہی اندر سمٹ جاتی۔

”نہیں عادل علی مت آنا یہاں۔“

اس روز چھٹیاں ہو رہی تھیں۔ وہ دونوں اپنا اپنا سامان باندھ رہی تھیں کہ رحمت بابا نے آکر بتایا۔

”آپ کے بھائی آئے ہیں جی!“

”اچھا بابا ہم آتے ہیں۔“ اسانے اپنی کتابیں بیگ میں ٹھونکتے ہوئے کہا اور آپ بند کر کے کھڑی ہو گئی۔

”چلو تھی ماجد میاں تو آگئے تمہیں لینے چلو میں بھی چلتی ہوں۔ تمہارے ساتھ ماجد

میاں سے مل آتے ہیں اور میں نہیں بلکہ تم بات کرنا ماجد سے شادی پر جانے کے لئے۔“

”اس سے بات کرنے کا بھلا کیا فائدہ۔“

اس نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں پھیلائیں۔

”وہ تو مجھ سے پورے چار برس چھوٹا ہے بچہ ہی تو ہے۔“

وہ دونوں باتیں کرتی ہوئی نیچے آگئیں اور پھر گیٹ کے آس پاس وہ ماجد کو تلاش کر رہی تھی کہ اچانک وہ سامنے آگیا۔

”ارے بھیا آپ کب آئے؟“

”کیوں کیا چوکیدار نے بتایا نہیں جا کر۔“

”اوہ تو وہ آپ تھے۔ ہم سمجھے ماجد آیا ہے ٹومی کا بھائی۔“

اسمانے مڑ کر شرارتی نظروں سے اسے دیکھا جو واپس جانے کے لئے پر تول رہی تھی لیکن اسمانے مضبوطی سے اس کا ہاتھ تھام رکھا تھا۔

”ٹومی یہ میرے بھائی ہیں عادل اور بھیا یہ میری روم میٹ اور دوست ٹومی ہے۔“

”آداب۔“ عادل علی نے آہستگی سے کہا اور سر خم کیا۔ اور پسینہ اس کے ہر مسام

جسم سے پھوٹ پڑا۔

”پلیز اسامیر ہاتھ چھوڑ دو۔“

اس نے کھٹی کھٹی آواز میں سرگوشی کی لیکن اسمانے تو جیسے اس کی بات سنی ہی نہیں۔

”آپ!“ عادل علی نے جانے کیا کہا اس نے مارے گھبراہٹ کے سنا ہی نہیں۔

بس ذرا کی ذرا پلکیں اٹھا کر اسے دیکھا مگر وہ ایسی مشتاق نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا کہ

اس کی نگاہیں زمین پر گر گئیں۔

”تو آپ آرہی ہیں ناسا ہیوال آصفہ کی شادی پر۔“

”جی۔“

”دیکھیے آپ کو ضرور آنا ہوگا ورنہ ہم خود آپ کو لینے آجائیں گے۔“ اور تب ہی

وہ ہاتھ چھڑا کر واپس پلٹ آئی۔ اسما کو اسے منانے کے لئے بڑے جتن کرنا پڑے تب

کہیں جا کر وہ اس سے بولی لیکن وہ لہجہ، وہ مشتاق نظریں آج تک اس کے خیالوں سے نہ

گئی تھیں۔ اسما اس کے چہرے کے بدلتے رنگوں کو دلچسپی سے دیکھ رہی تھی۔

”اب بھی نہیں آؤ گی۔ ٹومی“

اس نے پھر سرگوشی کی۔

”میں۔ میرے اختیار میں تو کچھ بھی نہیں ہے۔ میں نے تمہیں بتایا تو تھا نا۔“

اس نے افسردگی سے کہا۔

”کچھ کرو پلیز۔ ورنہ سب مایوس ہوں گے۔“

”کیا کروں؟“

اس کی آنکھوں میں جگنو سے چمک اٹھے۔

”کہا تو تھا اتنی امیدیں مت وابستہ کر دو مجھ سے۔“

”اس میں بھی تمہارا ہی قصور ہے ٹومی۔ بتاؤ تم اتنی پیاری کیوں ہو؟“

اس نے جھنجھلا کر کہا تھا۔

”اور یہ کتنے دکھ کی بات ہے اسما علی کہ تم جو اتنے خلوص، اتنی چاہت سے مجھے

دعوت دینے آئی ہو۔ اتنی دور سے اور میاں جی تمہاری دعوت رد کر دیں گے اور مجھے

تمہارا دل ٹوٹنے کا بے حد دکھ ہوگا۔“ ام کلثوم نے بے حد دل گرفتگی سے سوچا۔ وہ یونہی

سر جھکائے بیٹھی تھی اور اس کے خوبصورت چہرے پر ملال کے رنگ گہرے ہو گئے تھے۔

”تم اتنی خاموش اور چپ چپ کیوں ہو ٹومی اور تمہاری چھوٹی آپا کہاں ہیں۔ تم

نے ابھی تک ان سے ملوایا ہی نہیں۔“

”چھوٹی آپا۔“ اس نے چونک کر چھوٹی آپا کے کمرے کی طرف دیکھا چھوٹی آپا

کمرے سے باہر آرہی تھیں۔ اسمانے بھی مڑ کر دیکھا۔

”ارے سچ تمہاری چھوٹی آپا تو بہت خوبصورت ہیں۔ اتنی کہ تمہارا حسن ان

کے سامنے ماند پڑ جاتا ہے۔“ اسمانے تعریف کی۔ چھوٹی آپا ادھر ہی آرہی تھیں اسما

کھڑی ہو گئی۔ ام کلثوم نے تعارف کروایا۔ چھوٹی آپا نے اسے گلے ملتے ہوئے پیار کیا

تب ہی بڑی آپا بھی آگئیں۔ سنجیدہ سی بڑی آپا بھی اسما کو اچھی لگیں۔

”آپ لوگ یہاں ہی چائے پیئیں گے یا اندر کمرے میں۔“

”نہیں۔ یہاں ہی اچھا لگ رہا ہے اسما نے کہا۔“

”چھوٹی آپا پلیر یہاں بیٹھئے نا ہمارے پاس۔ پتا ہے ہمیں آپ سے ملنے کا بہت شوق تھا۔“

چھوٹی آپا مسکراتی ہوئی ان کے قریب ہی بیٹھ گئیں اور ام کلثوم اٹھ کر بچن میں چلی گئی اور جب وہ واپس چائے لے کر آئی تو اسما بڑے مزے سے چھوٹی آپا اور بڑی آپا سے باتیں کر رہی تھی۔ دونوں کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ اتنی سی دیر میں اس نے انہیں اپنا گرویدہ بنا لیا تھا۔

”ام تم نے اپنی سیہلی سے ہمیں پہلے کیوں نہیں ملوایا ایک سال سے تم تو اکٹھی رہ رہی ہو۔“

”اور اب کب اس نے ہمیں بلایا ہے۔ یہ تو ہم خود ہی ڈھیٹ بن کر آگئے ہیں اسی لئے تو منہ پھلائے بیٹھی ہے۔“ چھوٹی آپا اور بڑی آپا نے بیک وقت اس کی طرف دیکھا تو وہ گھبرا گئی۔ اس نے جلدی سے چائے کی پیالی اسما کی آٹنی کی طرف بڑھائی۔

”آٹنی چائے لیجئے پلیر۔“

”کیوں ام۔ یہ اسما کیا کہہ رہی ہیں؟“

چھوٹی آپا نے براہ راست پوچھ لیا۔ وہ اتنی سادہ سی تھیں کہ اسما کی بات سمجھ ہی نہ سکیں۔ جس کی آنکھیں شرارت سے چمک رہی تھیں۔

”نہیں۔ ایسی تو کوئی بات نہیں۔“

بڑی آپا نے اس کی حمایت کی۔

”بس ذرا ہماری ام کم گو سی ہے۔“

بات ختم کر کے انہوں نے ام کلثوم کی طرف دیکھا۔

”دیکھو ام اب تم اپنے مہمانوں کو کمرے میں لے جاؤ۔ چھوٹی آپا کے کمرے میں ان کے لئے بستر وغیرہ لگا دو۔ امت الحیب میرے کمرے میں آجائے گی۔“ وہ کھڑی ہو گئیں۔

”اچھا اسما بیٹے تم لوگ اب ذرا آرام کرو۔ سفر کر کے آئے ہو میں ذرا رات کے کھانے کے لئے تیاری کر لوں۔“

”مگر۔ مگر بڑی آپا۔“

اسما کچھ گھبرا سی گئی تھی۔

”پلیر آپ کچھ تردد وغیرہ نہ کریں ہمیں ابھی واپس بھی جانا ہے۔“

”مگر کیوں؟ کیا ہمارا گھر اچھا نہیں لگا۔“

چھوٹی آپا نے پوچھا۔

”نہیں۔ چھوٹی آپا ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ دراصل ہم لوگ ماسٹر شیر دل

صاحب کے یہاں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ بس ہم آپ سے اور ام کلثوم سے ملنے آئے تھے اور پھر ہمیں آپ کو دعوت بھی دینا تھی۔ میری آپا کی شادی ہے۔“

اسما نے یگ سے ایک کارڈ نکالا۔

”پلیر آپ لوگ آئیں گے نا۔ آپا کی شادی میں آپ سب بڑی آپا اور چھوٹی آپا

آپ بھی۔“

کب ہے شادی بڑی آپا نے کارڈ لے لیا۔

بس چار دن بعد بارات ہے۔ فنکشن تو کل سے ہی شروع ہو جائیں گے۔ آپ

آئیں گی نا چھوٹی آپا؟

اس نے پر امید نظروں سے انہیں دیکھا۔

چھوٹی آپا کی پیشانی پر تردد کی لکیریں تھیں۔ وہ اس معصوم سی لڑکی کا دل بھی نہیں

توڑنا چاہتی تھیں جو بڑی آس لئے انہیں تک رہی تھی اور اس سے کوئی جھوٹا وعدہ بھی نہیں کرنا چاہتی تھیں۔ کیونکہ جانتی تھیں کہ میاں جی اسے بالکل پسند نہیں کریں گے۔ انہیں یاد نہیں تھا کہ کبھی وہ کسی عزیز کے ہاں کسی شادی میں شریک ہونے کے لئے گئی ہوں۔ بچپن میں کبھی میاں جی نے کہیں جانے نہیں دیا اور اب خود ان کا دل ہی نہیں چاہتا تھا۔

”سوری اسماء ہمارا جانا بہت مشکل ہے۔“

ام کلثوم نے چھوٹی آپا کے چہرے پر پھیلنے سمٹنے تردد کے سایوں کو دیکھ کر کہا۔ وہ چھوٹی آپا کی الجھن کو سمجھ رہی تھی۔

”ہاں اسماء گریبا بہت مشکل ہے۔ چار دن بعد تو کالج بھی کھل رہے ہیں اور ام کلثوم نے کالج بھی جانا ہو گا۔“

”کالج تو مجھے بھی جانا ہے چھوٹی آپا۔ ویسے کے بعد وہاں سے ام بھی میرے ساتھ لاہور چلی جائے گی۔ آپ اور بڑی آپا وغیرہ واپس آجائیں گی۔ ٹھیک ہے نا۔ تو آپ آئیں گی نا۔ بلکہ بہتر تو یہی ہے کہ آپ صبح ہمارے ساتھ ہی چلی چلیں۔“

اس نے اشتیاق سے کہا۔ چھوٹی آپا نے بے بسی سے ام کلثوم کی طرف دیکھا جو سر جھکائے بیٹھی تھی اور جس کے چہرے پر ہلکی ہلکی زردی اور اداسی تھی۔ ام کلثوم کے لئے ان کا دل دکھ گیا۔ لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کریں۔ اسماء سے کیا کہیں۔

”چھوٹی آپا وعدہ کیجئے نا آپ آئیں گی ہم صبح جاتے ہوئے آپ کو لیتے جائیں گے۔“

داصل بات یہ ہے اسماء گریبا کہ شاید میاں جی اس بات کی اجازت نہ دیں۔ اس لئے میں کوئی وعدہ نہیں کرتی تمہیں تم نے بتایا نہیں ہے کہ میاں جی ذرا مختلف مزاج کے آدمی ہیں۔

”میاں جی کہاں ہیں میں ان سے خود بات کر لیتی ہوں۔“ اسماء نے پوچھا۔

”میاں جی تو اب مغرب کی نماز کے بعد ہی آئیں گے۔“

”ہم انتظار کر لیتے ہیں۔“

اسما نے ام کلثوم کی طرف دیکھا۔

”ہم آپ کو الگ ٹھہرائیں گے پردے کا بھی مکمل انتظام ہو گا۔“

اسما کی آنٹی نے پہلی بار بات کی۔

”دراصل اسما کو کلثوم سے بہت پیار ہے۔ اسی کی خاطر تو یہ میرے ساتھ آئی ہے۔“

چھوٹی آپا اندر ہی اندر۔ نادم ہو رہی تھیں۔ بے چاری لڑکی کتنی آس لے کر آئی ہے مگر وہ کتنی بے بس اور مجبور ہیں۔ کاش ان کے اختیار میں ہوتا تو وہ کلثوم کو اس کے ساتھ بھیج دیتیں۔ مگر وہ ام کلثوم کے معاملے میں بے اختیار تھیں۔ بس ایک عبدالماجد تھا جس پر ان کا اختیار تھا جس کے لئے وہ جو چاہے کر سکتی تھیں۔ میاں جی نے کبھی دخل نہیں دیا تھا۔ لیکن ام کلثوم کے لئے وہ کیسے وعدہ کر لیتیں۔ مگر پھر بھی وہ ان سے صاف صاف نہ کہہ سکیں کہ میاں جی اس بات کی اجازت نہیں دیں گے۔

”اچھا ٹھیک ہے بہن۔ میاں جی آجائیں تو پھر ان سے پوچھ کر ہی آپ کو بتا سکوں گی کہ ام کلثوم جاسکے گی یا نہیں۔“ انہوں نے اسما کی آنٹی سے کہا۔

”صرف ام کلثوم ہی نہیں آپ کو بھی آنا ہو گا۔“

چھوٹی آپا ان کی طرف دیکھ کر مسکرا دیں اور نماز پڑھنے کے بعد معذرت چاہی۔

ام کلثوم انہیں چھوٹی آپا کے کمرے میں بٹھا کر خود بھی نماز پڑھنے چلی آئی۔ چھوٹی آپا نے جب دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے تو ان کی نگاہ اچانک ام کلثوم کی طرف اٹھ گئی۔ وہ دونوں ہاتھ گھٹنوں پر رکھے ساکت بیٹھی تھیں۔ اس کا چہرہ ابھی تک زرد تھا اور آنکھوں میں نامعلوم سی اداسی تھی۔ چھوٹی آپا نے دعا ختم کر کے اس کی طرف دیکھا۔

نماز پڑھ چکی ہو ام؟

”جی۔“

وہ چوکی اور اٹھ کر جانماز تہہ کرنے لگی۔

”ام۔“

کسی انجانے جذبے سے بے اختیار ہو کر چھوٹی آپا نے اپنا ہاتھ اس کے کندھے پر رکھ دیا۔

”میں میاں جی سے خود بات کرو گی شاید وہ مان جائیں۔“

”چھوٹی آپا۔“ وہ اداسی سے مسکرائی۔ ”آپ یونہی پریشان ہو رہی ہیں۔ میں تو اس

بارے میں نہیں سوچ رہی۔“

”تمہارا دل چاہتا ہے جانے کو؟“

”نہیں چھوٹی آپا۔ میں نے انہونی باتوں کی خواہش کبھی نہیں کی، بس میں تو اس کے بارے میں سوچ رہی تھی میں نے اسے بتا بھی دیا تھا کہ میں نہ آسکوں گی، پھر بھی وہ چلی آئی ہے۔“

بڑی آپا نے جانمزد تہہ کر کے تخت پر رکھ دی۔

”ام اپنے مہمانوں کو کھانا کھلائے بغیر مت جانے دینا۔ میں باورچی خانے میں جا

رہی ہو۔“

”بڑی آپا میں آؤں آپ کے ساتھ؟“

”نہیں۔ تم جاؤ۔ اپنی سہیلی کے پاس بیٹھو۔ امت الحبيب تم آنا ذرا۔“

چھوٹی آپا بڑی آپا کے پیچھے ہی باہر نکل گئیں تو وہ بھی ہولے ہولے قدم رکھتی

باہر نکل آئی۔

اسمانے اسے اندر آتے دیکھ کر بے چینی سے پوچھا۔

”ٹومی۔ تمہارے میاں جی آگئے؟“

”نہیں۔ لیکن وہ آنے ہی والے ہوں گے۔“

”وہ لوگ ہمارا انتظار کر رہے ہوں گے۔“

اسما کی آنٹی نے آہستگی سے اسما کو مخاطب کیا۔

”بڑی آپا نے عبد الحفیظ کو ماسٹر صاحب کے گھر بھیجا ہے تاکہ انہیں بتا آئے کہ

آپ لوگ کھانا کھا کر آئیں گے۔“

”اوہ۔ مگر اس کی کیا ضرورت تھی ٹومی۔“

ام کلثوم خاموش ہی رہی۔

”سنو ٹومی۔ تمہارا کیا خیال ہے۔ تمہارے خیال میں کیا میاں جی تمہیں ہمارے

ساتھ جانے کی اجازت دے دیں گے؟“ تھوڑی دیر بعد اسما نے پوچھا۔

”شاید نہیں۔“ اس نے صاف گوئی سے کہا۔

”میاں جی بہت سخت طبیعت کے ہیں اور میں نے تمہیں بتایا تھا کہ میرا ہوٹل میں

رہ کر پڑھنا محض ایک علاج ہے جو میرے لئے تجویز کیا گیا ہے اور میں نہیں جانتی کہ

میاں جی نے خود کو اس کے لئے کیسے تیار کیا ہے اور کبھی کبھی مجھے لگتا ہے جیسے یہ سب

ایک خواب ہے۔ ایک لمبا اور طویل خواب اور جب میری آنکھ کھلے گی تو۔۔۔“

وہ بات ادھوری چھوڑ کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔ اس نے پردہ ہٹا دیا تھا۔ سامنے

ناسی رحمتاں کے تندور پر چھوٹی سی لالین جل رہی تھی اور بچے ابھی تک ملگجے سے

اندھیرے میں میدان میں کھیل رہے تھے۔

”اسا تم کبھی گلی میں بیٹھو گرم اور آنکھ مچولی کھیلی ہو۔“

”نہیں۔“ اسما نے حیرت سے اسے دیکھا۔

”میں جب چھوٹی تھی تو ہم ڈیڈی کے ساتھ کراچی میں جس فلیٹ میں رہتے تھے

وہ دوسری منزل پر تھا اور ہم لوگ کبھی نیچے نہیں اترتے تھے۔ بس اسکول سے آکر کبھی

لڈو اور کبھی کیرم کھیل لیتے۔“

”اور تمہارا کبھی دل نہیں چاہا اساکہ تم بچوں کے ساتھ کسی کھلے میدان میں کوئی

کھیل کھیلتے ہوئے بھاگتی پھرو۔“

”نہیں۔ مگر تم یہ کیسی باتیں کر رہی ہو ٹومی۔“ اساکو حیرت ہو رہی تھی۔

”تمہیں کیا پتا اساعلیٰ کہ اب بھی مجھے یہ سب کچھ کتنا اچھا لگتا ہے۔“

اس نے باہر دیکھتے ہوئے سوچا۔

”اور میرا کتنا جی چاہتا ہے کہ میں بھاگتی ہوئی باہر نکل جاؤں اور سارے میدان میں بچوں کے ساتھ ”پیٹھو گرم۔ پیٹھو گرم“ کا شور کرتی پھروں۔ ایک بار پھر سے ننھی بچی بن جاؤں اور پھر کہیں سے ظہیر آجائے۔ وہ بلا پتلا سا کیچڑ بھری آنکھوں والا لڑکا۔ ہم تم کو لینے آئیں گے۔ آئیں گے ٹھنڈے موسم میں۔“

دونوں ہاتھ کھڑکی کی چوٹ پہ رکھے لمحہ بھر کے لئے وہ جیسے دنیا و ما فیہا سے بے خبر ہو گئی۔ اس کے کان سائیں سائیں کرنے لگے۔

”ہم تم کو لینے آئیں گے۔ آئیں گے ٹھنڈے موسم میں۔“

”ہم ام کو لینے آئیں گے۔“

ظہیر اس کے سامنے کھڑا تھا۔ پھر ہولے ہولے اس کا قد بڑھتا گیا۔ اس نے آنکھیں مل کر دیکھا۔ وہ ظہیر تو نہیں تھا۔ کوئی اور تھا شاید عادل علی۔ ہاں وہ عادل علی ہی تھا گھنے سیاہ بالوں اور کشادہ پیشانی والا عادل علی۔ پھر اس نے ڈرتے ڈرتے اپنا ہاتھ بڑھایا اور اسکے پاؤں اکھڑ گئے۔ عادل علی نے اسے کھینچ لیا تھا۔ شور، ہنگامہ، تہقے۔ وہ بھی ہنس رہی تھی اور پھر یکایک نہ جانے کہاں سے میاں جی آگئے میاں جی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ عادل علی کا ہاتھ اس کے ہاتھوں سے چھوٹ گیا۔

”نہیں۔“ وہ آہستہ سے بڑبڑائی

”نہیں؟“

”اس کی آواز قدرے بلند ہو گئی۔“

”کیا ہوا ام؟“

چھوٹی آپا جو کمرے میں داخل ہو رہی تھیں بے اختیار اس کی طرف لپکیں۔

”ہاں!“

اس نے آنکھیں مل کر چھوٹی آپا کو دیکھا۔

”کیا ہوا ہے تجھے؟“

”کچھ نہیں چھوٹی آپا۔“ وہ ہوش میں آگئی۔

”نہیں۔ تیری طبیعت ٹھیک نہیں لگتی۔“

”میں ٹھیک ہوں چھوٹی آپا لیکن پتا نہیں کیوں سر خالی خالی سا لگ رہا ہے۔“

وہ زبردستی مسکرائی اور اساکے پاس آکر بیٹھ گئی۔

”میاں جی آگئے ہیں۔“

چھوٹی آپا نے ام کلثوم کی طرف تشویش سے دیکھتے ہوئے بتایا جس کا رنگ معمول سے کہیں زیادہ سرخ ہو رہا تھا ابھی لمحہ بھر پہلے تو اس کا چہرہ اتنا زرد ہو رہا تھا اور اب ایسا کیکی کیا ہو گیا ہے اے۔

”میاں جی آگئے ہیں۔“ اساکے دم کھڑی ہو گئی۔

”آپ نے ان سے بات کی؟“

”نہیں ابھی بات تو نہیں کی لیکن میں نے انہیں بتایا ہے کہ تم یعنی ام کی سہیلی آئی

ہے۔ انہوں نے تمہارے لئے دعائیں بھیجی ہیں۔“

”تو۔ تو۔ لمحہ بھر کو وہ مایوس سی کھڑی ہو گئی۔

”میں بات کرتی ہوں۔“ چھوٹی آپا نے کہا۔

”چلے چھوٹی آپا میں بھی آپ کے ساتھ چلتی ہوں۔“ اسانے کہا۔

”کوئی فائدہ نہیں اسماعلی سب بیکار ہے۔“

ام کلثوم نے دکھ سے سوچا۔

”اور یہ تو بڑی معمولی سی بات ہے اور تم یہاں ہی مات کھا جاؤ گی اور میرے خیال میں یہ اچھا ہی ہو گا کیونکہ مجھے اس کا ادراک ہے کہ کون سی خواہش تمہارے اندر پنپ رہی ہے اور تم کیا چاہتی ہو اور بہتر ہے کہ یہ خواہش تناور درخت بننے سے پہلے ہی مر جائے۔“

اسما چلی گئی تھی اور وہ یونہی دائیں ہاتھ کی ہتھیلی پر ٹھوڑی ٹیکے اوٹ پٹانگ باتیں سوچتی رہی۔ نہ جانے کتنی دیر گزر گئی۔ وہ یونہی اسی طرح بیٹھی تھی کہ اسما آگئی ہنستی ہوئی آنکھوں میں شوخ سی چمک لئے چھوٹی آپا اس کے ساتھ نہیں تھیں۔ آتے ہی اس نے اپنی بانہیں کلثوم کے گلے میں ڈال دیں اور اس کے رخسار چوم لئے۔

”تمہارے میاں جی نے اجازت دے دی ٹومی؟“

”نہیں۔“ اسے یقین نہیں آیا۔

”سچ۔“

”نا ممکن۔“

”سچ سچ۔ ٹومی یقین کرو تمہارے میاں جی تو اتنے اچھے اتنے نرم اتنے پولاٹ ہیں اور تم نے مجھے یونہی ڈر رکھا تھا۔“

”یہ کیا ہو گیا۔ کتنی انہونی، کتنی عجیب بات۔“ اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

اور اسما جوش سے بولے جارہی تھی۔ اسی طرح اس کے گلے میں بانہیں ڈالے اس کا چہرہ خوشی سے تمتما رہا تھا۔

”اور پتا ہے تمہارے میاں جی میرے دادا ابا کو بہت اچھی طرح جانتے ہیں۔ جب

میں نے انہیں بتایا کہ ہم ماسٹر شیر دل کے گھر ٹھہرے ہوئے ہیں اور وہ ہمارے دادا ابا کے دوست ہیں تو۔۔۔“

وہ خدا جانے کیا کیا کہہ رہی تھی۔ لیکن کلثوم کچھ نہیں سن رہی تھی۔ اس کا ذہن سائیں سائیں کر رہا تھا۔ ایسا نہیں ہونا چاہئے تھا۔ شاید کچھ غلط ہو گیا ہے۔ اس پر عجیب سی تھر تھری طاری تھی۔ پتا نہیں وہ کیوں خوش نہیں ہو پارہی تھی۔ اس کی خوشی ایسی ہی تھی جیسے بچے کو میلے میں موت کا کنواں دیکھ کر ہوتی ہے۔

”اور ٹومی جان۔“

اسانے اپنے بازو اس کے گلے سے نکالتے ہوئے کہا۔

”میاں جی نے کہا ہے کہ صبح تم عبد الحفیظ، عبد الماجد اور چھوٹی آپا ہمارے ساتھ ہی ساہیوال جائیں گے اور پھر عبد الحفیظ اور چھوٹی آپا رخصتی کے بعد واپس آجائیں گے۔ جبکہ تم اور ماجد وہاں سے ہی لاہور چلے جانا۔ ٹھیک ہے نا۔“

”ہاں شاید۔“ وہ ابھی تک الجھی ہوئی تھی۔

”یہ میاں جی نے انہونی بات کیوں کی؟“

”ام۔“

عبد الحفیظ نے دروازے کے پاس سے اسے پکارا۔

”ہاں۔“ اس نے چونک کر دیکھا۔

عبد الحفیظ کی نگاہیں اس پر تھیں۔ حریص، ترسی ہوئی بے قرار نظریں۔

”عبد الحفیظ کیا ہے؟“

اس نے سخت لہجے میں پوچھا۔

”میں نے ماسٹر صاحب کے گھر پیغام دے دیا ہے۔“

”اچھا۔“

”یہ عبدالحفیظ میرا بھائی۔“

اس نے مڑ کر اسما کو بتایا اور کھڑکی ہو گئی عبدالحفیظ ابھی تک دروازے پر کھڑا تھا اور اس کی نگاہیں اسما پر تھیں۔ بڑی بیزاری اور افسوس کے ملے جلے احساس کے ساتھ کلثوم کھڑی ہو گئی۔

”چلو حفیظ، چھوٹی آپا تمہیں پوچھ رہی تھی۔“ وہ عبدالحفیظ کے پیچھے پیچھے ہی باہر نکل آئی۔



”کنکاں پکیاں نی مائے۔“

ڈھولک کی تھاپ کے ساتھ گیت کے بول فضا میں ہوتے ہوئے ام کلثوم کے کانوں سے ٹکرائے تو بالوں میں برش کرتا ہوا اس کا ہاتھ لمحہ بھر کو رک سا گیا۔ ذرا سی دیر کے لئے تو سکون ملا تھا کہ پھر وہی ہنگامہ شروع ہو گیا ہے۔

اس نے زیر لب کہا اور برش سنگھار میز پر رکھ دیا۔ وہ جب سے یہاں آئے تھے یہی شور و غل اور ہنگامہ بپا تھا اسما اور آپا کی سہیلیاں سارا دن ڈھولک رکھے اوٹ پانگ گانے گاتی رہتی تھیں۔ اس کا دل تو دو ہی دن میں گھبرا سا گیا تھا۔ یہ بھی غنیمت تھا کہ اسما نے انہیں بالکل الگ ٹھہرایا تھا۔ سب مہمان اور شادی بیاہ کا ہنگامہ دوسری طرف تھا۔ اسما کے چچا کی کوٹھی میں۔ دونوں کوٹھیاں ساتھ ساتھ ہی تھیں۔ مشترکہ دیوار میں چھوٹا سادہ دروازہ تھا جس سے آمد و رفت جاری تھی۔ اسما نے ام کلثوم اور چھوٹی آپا کو اپنے والے حصے میں ٹھہرایا تھا۔ ادھر صرف گھر کے لوگ ہی مقیم تھے۔ عبدالماجد اور عبدالحفیظ کو گیسٹ ہاؤس میں ٹھہرایا گیا تھا۔ چھوٹی آپا اس انتظام سے خاصی مطمئن تھیں۔ اسما کا ایک پاؤں ادھر تھا اور ایک ادھر۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی وہ یہاں سے گئی تھی اور اسے تاکید کر گئی تھی کہ وہ جلدی سے تیار ہو جائے۔ اس نے برش ایک بار پھر اٹھا لیا اور مڑ کر چھوٹی

آپا کی طرف دیکھا جو دیوار کی طرف کروٹ لئے شاید سو رہی تھیں۔

”یہ سب کچھ کس قدر انہونا اور ناقابل یقین سا لگتا ہے۔“ اس نے جیسے اپنے آپ سے کہا۔

”ابھی تک مجھے یقین نہیں آ رہا کہ میں یہاں ہوں۔ اسما کے گھر میں اور میاں جی نے خوشی خوشی اس کی اجازت دے دی ہے۔ جب کہ بچپن میں اس کا کتنا جی چاہتا تھا کہ وہ کسی شادی میں شریک ہو۔ جھلملاتے گولے والے کپڑے پہنے اور ہاتھوں میں بھر بھر کے چوڑیاں ڈالے۔ لیکن میاں جی نے کبھی کہیں جانے ہی نہیں دیا۔ حتیٰ کہ پچھلے برس گڈو کی شادی میں جو اس کی بڑی اچھی سہیلی تھی اور جس کے ساتھ بچپن میں کئی بار اس نے ”کلکلی“ ڈالی تھی اور گولیاں کھیلی تھیں۔ میاں جی نے جانے کی اجازت نہیں دی تھی۔ حالانکہ اس کا گھر تو چند قدم پر تھا۔ بس گلی پار کر کے مسجد کے پیچھے اور اب یہاں اتنی دور اجنبی شہر میں۔ اجنبی لوگوں کے گھر آنے کی اجازت میاں جی نے دے دی تھی۔ کس قدر عجیب بات تھی۔ اس کا ذہن الجھا ہوا تھا پھر بھی اس کے اندر ایک نامعلوم سی خوشی رقص کر رہی تھی۔ یہ سب اس کیلئے بالکل نیا تھا۔ ڈھولک، گانے۔ ہنسی مذاق، یہ شور یہ ہنگامہ۔ ”کیا سب گھروں میں شادیاں ایسی ہی ہوتی ہیں اسما۔“

”ہاں تقریباً۔ مگر کیا تم کسی شادی میں شریک نہیں ہوئیں؟“

اسما کو حیرت ہوئی تھی۔

”ہاں۔ ہم کبھی کسی کے ہاں نہیں گئے۔ ایک متین چاچا کی شادی ہوئی تھی لیکن نہ ڈھولک بجی تھی نہ مہندی لگی تھی۔ نہ وہ دو لہا بنے اور بس شادی ہو گئی تھی۔“

اسے اسما کا گھر بھی اچھا لگا تھا اور اسما کی مُمی اور دوسرے لوگ بھی۔ سب لوگ کتنے محبت کرنے والے اور پیارے تھے۔

ڈھولک بے ڈھنگے انداز میں بج رہی تھی۔ شاید چھوٹے بچوں کے ہاتھ میں تھی

چھوٹی آپا نے کراہ کر روٹ بدلی۔

”کیا بات ہے چھوٹی آپا۔ کیا طبیعت بہت خراب ہے۔ وہ برش وہیں چھوڑ کر دونوں ہاتھوں سے بال سمیٹتی ہوئی ان کے پاس آکر بیٹھ گئی۔“

”ہاں۔ سارا جسم ٹوٹ رہا ہے ام شاید بخار ہو جائے۔“

ان کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور آنکھیں بھی سوجی ہوئی تھیں۔ اس نے ان کی پیشانی کو چھوا۔

”آپ کا جسم تو اب بھی گرم لگ رہا ہے چھوٹی آپا۔“

اس نے تشویش سے انہیں دیکھا۔

”آپ کی طبیعت اگر خراب تھی تو آپ نے گھر پر ہی کیوں نہ بتا دیا۔ ہم لوگ نہ

آتے۔“

”ہاں۔ ام طبیعت تو واقعی میری دو تین دن سے ٹھیک نہیں تھی لیکن میاں جی نے

کہا تھا کہ تمہارے ساتھ چھوٹی آپا میں ہم میں سے ایک ضرور جائے اور بڑی آپا تو جانے کے لئے تیار نہیں تھیں پھر تم کیسے آئیں یہاں۔“

”میرا آنا کوئی اتنا ضروری نہیں تھا چھوٹی آپا۔“ اس نے ان کا سر دباتے ہوئے کہا۔

”ضروری تو نہیں تھا لیکن میں چاہتی تھی کہ تم آؤ یہاں تم خوش ہوئی ہو نا یہاں

آکر اور لوگ تو ذرا اسی خوشی پانے کے لئے کیا کیا جتن کر ڈالتے ہیں اور پھر یہ تو کوئی

اتنی بڑی بات نہیں تھی۔ تیری خوشی کے لئے تجھے خوش دیکھنے کے لئے ام۔“

ان کی آواز بھرا گئی۔

”چھوٹی آپا۔“

ام کلثوم نے گلوگیر آواز میں کہا۔

”آپ مجھے کتنا چاہتی ہیں۔ شاید میری ماں ہوتی تو وہ بھی۔“

”نگلی!“

چھوٹی آپا نے آہستگی سے اس کے رخساروں کو چھوا۔

”میں بھی تو تیری ماں ہی ہوں۔ پتا ہے ام جب میں تمہیں دیکھتی ہوں تو مجھے اپنا

آپ یاد آتا ہے۔ جب میں چھوٹی تھی تو شاید میں تمہاری طرح نہیں سوچتی تھی لیکن

جب میں بڑی ہو گئی اتنی جتنی اب تم ہو تو میری سوچوں میں بڑا تغیر آگیا تھا میں نے

اتنی سی عمر میں زندگی کے کئی تجربے حاصل کر لئے تھے۔ تلخ تجربے، ناکام زندگی تھی

میری، پتا نہیں قصور کس کا تھا ام۔ ماں جی کا یا خود میرا اپنا کہ میں سمجھوتا نہیں کر سکی

تھی۔ لیکن میری خواہش ہے کہ تم ہمیشہ خوش رہو۔ تمہاری زندگی میری طرح ناکام نہ

ہو اور اگر کبھی زندگی میں تمہیں کوئی ”نور الامین“ ملے تو تم سمجھوتا کر سکو۔ تمہیں علم

ہو لوگوں کے بارے میں دنیا کے بارے میں اور ان ساری باتوں کے بارے میں جن کا

مجھے علم نہیں تھا اور۔۔۔“

”چھوٹی آپا۔“ ام کلثوم کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

”آپ کتنی اچھی ہیں چھوٹی آپا۔ آپ نے ہمیشہ میرے لئے میاں جی سے ضد کی

ہے۔ میاں جی سے لڑی ہیں۔ کیا اب بھی آپ ہی نے میاں جی سے یہاں آنے کی

اجازت لی ہے؟“

”نہیں۔ بس میاں جی نے خود ہی اجازت دے دی۔“

”ایک بات پوچھوں چھوٹی آپا۔“

”ہوں۔“

”آخر میاں جی نے ہمیں یہاں آنے کی اجازت کیوں دی ہے؟“ وہ ابھی تک اس

غیر متوقع بات پر پریشان ہو رہی تھی۔

”پتا نہیں۔“

چھوٹی آپا کو خود حیرت ہوئی تھی۔

”میرا خیال ہے تمہاری اس سہیلی کو بات منوانے کا ڈھنگ آتا ہے۔ اس نے بات ہی کچھ ایسے ڈھنگ سے شروع کی تھی کہ میاں جی کو قائل ہونا پڑا۔ شاید پہلے اس نے میاں جی سے دعوت کے بارے میں، رسول مقبول ﷺ کے کسی ارشاد کے بارے میں پوچھا تھا۔ بہت ذہین لڑکی ہے۔ اچھا خیر چھوڑو ان باتوں کو اسمانے کہا کیا تھا کہ وہ لوگ مہندی لگانے کب آئیں گے۔“

”یہی کوئی آٹھ نو بجے تک آئیں گے۔“

”اور ساڑھے سات تو بج گئے۔ چلو تم ہاتھ منہ دھو کر تیار ہو جاؤ۔“

”مگر چھوٹی آپا آپ کی تو طبیعت ٹھیک نہیں ہے اور فنکشن ختم ہوتے ہوتے تو بہت دیر ہو جائے گی۔“

”کوئی بات نہیں ام تمہاری خاطر چلی چلوں گی۔“

”مگر۔“

”اگر مگر کچھ نہیں۔ جاؤ۔“

چھوٹی آپا نے پیار سے اسے دیکھا۔

وہ کپڑے اٹھا کر ہاتھ روم میں چلی گئی۔

چھوٹی آپا نے آنکھیں موند لیں۔ اگرچہ ان کی طبیعت کافی خراب تھی لیکن وہ ام کو تنہا دوسری طرف نہیں بھیجنا چاہتی تھیں۔ مبادا انہیں میاں جی کے سامنے شرمندگی اٹھانا پڑے۔ حالانکہ اسمانے انہیں بتایا بھی تھا کہ یہ صرف عورتوں کا فنکشن ہے۔ مہندی کی رسم کے وقت مرد اندر نہیں آئیں گے لیکن گھر کے مرد تو ہوں گے ہی نا۔ سوچ کر انہوں نے ام کے ساتھ ہی جانے کا سوچا تھا۔ لیکن ابھی تو کافی وقت تھا اور پھر کون سا انہیں تیار ہونا تھا اس لئے وہ آنکھیں موندے پڑی تھیں۔ کہ اچانک آہٹ

ہوئی شاید دروازہ کھلنے کی آواز تھی۔ انہوں نے چونک کر آنکھیں کھول دیں اور گھبرا کر اٹھ بیٹھیں۔ ان کی نگاہیں آنے والے پر پڑیں۔ ”سوری۔“

آنے والے نے معذرت کی اور تیزی سے واپس پلٹ گیا مگر چھوٹی آپا کی نگاہیں ادھ کھلے دروازے پر جمی تھیں۔

”نور الامین۔“

ان کے ہونٹ ذرا سے وا ہوئے اور پھر بند ہو گئے۔ بلاشبہ وہ نور الامین ہی تھا سیاہ ڈزسوٹ میں ملبوس، کس قدر باوقار اور اچھا لگ رہا تھا۔

وہ اس طرح ساکت بیٹھی تھیں۔ انہیں نہ دوپٹہ لینے کا ہوش تھا اور نہ یہ احساس کہ ابھی کوئی غیر محرم اندر آیا تھا۔

”وہی چہرہ۔ وہی آنکھیں۔“

انہوں نے اپنی ٹھوڑی گھٹنوں پر ٹیک لی اور ان کا دل بے تحاشا دھڑک اٹھا۔ اور رخسار تہمتا اٹھے۔ بہت سی کہی ان کہی باتیں انکے کانوں میں گونجنے لگیں۔ اور ان کا سارا جسم تپ اٹھا، دہکنے لگا۔

مگر اس نے تو مجھے پہچانا ہی نہیں دیکھا ہی نہیں۔ اور اگر دیکھتا بھی تو بھلا اتنے سارے سالوں کے بعد وہ مجھے کیسے پہچانتا گیا رہ سال کی چھوٹی موٹی سی لڑکی جو ہاتھ لگانے سے سمٹ جاتی تھی اور جو خلوت میں بھی اپنے آپ کو بڑی سی چادر میں لپیٹے رکھتی تھی۔

”چھوٹی آپا کوئی آیا تھا؟“

ام کلثوم نے ہاتھ روم سے باہر نکلتے ہوئے پوچھا۔

مگر چھوٹی آپا یونہی اپنے دونوں بازو گھٹنوں کے گرد حائل کئے اور ٹھوڑی گھٹنوں پر رکھے ساکت بیٹھی تھیں۔

”چھوٹی آپا کی طبیعت؟“

ام کلثوم نے گھبرا کر ان کے کندھوں پر ہاتھ رکھ دیئے۔

چھوٹی آپا نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ ان کے ہونٹ کانپ کر رہ گئے۔ ان کا جی چاہا وہ خوب پھوٹ پھوٹ کر روئیں اور ان کی آنکھیں اتنی دیر ان، اتنی اجڑی اجڑی لگ رہی تھیں کہ ام کلثوم کے دل کو کچھ ہونے لگا۔

”چھوٹی آپا۔“ وہ روہانسی ہو گئی۔

”آپ بولتیں کیوں نہیں۔ کیا ہوا ہے آپ کو؟“

”کچھ نہیں۔“

انہوں نے سر جھکا کر آنسو پی لئے۔ اب وہ اسے کیا بتائیں کہ ایک برسوں پرانے زخم میں ٹیسیں اٹھ رہی تھیں اور پورا وجود جیسے دکھتا ہوا پھوڑا سا بن گیا تھا۔ تب ہی اسما صاحب معمول باہر ہی سے اسے پکارتی ہوئی اندر آ گئی۔

”ٹومی۔ ٹومی۔“

اندر آ کر اس نے ام کلثوم کو دیکھا جو فیروز رنگ کے سادہ سوٹ میں ہر اسال ۵ کھڑی تھی اور اس کے لمبے سیاہ بال گھٹنوں کو چھو رہے تھے۔ ایک ستائشی نظر اس پر ڈال کر اس نے خفگی سے پوچھا۔

”تم ابھی تک تیار نہیں ہوئیں ٹومی۔“

”میں تو تیار ہی ہوں بس صرف بال بنانے تھے مگر چھوٹی آپا کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“

”کیا ہوا چھوٹی آپا؟“

اسما ان کے قریب جا کر بیٹھ گئی۔

”چھوٹی آپا کیا ہوا آپ کو۔ میں ابھی عادل بھائی کو بھیج کر ڈاکٹر۔۔۔“

”نہیں۔ نہیں۔ ڈاکٹر کی ضرورت نہیں ہے۔“

چھوٹی آپا زبردستی مسکرائیں۔

”بس یونہی ذرا ساسر درد ہے۔ یہ ام تو یونہی گھبرا جاتی ہے۔“

”تو بس پھر جلدی سے تیار ہو جائیے۔“

”نہیں ایسا کرو تم ام کو لے جاؤ۔ میں کچھ دیر آرام کروں گی۔“

”مگر میرا جانا کیوں ضروری ہے اسی!“

”کیا مطلب؟“

اسما نے آنکھیں نکالیں۔

”میں اس طرح چھوٹی آپا کے بغیر کیسے جاؤں پھر ان کی طبیعت بھی تو ٹھیک نہیں ہے۔“

”نہیں ام تم جاؤ اور میری فکر مت کرو۔ میں کچھ دیر سوؤں گی۔“

ام کلثوم نے حیرت سے انہیں دیکھا۔

”مگر ابھی تو آپ نے کہا تھا کہ آپ بھی میرے ساتھ چلیں گی؟“

”ہاں کہاں تو تھا مگر اب میرا جی نہیں چاہ رہا تم چلی جانا۔“

”مگر چھوٹی آپا میں اکیلی؟“

”ہاں ہاں کیا حرج ہے۔“

چھوٹی آپا نے اس کی بات کاٹ دی۔ بظاہر تو وہ باتیں کر رہی تھیں لیکن ان کے ذہن میں طوفان اٹھ رہے تھے۔ بالآخر انہوں نے پوچھ ہی لیا۔

”ابھی بھی یہاں کون آیا تھا اسما؟“

”سوری چھوٹی آپا۔ وہ نور انکل تھے۔ دراصل انہیں پتا نہیں تھا وہ غلطی سے ادھر آ گئے۔ بلکہ غلطی میری تھی میں نے ہی ان سے کہا تھا کہ آنٹی اور بچے آخری کمرے میں

ہیں۔ لیکن یہ بتانے کا خیال نہیں رہا تھا کہ چچا ابا والے حصے میں ہیں۔ دراصل ان کے بیوی بچے پہلے آگئے تھے وہ ابھی آئے ہیں میں بہت نادام ہوں چھوٹی آپا۔“

چھوٹی آپا ہونٹ بھینچے بیٹھی تھیں۔

”آپ ناراض ہو گئیں؟“

”نہیں۔ کیا نام بتایا تھا تم نے؟“

”انکل نوری۔ نور الامین ان کا پورا نام ہے۔ ڈیڈی کے ساتھ مقصد میں کام کرتے

ہیں۔“ اچھا۔“

تو یہ وہی تھا۔ چھوٹی آپا نے سچا۔ ان کا رنگ خطرناک حد تک زرد ہو رہا تھا۔

”میں سچ بچ بہت شرمندہ ہوں چھوٹی آپا۔“ اس نے پھر معذرت کی۔

”کوئی بات نہیں بیٹا۔ شادی بیاہ میں تو ایسا ہوتا ہی رہتا ہے۔“

”اچھا تو پھر آپ ٹومی سے کہیں ناکہ میرے ساتھ چلے۔“ کلثوم نے سوالیہ

انٹروں سے انہیں دیکھا۔

”ہاں جاؤ ام چلی جاؤ۔“

ان کے وجود میں دھواں سا بھرا ہوا تھا۔ اتنے سارے سالوں بعد نور الامین کو دیکھ

کر ان کے اندر بغاوت سی پیدا ہو رہی تھی۔ یہ شخص جو آج بڑا متین، بڑا بردبار لگ رہا

تھا اور جو انہیں آج پہچانتا بھی نہیں اسے انہوں نے کھو دیا تھا محض۔ محض یکایک ان

کے اندر بہت سا غصہ بھر گیا۔ حافظ جی، ماں جی، میاں جی سب کے لئے۔ اگر اس طرح

وہ گھر میں بند ہو کر نہ پلٹیں تو شاید آج۔ اور اب یہ ام ہے جس کے لئے وہ راجیں ہموار

کرنا چاہتی تھیں۔

انہوں نے سر اٹھا کر اسے دیکھا وہ ابھی تک تذبذب کے عالم میں کھڑی تھی۔

انہوں نے پیار سے اسے دیکھا۔

”جاؤ ام، کنگھی کر لو اور اسماء کے ساتھ جاؤ۔ اور میرے لئے اسما بیٹا سر درد کی ایک گولی بھیج دینا۔“

”جی اچھا!“

اسماء نے کلثوم کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”چلو میرے کمرے میں وہیں چل کر تیار ہو لینا۔“ اور اسما حیرت زدہ سی اس کے

ساتھ باہر چلی آئی۔

ایسا کروٹومی تم بھی ساڑھی باندھ لو۔ ہم سب لڑکیاں آج ساڑھیاں باندھ رہی

ہیں۔ گہرے سبز رنگ کی ساڑھیاں میرے پاس ایسے ہی ملتے جلتے رنگ کی ایک اور

ساڑھی بھی ہے۔ میرا بلاؤز تمہیں ٹھیک ہو گا۔“

”نہیں میں ساڑھی وغیرہ نہیں باندھوں گی بس یہی کپڑے ٹھیک ہیں۔“

”مگر یہ تو بہت سادہ ہیں ٹومی اور تمہیں پتا ہے مہندی کے فنکشن میں تو سب ہی

بڑے جھلملاتے کپڑے پہن کر آتے ہیں۔“

مگر اس کے بے حد اصرار کے باوجود بھی ام کلثوم ساڑھی باندھنے پر تیار نہ ہوئی۔

اس نے اپنے وار ڈروب سے فیروز رنگ کا والا دوپٹا نکالا۔

”یہ دوپٹا تمہارے سوٹ کے ساتھ میچ کر رہا ہے پلیز اب انکار نہ کرنا۔“

اور پھر اس کے نہ نہ کرنے کے باوجود اس نے اس کا ہلکا ہلکا میک اپ کر دیا۔ اور

بالوں کو سامنے سے سیٹ کر کے یوں ہی کھلا چھوڑ دیا۔ نہیں اسما پلیز یہ کھلے بال اس

طرح اچھے نہیں لگتے مجھے۔“

”بس ٹومی۔ آج کے دن تو میری بات مان لو اور اس وقت ذرا آئینے میں دیکھو کتنا

غضب ڈھار ہی ہو۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں تمہیں میری نظر ہی نہ لگ جائے۔“

”بناؤ مت۔“

وہ شرمائی۔ لیکن اس نے اسے بازوؤں سے پکڑ کر اس کا رخ آئینے کی طرف کر دیا۔
لہجہ بھر کو تو وہ خود بھی مبہوت سی رہ گئی۔

”کیا یہ میں ہوں۔ میں ام کلثوم۔ میاں جی کی بیٹی۔“
قد آدم آئینے میں اس کا پورا کا پورا وجود نظر آ رہا تھا۔
”ارے۔“

اسامیڈ سے اپنی ساڑھی اٹھاتی ہوئی چونک پڑی۔

”مجھے تو یاد ہی نہیں رہا۔ چھوٹی آپا انتظار کر رہی ہوں گی۔“

”اچھا تم یہیں بیٹھو میں جا کر چھوٹی آپا کو سردرد کی گولی دے آؤں۔“

اسما کے جانے کے بعد اس نے مختلف زاویوں سے اپنے آپ کو آئینے میں دیکھا
”ہاں یہ میں ہی ہوں۔ ام کلثوم مگر کس قدر مختلف اور۔“

”اوہ۔ اسما بھی کہاں ہو تم کو صبح سے ڈھونڈ رہا ہوں۔“ تمہیں۔“

کوئی اسما کو پکارتا ہوا اندر آ گیا تھا وہ دوپٹا ٹھیک کرتے ہوئے بڑی تیزی سے پلٹی
عادل علی کے ہاتھوں سے پردہ چھوٹ گیا۔ اس کی نگاہیں ام کلثوم کے چہرے پر نکی،
تھیں اور ام کلثوم کے رخسار دھک رہے تھے۔ دوپٹا سر سے سرک کر گر گیا تھا لیکر
عجیب بے خودی کے عالم میں کھڑی تھی۔ کھوئی کھوئی گھبرائی گھبرائی سی۔ نگا
جھکائے ایک ہنسی غیر مرد کے سامنے بالکل تنہا اور اکیلی اور اگر ایسے میں میاں جی
لیں تو۔؟

یکبارگی اس کا دل اتنی زور سے دھڑکا جیسے ابھی سینے کی دیواریں توڑ کر باہر
آئے گا۔ اس نے جھک کر دوپٹا اٹھایا اور اپنا رخ بدل لیا۔

حیران و ششدر کھڑے عادل علی چونکے۔ وہ نگاہیں جو ابھی اس کے دہکتے چہر
کا طواف کر رہی تھیں اس کے سیاہ ریشمی بالوں میں الجھ گئیں۔ مگر انہوں نے اس

سے خود کو نکالا اور دو قدم آگے بڑھے۔

”مس ثوی۔ کیسی ہیں آپ؟“

”جی ٹھیک ہوں۔“

اس نے پھنسی پھنسی آواز میں کہا۔ وہ ان کی طرف پیٹھ کئے کھڑی تھی۔

”آپ نے شاید مجھے پہچانا نہیں میں عادل ہوں۔ اسما کا بھائی ایک بار ہوٹل میں
آپ سے ملاقات ہوئی تھی۔“

”جی!“

”شاید آپ کو میری آمد ناگوار گزری ہے۔ میں شرمندہ ہوں مجھے گمان تک نہیں
تھا کہ آپ یہاں ہوں گی میں تو اسما کی تلاش میں آیا تھا۔ لیکن بعض غلطیاں بڑی
خوبصورت ہوتی ہیں اگر میں اس وقت یہاں نہ آتا تو۔ پلیز ادھر دیکھئے نامیری طرف یہ
آپ پیٹھ کئے کیوں کھڑی ہیں۔“

اس کا جی چاہا کہ وہ کہے۔

”اس لئے کہ میرا آپ کا کوئی رشتہ نہیں اور میاں جی کہتے ہیں کہ کسی غیر مرد کی
نگاہ بھی تم پر نہ پڑے بلکہ تمہاری نگاہ بھی کسی غیر مرد پر نہ پڑے۔“

لیکن اس نے یہ سب کچھ نہ کہا بلکہ ایک غیر اختیاری جذبے کے تحت اس نے رخ
بدلا اور ذرا کی ذرا اس کی نظریں عادل علی کی نظروں سے ٹکرائیں اور پھر جھک گئیں وہ
بڑی وارفتگی، بڑے اشتیاق سے اسے دیکھ رہا تھا، اتنے سارے بیٹے سالوں میں مجھے کوئی
لڑکی شاید اس لئے پسند نہیں آئی تھی کہ مجھے آپ سے ملنا تھا۔ بالکل اچانک ایک عام سی
شام کو بالکل ان کہانیوں کے شہزادوں کی طرح جو بچپن میں، میں پڑھا کرتا تھا۔“

”جی!“ کلثوم کی آنکھوں میں حیرت اتر آئی۔

پتا نہیں وہ کیا کہہ رہا تھا۔

اسمانے خوش ہوتے ہوئے پوچھا۔
”ہاں۔“

کلثوم نے سر جھکاتے ہوئے بتایا۔

”ہوں و نذر فل۔ پتا ہے ابھی جب میں تمہیں تیار کر رہی تھی تو میں نے سوچا کہ کاش عادل بھائی بھی تمہیں اس روپ میں دیکھ لیں۔“

اور اس کی خواہش کا پس منظر جاننے کے باوجود اسمانے خفگی سے کہا۔

”تم ہمیشہ فضول باتیں ہی سوچا کرتی ہو۔“

”یہ فضول بات نہیں ہے مائی ڈیر فرینڈ بلکہ میں تمہیں اپنی پیاری بھابی بنانا چاہتی ہوں سمجھیں۔“ اور وہ سن سی ہو گئی۔ اسمانے پہلی بار یوں واضح الفاظ میں بات کی تھی۔ اشاروں کنایوں میں تو کئی بار اس نے اظہار کیا تھا۔

”بھئی، میاں جی، تمہاری شادی تو کریں گے ہی ناکہیں نہ کہیں تو پھر اگر میرے بھائی سے ہو جائے تو کیا مضائقہ ہے۔ ویسے میاں جی کا آئیڈیل کیا ہے وہ تمہارے لئے کیسا لڑکا پسند کریں گے۔“

اور ام کلثوم کو یاد آیا کہ جب میٹرک کے بعد میاں جی اس کی شادی کرنا چاہ رہے تھے تو انہوں نے بڑی آپا سے کہا تھا۔ کہ امت الرشید لڑکا کیسا ہی ہو بس اس میں دو خوبیاں ضرور ہوں پانچوں وقت نماز پڑھتا ہو اور سگریٹ نہ پیتا ہو اور محض ان دونوں خوبیوں کے نہ ہونے پر انہوں نے منصور احمد کا رشتہ ٹھکرادیا تھا۔ حالانکہ وہ رشتے میں ان کا بھانجا لگتا تھا۔ اور بڑی آپا اور چھوٹی آپا کو پسند بھی آیا تھا اور اس نے بڑی سادگی سے یہ بات اسما کو بتادی۔

”سگریٹ تو عادل بھائی پیتے ہی نہیں اور اب رہی پانچوں وقت نماز پڑھنے کی بات تو یہ ایسی مشکل بات نہیں ہے۔ فرہاد نے نہر کھودی تھی تو کیا عادل بھائی اتنا بھی نہیں

”شاید پھر کبھی میں آپ کو اپنا مطلب سمجھا سکوں لیکن اس وقت صرف اتنا کہوں گا کہ آپ آج بے انتہا خوبصورت لگ رہی ہیں۔“ اس کے دیکتے رخسار اور دہک اٹھے اور پلکیں بوجھل ہو گئیں۔ میاں جی کی ساری نصیحتیں، ساری ہدایتیں وہ بھول گئی۔ ایک پل میں ذہن کی سلیٹ صاف ہو گئی تھی اور باغی دل کہہ رہا تھا کہ وہ بولتا رہے اور وہ سنتی رہے۔ وہ اجنبی غیر مرد جسے آج تک اس نے دھیان سے دیکھا تک نہیں تھا لیکن جس کا نام سنتے ہی اس کی دل کی دھڑکنیں تیز ہو جاتی تھیں۔ وہ اس کے سامنے کھڑا تھا۔

”اسمانے کہاں رہ گئی ہے۔“

اس نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا۔

”اوہ۔ آپ پریشان نہ ہوں۔ میں جا رہا ہوں۔“

”خدا حافظ۔“

اس کے ہونٹ ہلے لیکن الفاظ ادا نہ ہوئے۔ عادل علی ایک گہری نظر اس پر ڈال کر باہر نکل گئے۔

”یہ۔ یہ کیا ہو گیا۔ ایسا نہیں ہونا چاہئے تھا اور میں کتنی کمزور کتنی بودی ہوں۔ میں کیوں بیٹھی رہی یہاں۔ کیوں سنتی رہی ان کی باتیں اور اگر چھوٹی آپا کو پتا چل گیا تو وہ کیا سوچیں گی کہ میں یہاں غیر مردوں سے باتیں کرتی پھرتی ہوں۔ وہ سہمی سہمی سی بیڈ پر بیٹھ گئی۔ تب ہی اسما آ گئی۔

”تم کہاں رہ گئی تھیں اسما۔“

”بھئی کیا بتاؤں پورے گھر میں کہیں سے سردرد کی گولی نہیں ملی، ادھر آنٹی وغیرہ

سے بھی پوچھ آئی اور پھر بازار سے منگوائی۔“

”وہ تمہارے بھائی آئے تھے تمہیں ڈھونڈ رہے تھے۔“

”کون عادل بھائی آئے تھے یہاں۔“

”ہاں ان لوگوں کا پروگرام رت جگامنا ہے۔“
 ”نہیں پلیز اسامیہ جانے دو چھوٹی آپا کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں تھی اور پھر میں
 بھی بہت تھک گئی ہوں۔“
 ”اچھا خیر چلتے ہیں۔“
 اسامیہ ادھر ادھر دیکھا۔

”ارے عادل بھائی کہاں جا رہے ہیں۔“

سر جھکائے اپنی ہی دھن میں مست عادل کو ایک طرف جاتے دیکھ کر اس نے پکارا۔
 عادل نے اس کی آواز پر مڑ کر اسے دیکھا اور پھر اس کے قریب کھڑی کلثوم کو
 دیکھا اور لبوں پر ایک دلکش مسکراہٹ سجائے ان کے قریب چلے آئے۔

”کیا اب سونے کی اجازت نہ ہوگی اسامیہ بی بہت تھک گئے ہیں؟“

ان کی نگاہیں کلثوم کے چہرے پر تھیں اور وہ گھبرا رہی تھی۔

”اوہ۔ عادل بھائی پلیز آپ گھر ہی جا رہے ہیں نا تو یہ ٹومی کو بھی لیتے جائیے۔“

”ٹومی! وہ اس کی طرف مڑی۔“

”ایسا کرو تم ادھر عادل بھائی کے ساتھ چلی جاؤ۔ یہ دو قدم پر ہی تو ہے۔“

”مگر۔ مگر اسامیہ اکیلی ہی چلی جاؤں گی۔“

”ارے نہیں عادل بھائی ادھر ہی جا رہے ہیں۔“

”مگر اسامیہ۔“

لیکن اسامیہ نے اسے بات مکمل ہی نہیں کرنے دی۔ اچھا گڈ نائٹ ڈیر۔“

اور جھپاک سے ساتھ والے کمرے میں گھس گئی۔ لمبے چوڑے کوریڈور میں ذرا

سی دیر کے لئے وہ حیران ششدر کھڑی سی رہ گئی۔

”چلے۔“ عادل نے شائستگی سے کہا۔ مگر وہ بو نہی کھڑی تھی۔

کر سکتے۔“ ثواب مفت میں مل جائے گا اور تم ایسی پیاری سی لڑکی ”اسامیہ تمہیں آج
 ہو گیا ہے؟“

کلثوم نے اسے ٹوکا۔

”مجھے۔ کچھ نہیں۔“

اسامیہ جھک کر شوخی سے اس کی پیشانی چوم لی اور ساڑھی اٹھا کر ہاتھ روم:
 گھس گئی۔ اور کلثوم کی نگاہیں کارنس کی طرف اٹھ گئیں جہاں سب کے ساتھ عادل
 کی بھی بڑی خوبصورت سی تصویر تھی۔ دھڑکتے دل کو سنبھالے وہ غیر ارادی طور پر ا
 کر کارنس کے پاس چلی آئی۔ ”کیا؟ کیا ایسا ممکن ہے یہ اس قدر وجہ، خوبصورت
 انسان اور وہ کنار کارنس پر ٹیک کر بڑے دھیان سے تصویر دیکھنے لگی۔“



کھڑے کھڑے اس کے پاؤں دکھنے لگے تھے لیکن اسامیہ یہاں کھڑا کر کے خو
 جانے کہاں چلی گئی تھی۔ لڑکے والے مہندی لگا کر جا چکے تھے۔ ڈنر کب کا ختم ہو چکا
 لیکن ابھی تک ایک ہنگامہ سا تھا۔

”چھوٹی آپا انتظار کر رہی ہوں گی اور یہ اسامیہ جانے کہاں رہ گئی ہے۔“

اس نے بے چینی سے پہلو بدلاتی ہی اسامیہ سے آتی نظر آئی تو اس نے خ

شکر ادا کیا۔

”کہاں رہ گئی تھیں تم۔ چھوٹی آپا ابھی تک جاگ رہی ہوں گی۔“

”مجھے آپ کی سہیلیوں نے پکڑ لیا تھا اور ان کا اصرار ہے کہ میں ادھر ہی رہ کر

کے ہاتھوں پر مہندی لگاؤں۔ فائن آرٹس پڑھنے کا نقصان ہوا ہے یا کیا کروں تم

ادھر ہی رہ جاؤ۔“

”میں۔“

”کیا رات یہیں گزارنے کا ارادہ ہے۔“

عادل نے شوخی سے پوچھا تو اس نے چونک کر ادھر ادھر دیکھا۔ سارا کور سنسان پڑا تھا۔ البتہ کمروں سے باتوں اور ہنسی کی آوازیں آرہی تھیں۔

اس نے آہستگی سے قدم آگے بڑھادیے عادل اس کے ساتھ ساتھ چل رہے۔

”سینس، ٹومی!“

”جی!“

”اگر آپ مائنڈ نہ کریں تو ایک بات کہوں۔“

”جی۔“

اس نے اپنی بڑی بڑی حیران آنکھوں سے انہیں دیکھا اور پھر نگاہیں جھکا لیں۔

”جب سے آپ سے ملا ہوں ایک ہی بات سوچ رہا ہوں کیا زندگی میں ایک

وقت بھی آتا ہے کہ کوئی شخص ایک بالکل ہی اجنبی شخص دل کو اتنا اچھا لگنے لگے کہ

کی باتوں پر جھرنوں کے ترنم کا گمان ہو اس کی آنکھوں کی جگہ گاہیں بہروں کو ماند

نظر آئیں۔“ ان کی متجسس نظریں اس کے چہرے کا طواف کر رہی تھیں اور ان

دلوں میں ایک بالکل نرالا اور انوکھا جذبہ سراٹھارہا تھا۔ یہ جذبہ ان سارے جذبوں

مختلف تھا جو اس سے قبل ان کے دل میں پیدا ہوتے رہے تھے اس کا رنگ سب

منفرد تھا اور اسکی چمک سب سے جدا تھی۔ تو کیا یہ سب سے انوکھا سب سے نرالا

محبت کا ہے۔

انہوں نے بڑی خوش دلی سے سوچا۔

”ہاں شاید یہی محبت ہے کہ میرا دل اس اجنبی شخص کے قرب پر مسرور ہے

تیزی سے دھڑک رہا ہے۔“

ام کلثوم نے سوچا۔

اس کے چہرے پر گلابی چمک تھی اور ہونٹوں پر دلکش مسکراہٹ تھی عادل علی چلتے چلتے بار بار رک جاتے اس کے گلابی ہونٹوں پر کچی ہوئی مسکراہٹ کو دیکھ کر انہیں نئی نئی تشبیہیں سوجھ رہی تھیں اور بڑے پرانے پرانے شعر یاد آرہے تھے۔

”ہاں تو میں۔“

انہوں نے ٹوٹی ہوئی بات کا سراپکاڑے۔

”کیا ایسا ممکن ہے۔“

”جی ہوتا نہیں۔“ اس نے پھنسی پھنسی آواز میں کہا۔

”میں نے جب سے آپ کو دیکھا ہے تب سے آپ کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔

کبھی کبھی مجھے لگتا ہے جیسے میں تو۔۔ ازل سے آپ کو جانتا ہوں۔

”وہ میرے بارے میں سوچتا ہے۔“ ام کلثوم نے سوچا۔

”اور میں بھی تو سوچتی ہوں اور شاید یہی محبت ہے جس کا اتنا تذکرہ سنا ہے۔

کتابوں میں رسالوں میں کہانیوں میں، افسانوں میں محبت جو ازل سے ہے اور ابد تک

رہے گی اور جس پر اس کائنات کی بنیادیں رکھی گئی ہیں۔

محبت کیلئے مہینوں، سالوں، صدیوں کی ضرورت نہیں ہوتی ٹومی اس کے لئے تو

ایک لمحہ ہی بہت ہوتا ہے۔“

”ہاں۔“ اس نے دل ہی دل میں تائید کی۔

”شاید محبت کے لئے صدیوں، مہینوں، سالوں کی ضرورت نہیں ہوتی اس کے

لئے تو ایک لمحہ ہی بہت ہوتا ہے اور محبت کا یہ الوہی لمحہ ابھی ابھی اس کے دل میں اترا

تھا۔ اور اس کے اندر یہاں سے وہاں تک قہقہے جل اٹھے تھے۔

اگر یہی محبت ہے ام کلثوم تو مجھے آپ سے محبت ہے۔ آپ میری اس جسارت پر

خفا تو نہیں ہونیں۔“

اس کی سمجھ میں ہی نہ آیا کہ وہ کیا کہے اس کا دل اس کا ذہن کچھ بھی تو اس کے اختیار میں نہیں تھا۔ بس ایک خواہش، ایک تمنادل کے اندر پیدا ہو رہی تھی کہ یہ چند قدموں کا فاصلہ کبھی ختم نہ ہو۔ وہ دونوں چلتے رہیں یونہی آہستہ آہستہ اور یہ شخص۔ یہ اس قدر پیارا اتنا جیہہ، اتنا اچھا شخص اتنی ہی خوبصورت باتیں کرتا رہے یونہی اس کے کانوں میں رس گھولتا رہے۔ اور یکایک اس کے کانوں میں سیٹیاں سی گونجنے لگیں پھر یہ سیٹیاں سرگوشیوں میں ڈھل گئیں۔

ہم تم کو لینے آئیں گے۔ آئیں گے ٹھنڈے موسم میں اور پھر جانے کہاں سے بوتل کے جن کی طرح میاں جی نمودار ہو گئے۔ اس نے غیر ارادی طور پر اپنا منہ پیچھے کیا اور زمین اس کے پاؤں کے نیچے سے کھسنے لگی وہ لڑکھرائی۔

عادل علی نے جو اسے ہی دیکھ رہے تھے فوراً اس کا ہاتھ تھام لیا۔
کیا ہوا۔

اس نے عادل علی کو دیکھنا چاہا لیکن آنکھوں میں مرچیں سی بھری ہوئی تھیں۔
”آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے۔“

اس نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری کچھ کہنا چاہا لیکن۔
آواز حلق میں ہی پھنس گئی۔

”آپ حوصلہ کریں۔“

عادل علی نے سہارا دیا۔ ”یہ چند قدم کے فاصلے پر تو آپ کا کمرہ ہے۔“

وہ کچھ بولی نہیں بس دل و دماغ میں دھواں سا اٹھ رہا تھا۔ پھر یکایک لائٹ چلی گئی لیکن عادل علی اس کا ہاتھ تھامے اندھیرے میں ہی چلتے رہے۔

”آپ سے تو چلا ہی نہیں جا رہا۔“

انہوں نے آہستگی سے کہا ان کے ہاتھ میں دبا اس کا ہاتھ ٹھنڈا ہو رہا تھا۔ اس کا دل چاہا وہ ان سے کہے وہ اسے یونہی چھوڑ کر چلے جائیں لیکن آواز جیسے اندر ہی کہیں کھو گئی تھی۔ برآمدے کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے لائٹ آگئی۔ لیکن اس کی آنکھوں کے سامنے دھند چھائی ہوئی تھی پھر بھی اس نے ہمت کر کے اپنا ہاتھ چھڑایا اور تیزی سے کمرے میں جانا چاہا لیکن لڑکھڑا گئی۔ ایک انجانا سا خوف تھا جس کے عفریت اسے چاروں طرف سے جکڑ رہے تھے۔

”چھوٹی آپا۔“

”چھوٹی آپا!“

اس نے بھینچی بھینچی آواز میں کہا اور دیوار سے ٹیک لگا کر گہرے گہرے سانس لینے لگی۔

عادل علی نے اس کی زرد ہوتی رنگت کو دیکھا اور گھبرا کر دروازے پر دستک دی۔
چھوٹی آپا شاید جاگ رہی تھیں انہوں نے فوراً ہی دروازہ کھولا مگر عادل کو دیکھ کر پیچھے ہٹ گئیں۔

”سنیں۔ سنیں۔ پلیز وہ کلثوم مس کلثوم کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی ہے۔“

”کیا۔ کیا ہوا ہے۔“

چھوٹی آپا گھبرا کر باہر نکل آئیں۔

”کیا ہوا ہے کہاں ہے وہ۔“

اور پھر عادل علی کے اشارے پر انہوں نے ام کلثوم کو دیکھا جو دیوار سے ٹیک لگائے آنکھیں بند کئے بیٹھی تھی وہ تیزی سے اس کی طرف لپکیں انہیں یہ بھی خیال نہ رہا کہ وہ اس وقت ایک اجنبی مرد کے سامنے کھڑی ہیں اس کے قریب بیٹھتے ہوئے انہوں نے اس کا سراپے سینے سے لگا لیا۔

”ام۔ ام کیا ہوا تمہیں۔“ ام کلثوم گہرے گہرے سانس لیتی رہی۔

”آپ انہیں اندر لے جائیں میں ڈاکٹر کو لے کر آتا ہوں۔“

عادل علی کی آواز پر چونک کر انہوں نے شک بھری نظروں سے اسے دیکھا۔

یہ میں نے اسے اکیلا کیوں بھیج دیا تھا۔ اجنبی لوگوں کا کیا بھروسہ اور جو میاں جی نے۔

پچھتاوے کے احساس نے انہیں مزید پریشان کر دیا۔ ان کی سیاہ لابی خوبصورت

آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

”آپ گھبراہٹ میں پلیر میں ابھی ڈاکٹر کو لے کر آتا ہوں۔“

”اسما کہاں ہے؟“

”وہ ادھر آپ کے پاس ہے میں اسے بلا لاتا ہوں اچانک چلتے چلتے ان کی طبیعت

خراب ہو گئی میں۔“ وہ ذرا سا جھکا۔

”میں ان کے پیچھے ہی آ رہا تھا۔“

چھوٹی آپا نے سر جھکا لیا۔ وہ خلوص جو اس کی آنکھوں سے جھلک رہا تھا اور وہ

شرافت جو اس کی آنکھوں سے عیاں تھی اس نے انہیں تادم کر دیا۔ انہیں اپنی سوچ پر

تاسف ہوا۔ ام تو پہلے بھی بیمار ہو جایا کرتی تھی لیکن چونکہ کافی عرصہ سے اسے دورہ

نہیں پڑا تھا اس لئے ان کا دھیان ادھر گیا ہی نہیں تھا۔ انہوں نے سہارا دے کر اسے

اٹھایا اور کمرے میں لے آئیں۔

”میں اسما کو بھیج کر ڈاکٹر کے پاس جاتا ہوں۔“

عادل علی مڑے۔

”نہیں مت جائیں۔ آپ، دراصل شاید ہنگامے سے گھبرا گئی ہے۔ اب ٹھیک ہے

کیوں بیٹا۔“

انہوں نے ام کلثوم کی طرف دیکھا، کلثوم نے سر ہلا دیا۔

”مگر ڈاکٹر دیکھ لیتا تو اچھا تھا۔“ وہ پریشان لگ رہے تھے۔

اس وقت ڈاکٹر کا ملنا مشکل ہے اور پھر وہ اب ٹھیک ہے۔“

چھوٹی آپا نے بات ختم کر دی اگرچہ عادل علی وہاں رکنا چاہ رہے تھے لیکن مناسب

نہیں تھا اس لئے بادل خواستہ خدا حافظ کہہ کر مڑے۔

”اگر رات کو ان کی طبیعت زیادہ خراب ہو جائے تو پلیر تکلف نہ کیجئے گا۔ می وغیرہ

کو جگا لیجئے گا۔“

چھوٹی آپا نے سر ہلا دیا۔ اور عادل علی کے جانے کے بعد مڑ کر کلثوم کو دیکھا۔

جو بے بسی سے انہیں دیکھ رہی تھی۔

”یہ کون تھا بیٹا۔“

”شاید اسما کا بھائی ہے۔“

”کس قدر سلجھا ہوا لڑکا ہے۔“ چھوٹی آپا نے سوچا۔ اور یہ آج کس قدر انہونی

باتیں ہو رہی ہیں اور اگر میاں جی کو پتہ چلے کہ وہ یوں کھلے سر اجنبی مردوں سے باتیں

کر رہی ہیں تو۔۔

”چھوٹی آپا۔“ ام کلثوم نے انہیں پکارا۔

”چھوٹی آپا میرا دم گھٹ رہا ہے۔“

”یہاں تو گھٹن نہیں ہے۔“ انہوں نے سوچا۔

مگر نہیں شاید یہاں بھی گھٹن ہے ان کا دم بھی تو گھٹ رہا ہے جیسے کوئی دل کو

ہاتھوں میں لئے بھینچ رہا ہو۔

”ام!“ انہوں نے اس کا سر اپنے سینے سے لگا لیا۔

”چھوٹی آپا میں کیا کروں۔“

وہ ان کے کندھے پر سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی چھوٹی آپا نے بازو اس

کے گرد حائل کر لئے۔
”حوصلہ کر بیٹا۔“

مگر آنسو خود ان کی آنکھیں میں اکٹھا ہو رہے تھے۔ وہ بھی تو رونا چاہ رہی تھیں۔
جب سے انہوں نے نور الامین کو دیکھا تھا ان کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ روئیں خوب زور زور سے چیخ چیخ کر روئیں۔ جب نور الامین نے انہیں طلاق دی تھی تو وہ روئی نہیں تھیں بلکہ انہیں۔ تو خوشی کا، رہائی کا احساس ہوا تھا۔

یہ تو بہت سالوں بعد ایک شام ان کا دل رونے کو چاہا تھا اور انہیں احساس ہوا تھا کہ وہ کتنے گھائے میں رہی تھیں وہ ولی اللہ نہیں انسان تھیں۔ اس کے بعد اکثر شام ڈھلے ان کا دل یونہی گھبرااتا تھا۔

انہوں نے ام کو زور سے اپنے ساتھ بھیج لیا اور خود بھی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔



”اور میں شاید ریت پر محل تعمیر کر رہی ہوں۔“

ام کلثوم نے کاپی پر آڑی ترچھی لکیریں مارتے ہوئے سوچا۔

مگر کبھی کبھی ریت سے محل بنانے میں بھی کتنا سکون ملتا ہے یہ جاننے کے باوجود کہ ذرا سی ہوا انہیں ڈھادے گی۔ اور پچھلے تین سالوں سے وہ اسی خوشی اور اسی خوف سے گزر رہی تھی۔ محل بنانے کی خوشی ڈھے جانے کا خوف۔“

”خوب پڑھائی ہو رہی ہے۔“

کسی لڑکی نے قریب سے گزرتے ہوئے کہا تو اس نے چونک کر ادھر ادھر دیکھا۔
سارے گراؤنڈ میں لڑکیاں بکھری ہوئی تھیں۔ کوئی پڑھ رہی تھی کوئی یونہی ٹہل رہی تھی۔
”وقت کتنی جلدی گزر گیا ہے۔“

اس نے افسردگی سے سوچا۔

کہنے کو چار سال بیت گئے ہیں لیکن یوں لگتا ہے جیسے ابھی کل کی بات ہو، جب وہ اس گیٹ پر میاں جی اور عبدالماجد کے ساتھ سہمی سہمی کھڑی تھی اور آج، خوف زدہ وہ آج بھی تھی لیکن آج کا خوف اور تھا اس دن کا ڈر اور تھا ان چار سالوں میں یہاں کی ہر چیز کتنی مانوس، کتنی اپنی اپنی لگنے لگی تھی۔، اور اب چند دنوں بعد یہ سب کچھ بچھڑ جائے گا۔ چند دنوں بعد اس کا بی۔ اے فائنل کا امتحان ہونے والا تھا۔ یہ گراؤنڈ، یہ بیچ جہاں وہ بیٹھی ہوئی تھی اور یہ درخت ان سب کو دیکھنے کے لئے آنکھیں ترسا کریں گی یہاں کتنی یادیں وابستہ تھیں۔

اس کی آنکھوں میں جگنو سے چمک اٹھے۔

یہاں اسی بیچ پر بیٹھ کر اس نے سینکڑوں بار عادل علی سے ملاقات کی تھی کبھی اسما کی موجودگی میں کبھی اس کی غیر موجودگی میں پتا نہیں کب، پتا نہیں کیسے وہ ایک دوسرے کے بے حد قریب آ گئے تھے۔ اسے پتا ہی نہیں چلا تھا کہ یہ سب کیسے ہو گیا تھا وہ جو میاں جی سے اتنا ڈرتی تھی اور جس نے نو سال کی عمر میں ہی برقع پہن لیا تھا اور کسی غیر مرد کے سامنے کبھی نہیں آئی تھی گھنٹوں ایک اجنبی مرد سے باتیں کیا کرتی۔ یہ اجنبی مرد جو خود بخود ہی اس کے دل میں روح میں اور ذہن میں سا گیا تھا۔ اسما کی آپنی کی شادی کے بعد کئی بار اس نے عادل علی کے بارے میں سوچا تھا اس کی باتیں یاد کی تھیں اور محسوس کیا تھا کہ محبت کا وہ ایک لمحہ اس کے دل پر اپنے ہونے کا نشان چھوڑ گیا تھا۔

وہ دل میں کتنی خوف زدہ تھی کہ چھوٹی آپا اس سے خفا ہوں گی کہ رات کے اس پہر وہ ایک اجنبی مرد کے ساتھ کیوں آرہی تھی مگر چھوٹی آپا نے تو کچھ بھی نہیں کہا تھا کچھ بھی نہیں پوچھا تھا لیکن اس کے ساتھ مل کر روتی رہی تھیں۔ البتہ جب وہ رخصت ہونے لگی تھیں تو انہوں نے ایک بار پھر اس سے وعدہ لیا تھا کہ وہ ان کا سر نہیں جھکنے

دے گی۔ ان کا مان نہیں توڑے گی۔ حالانکہ عادل کا مسکراتا چہرہ بار بار اسے ڈسٹرب کرتا رہا تھا لیکن اس نے بڑے یقین اور اعتماد سے چھوٹی آپا کا ہاتھ تھام رکھا تھا۔

”آپ بے فکر رہیں چھوٹی آپا میں آپ کو کبھی میاں جی کے سامنے نام نہیں ہونے دوں گا۔“

مگر جب وہ ہاسٹل میں آیا تو اسے یاد ہی نہ رہا کہ اس نے چھوٹی آپا سے اور خود اپنے آپ سے کیا عہد کیا تھا ایک انجانی کشش اسے کشاں کشاں علی تک لے آئی اور پھر عادل علی اکثر آنے لگے کہ انہوں نے لاہور ہی میں رہائش اختیار کر لی تھی۔ وہ عادل علی کے ساتھ کبھی باہر نہیں گئی تھی۔ لیکن یہاں اس کنج میں ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے وہ گھنٹوں ایک دوسرے سے باتیں کرتے تھے حتیٰ کہ سب وزیر چلے جاتے اور انہیں خبر تک نہ ہوتی۔ کبھی کبھی اسما کوک لینے چلی جاتی تو وہ دونوں تنہا رہ جاتے۔ لیکن یہ تنہائی اکثر خاموشی میں ایک دوسرے کو دیکھتے ہوئے کٹ جاتی بغیر کسی اظہار کے دونوں نے ایک دوسرے کو سب کچھ سمجھا لیا تھا شاید محبت کی کوئی زبان نہیں ہوتی مگر وہ پھر بھی ذہن میں، دل میں اور روح میں بےیرا کر لیتی ہے۔

کبھی کبھی وہ یک دم زرد پڑ جاتی اس کی آنکھوں میں لودیتی روشنیاں یکایک بجھ جاتیں۔ ایک انجانا سا خوف اسے اپنی بانہوں میں جکڑ لیتا۔ عادل علی نے کئی بار پوچھا تھا ”کبھی کبھی مجھے یوں محسوس ہوتا ہے ٹومی جیسے باتیں کرتے کرتے تم یکایک کھو جاتی ہو۔ زرد پڑ جاتی ہو۔ جیسے تم خوفزدہ ہو کیا تمہیں مجھ پر بھروسہ نہیں ہے ٹومی؟“

”آپ پر تو بھروسہ ہے عادل لیکن اپنی تقدیر پر بھروسہ نہیں ہے۔“

وہ سوچتی۔

وہ اسے کیسے بتائے کہ بچپن سے لے کر اب تک اس نے جو چاہا وہ کبھی پورا نہیں ہوا۔ اور کبھی کبھی میاں جی کا خوف اس پر یوں مسلط ہو جاتا کہ اس کے جانے کے بعد وہ

نماز پڑھتے ہوئے گڑگڑا، گڑاگڑا کر معافیاں مانگتی اور اپنے آپ سے وعدہ کرتی کہ وہ اب کبھی عادل سے نہیں ملے گی۔ کبھی نہیں۔

”یہ گناہ ہے ام کلثوم اور تمہیں اس گناہ کا کفارہ ادا کرنا پڑے گا۔“ کوئی اس کے کانوں میں سرگوشی کرتا۔

”گناہ!“ وہ کانپ جاتی۔

مگر عادل علی آ جاتا تو نہ چاہتے ہوئے بھی وہ اس کے سامنے چلی جاتی۔ جیسے لوہا میکنٹ کی طرف کھینچتا ہے بالکل ایسے۔

”شاید یہ عشق کی انتہا ہے۔“

وہ سوچتی۔

جس نے اسے ہر خوف، ہر ڈر سے بے نیاز کر دیا ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ میاں جی کی سات پردوں میں پٹی ہوئی بیٹی مسماۃ ام کلثوم عادل علی سے عشق لڑائے گی اور وہ بھی ایسا عشق کہ اپنی سدھ بدھ بھول جائے گی۔

”خدا یا میں کیا کروں؟“

اس کی تو سمجھ میں نہ آتا۔ لیکن عادل علی مطمئن تھے ان کے سامنے تو بڑا صاف اور سیدھا راستہ تھا اور انہیں میڑھے راستوں پر چلنا پسند نہ تھا۔

”سنو ام کلثوم!“

وہ اکثر اس سے کہتے۔

”میں تمہیں پر پوز کرنا چاہتا ہوں تم مجھے اجازت دوں کہ میں مٹی کو تمہارے میاں جی کے پاس بھیجوں۔“

”نہیں ابھی نہیں۔“

وہ ڈر جاتی، خوفزدہ ہو جاتی کہیں میاں جی انکار نہ کر دیں پھر۔ پھر کیا ہو گا یہ خوشی جو

اسے ملی ہوئی تھی یہ سر تیں جن سے اس کا دامن بھرتا جا رہا تھا سب اس سے چھین جائیں گی۔ پھر کیا پتا میاں جی اسے واپس بلا لیں۔

نہیں۔ ابھی وہ خوش ہونا چاہتی تھی یہیں اسی کھلی فضا میں رہنا چاہتی تھی۔
”نہیں پلیز! ابھی نہیں۔ ابھی مجھے بی۔ اے کرنے دیں۔“

”تم بی اے کرتی رہنا ٹومی۔ لیکن میاں جی سے بات کر لیں۔“
نہیں عادل ابھی نہیں پلیز۔

اور عادل علی کو اس کی بات ماننی پڑتی تھی، لیکن اب جب اس کے امتحان میں چند دن رہ گئے تھے تو عادل علی چاہتے تھے کہ اب وہ میاں جی سے اسے مانگ لیں اور انہوں نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ اب وہ اس کی کوئی بات بھی نہیں سنیں گے۔

”ممی اور ڈیڈی انتظار کر کر کے تھک گئے ہیں میں انہیں کب تک بہانے بنا بنا کر نالتا رہوں گا۔ بس اس بار میں ممی کو میاں جی کے پاس بھیجوں گا۔“

اور کتنے دن ہو گئے تھے عادل علی کو ساہیوال گئے ہوئے پتا نہیں میاں جی نے کیا کہا ہو گا ہزاروں سو سے اس کے دل میں اٹھتے وہ کتاب سامنے رکھے ہوئے کھوئی سی بیٹھی رہتی کئی بار اس نے سوالیہ نظروں سے اسما کو دیکھا تھا مگر اسے تو خود کچھ پتا نہیں تھا۔ اسے کیا بتاتی۔

آج وزیٹر ڈے تھا لیکن عادل علی نہیں آئے تھے، شاید انہوں نے ابھی تک ممی کو میاں جی کے پاس نہیں بھیجا۔ ورنہ وہ ضرور آتے اور ماجد بھی تو نہیں آیا تھا۔ اس نے میڈیکل کالج میں داخلہ لے لیا تھا اور زیادہ تر پڑھائی میں مصروف رہتا تھا اسما بھی شاپنگ کے لئے گئی ہوئی تھی اور اس کا دل بے طرح گھبرا رہا تھا۔ کوئی تو ہوتا جس سے وہ دل کی بات کرتی۔ اس نے آنکھیں موند کر سر گھنٹوں پر رکھ لیا۔ نجانے کتنی دیر تک وہ یونہی بیٹھی رہی۔

”ٹومی۔“

کسی نے بڑے جذب سے پکارا تھا۔ اس نے سر اٹھایا۔ شام کے پھلتے سایوں میں عادل علی سر جھکائے کھڑے تھے۔

”آپ! وہ یک دم کھڑی ہوئی پھر بیٹھ گئی۔“

”اس وقت؟“

”ہاں، کچھ دیر پہلے ہی لوٹا ہوں۔“

وہ تھکے تھکے سے سامنے والی بنچ پر بیٹھ گئے۔

”اسما شاپنگ کے لئے گئی ہے۔“

عادل علی نے سر ہلادیا۔ کلثوم نے کنکھیوں سے دیکھا۔ ان کے ہونٹوں کی وہ شوخ مسکراہٹ اور آنکھوں کی چمک نہ جانے کہاں کھو گئی تھی۔

”لیکن۔ لیکن میاں جی نے۔“

اس نے دھڑکتے دل سے سوچا۔ عادل علی اسے گہری نظر سے دیکھ رہے تھے۔
”بعض اوقات آدمی کو تقدیر کے فیصلوں پر یقین نہیں آتا۔ انہوں نے آہستگی سے کہا۔“

”میں نے ممی کو تمہارے گھر بھیجا تھا ٹومی، لیکن میاں جی نے انکار کر دیا ہے۔“

انہوں نے ایک گہری سانس لی۔

”تو بالآخر وہ لمحہ آ ہی گیا۔ جس سے وہ اول دن سے خوفزدہ تھی اور بار بار اس نے سوچا تھا کہ اگر یہ لمحہ اس کی زندگی میں نہ آیا تو شاید وہ مر جائے گی اور یہی وہ لمحہ تھا، لیکن وہ زندہ تھی۔ بالکل صحیح سالم لیکن اس کی نگاہیں عادل علی کے چہرے پر تھیں جیسے صدیوں سے وہ اسی حالت میں بیٹھی ہو۔“

”میں نے ایسا کبھی نہیں سوچا تھا ٹومی۔ کبھی تصور ہی نہیں کیا تھا۔ پتا نہیں کیوں

وہ پھر بنے لیکن وہ مسکرا بھی نہ سکیں۔

”دنیا کہاں سے کہاں چلی گئی لیکن تمہارے میاں جی ابھی تک ذات برادری کے چکر میں الجھے ہوئے ہیں۔ کہتے تھے کہ برادری سے باہر شادی نہیں کر سکتے۔“
”کیا کمی ہے اس شخص میں خوبصورت، برسر روزگار، پڑھا لکھا اور شریف اعلیٰ اخلاق کا مالک۔“

ام کلثوم نے سوچا۔

”اور اگر اس کی ممی کسی اور گھر میں جھولی پھیلاتیں تو وہ اسے اپنے لئے اعزاز سمجھتے لیکن میرے میاں جی انہوں نے تو اکثر گھائے کے سودے کئے ہیں۔“
”صاحب! ساڑھے چھ بج چکے ہیں۔“

رحمت بابا نے قریب آکر۔ یاد دہانی کرائی۔ وہ چونک کر کھڑے ہو گئے۔ گراؤنڈ تقریباً خالی ہو چکا تھا اکاد کالوگ نظر آرہے تھے۔
”دراصل بابا میں اس کا انتظار کر رہا تھا۔“

”وہ تو پتا نہیں کب آئیں گی اور مس صاحب ہمیں غصہ ہوں گی۔“
رحمت بابا بات کر کے چلے گئے تو انہوں نے ام کلثوم کی طرف دیکھا۔
”اچھا خدا حافظ۔ تم دعا کرنا ڈیڈی کامیاب لوٹیں۔“ وہ آئین بھی نہ کہہ سکی۔ عادل علی ایک الودائی نظر اس پر ڈال کر چلے گئے۔

”اور اگر میاں جی نے ایک بار ناکر دی ہے تو پھر یہ نہ کسی ہاں میں نہیں بدل سکتی۔“ یہ وہ انہی طرح جانتی تھی اور اسی لئے تو اس کا دل ڈوبا جا رہا تھا۔
”قصور زبیر اپنا ہی ہے نا۔ میں نے کیوں ایسے خواب دیکھے جن کی تعبیر نہیں ملتی تھی اور میں زبیر کچھ اچھی طرح جانتی تھی اور مجھے تو ان ساری باتوں کا ادراک تھا پھر بھی پھر بھی میں نے خواب بنے اور تعبیریں سوچیں۔ اس نے اپنے سامنے کھڑے

مجھے یقین تھا کہ۔“

”مگر میں مجھے تو کوئی ایسا یقین نہیں تھا پھر میرے اندر یہ کیسی ہل چل مچی ہے۔ جیسے بڑی انہونی بات ہو گئی ہو اس نے سوچا لمحہ بہ لمحہ اس کا رنگ زرد ہو رہا تھا۔ بات کرتے کرتے اچانک ہی عادل علی کی نظر اس کے سپید پڑتے چہرے کی طرف اٹھی تو وہ گھبرا گئے۔“

”تم ٹھیک تو ہو ٹومی۔“

مگر وہ اس طرح ساکت بیٹھی تھی جیسے کچھ نہ سن رہی ہو۔

”ٹومی۔ ٹوما!“

انہوں نے اس کے ہاتھ تھام لئے جو بے حد سرد ہو رہے تھے۔

”ٹومی بگلی اتنی جلدی حوصلہ ہار بیٹھیں۔“

ان کے ہاتھوں کی گرمی اس کے ہاتھوں سے ہوتی ہوئی جیسے اس کے پورے وجود میں منتقل ہونے لگی۔ اس نے جھر جھری سی لی لیکن اپنے ہاتھوں کو ان کے ہاتھوں۔ آزاد نہیں کرایا۔ عجیب سی خواہش اس کے اندر پیدا ہو رہی تھی۔ کاش وقت یہیں کب تو ختم جائے اور عادل علی یونہی اس کے ہاتھ تھامے بیٹھے رہیں اور یہ حرارت بخش لمحہ محسوس کرتی رہے۔

عادل علی نے اس کے ہاتھوں کو آہستہ سے دبا کر چھوڑ دیا۔

”میں مایوس نہیں ہوا ہوں ٹومی میں ممی کو پھر بھیجوں گا اگلے ہفتے ڈیڈی بھی آوالے ہیں۔ مجھے یقین ہے وہ ضرور میاں جی کو قائل کر لیں گے۔ تم حوصلہ رکھو۔“
وہ ہولے سے ہنسے۔

”مجھے گمان تک نہ تھا کہ تمہیں پانے کے لئے مجھے کسی آزمائش سے گزرنا پڑے گا۔ چلو اچھا ہے تھوڑا سا دکھ اٹھانا پڑا ہے تو زیادہ قدر کروں گا۔“

میں لائی۔ کمرے میں آتے ہی اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ اور ان بند آنکھوں میں جیسے میاں جی گھس آئے۔

”نہیں میاں جی نہیں پلیز معاف کر دیجئے پھر نہیں میاں جی پھر گڑیوں سے نہیں کھیلوں گی میاں جی۔“

وہ دونوں ہاتھ جوڑی رہی تھی۔

اسمانے گھبرا کر اس کے ماتھے کو چھوا اس کا جسم آگ کی طرح تپ رہا تھا۔ وہ گھبرا کر وارڈن کی طرف بھاگی۔ ڈپنری انچارج نے آکر اسے دیکھا انجکشن دیا۔ اور تسلی دے کر چلی گئی۔

وہ ساری رات بخار میں پھنکتی رہی جیسے کوئی مٹھیاں بھر بھر کر آگ اس پر بھج کر ہو اور ساری رات اسما اس کے سر ہانے جاگی اور ٹھنڈے پانی میں پٹیاں بھگو بھگو کر اس کے ماتھے پر رکھتی رہی۔ اور وہ ساری رات بہکی بہکی باتیں کرتی رہی۔ کبھی میاں جی اسے ڈراتے کبھی فرشتے اسے کشاں کشاں پھینچتے دوزخ کی طرف لئے جاتے۔

”نہیں۔ نہیں مجھے آگ میں مت ڈالو۔“

”چھوٹی آپا میں پیٹھو کھیلنے جاؤ گی۔ میرا دم گھٹتا ہے۔“

کبھی وہ اسکا ہاتھ تھام لیتی۔

”اسما پلیز مجھے یہاں سے لے جلو۔ یہاں مجھے ڈر لگتا ہے۔“

اور صبح ہوتے ہوئے تو وہ سو گئی۔ شاید گولیوں کا اثر تھا جب اس کی آنکھ کھلی تو پہلا سے بہتر تھی۔

”تم نے تو مجھے ڈرا ہی دیا تھا ٹومی۔ کیا ہو گیا تھا تمہیں اچانک۔ میں تو سمجھی تھی

تمہیں کوئی جن بھوت چٹ گیا ہے۔“

صبح اسے بیٹھے دیکھ کر اسمانے کہا۔

برگد کے اس پرانے درخت کو دیکھا جس کی شاخیں ہاسٹل کی چار دیواری سے رہی تھیں۔ مگر وہ خود نہ جانے کب سے یوں نہیں ایستادہ تھا۔ اب وہ اپنی شاخیں کٹ پھیلا لے لیکن وہ رہے گا تو اسی چار دیواری کے اندر اور میں نے بھی برگد کی طرح شاخیں پھیلا لی تھیں اور مالی بابا کی طرح میاں جی بھی میری شاخیں کاٹ دیں۔ پھر وہی میں ہوں وہ یوں نہیں لایعنی باتیں سوچتی رہی، نہ جانے کتنی دیر گزر گئی، ا۔ تک نہ ہوئی وہ یوں نہیں اندھیرے میں بچ پر بیٹھی تھی۔ سب لڑکیاں اپنے کمروں میں تھیں اور اس کا دل لمحہ بہ لمحہ ڈوبتا جا رہا تھا۔ سر چکر رہا تھا جیسے کوئی اسے پکڑ کر گھم تیز اور تیز اسما جب اسے ڈھونڈتی ہوئی رحمت بابا کے پاس آئی تو رحمت بابا نے اسے نکل کر کہا۔

”کلوٹم بی بی تو کہیں نہیں گئیں۔ یہاں ہی بیٹھی تھیں شام تک۔“

انہوں نے بچ کی طرف اشارہ کیا اور ملگجی سی روشنی میں اسمانے بچ پر کسی دیکھا تو ادھر لپکی۔

”ٹومی۔ ٹومی کیا ہوا۔“

اس نے بشکل آنکھیں کھولیں۔ سر یوں نہیں چکر رہا تھا جیسے گڈو کے ساتھ ڈالتے ہوئے ہولے ہولے زمین آسمان ہر چیز گھومنے لگتی ہے۔

کلیکلی کلیکلی دی

پگ میرے ویردی۔

ویردی منکبیدی آئی۔

چھن چھن کر مہندی آئی۔

”ٹومی! ٹومی!“

اسما کی کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا کہہ رہی ہے وہ اسے بشکل سہارا دے

”خیر پھر آکر بات کرتی ہوں۔ ساری رات جاگی ہوں، محترمہ اور اب نہانے جا رہی ہوں۔ پھر بیمار نہ پڑ جانا امتحان سر پر ہے۔“

وہ چپ چاپ اسے دیکھتی رہی۔

”بولو نایار! رات کو تو بڑی کہانیاں سنارہی تھیں، ایسی ایسی باتیں کی ہیں یا رات تم نے کہ میرے پلے تو کچھ نہیں پڑ رہا تھا۔“

”تم۔ تم کہاں چلی گئی تھیں اسامی مجھے چھوڑ کر؟“ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔
”ارے تمہیں بتا کر تو گئی تھی شاپنگ کے لئے اور تم نے بتایا ہی نہیں تھا کہ تمہاری طبیعت خراب ہے۔“

وہ تولیہ گلے میں ڈالے اس کے پانگ پر آ بیٹھی۔

”اسا!“

وہ تو رونا چاہتی تھی اسما کے گلے لگ کر چیخیں مار مار کر اور اسما نہیں تھی پھر پتا نہیں اسے کیا ہوا تھا۔ اس کا سر چکرا رہا تھا۔ اسے قطعی یاد نہیں تھا کہ اسما کب آئی تھی اور کب اسے کمرے میں لائی تھی۔

”کیا بات ہے تم کچھ پریشان ہو۔“

وہ خاموشی سے اسے دیکھتی رہی۔

”یہ تم ہی تو تھیں اسما جس نے میرے ذہن اور میرے دماغ میں اس شخص کی تصویر بنائی جسے میں نے دیکھا تک نہ تھا اور پھر جب میں نے اسے دیکھا تو؟“

”بولو ناٹومی کیا بات ہے۔“

”تم نے اسی تم نے ہی سب کچھ کیا ہے۔“ ام کلثوم نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

تم نے کیوں کیا ایسا؟

اس کی آنکھوں میں عجیب و حشیانہ سی چمک تھی۔

”کیا کیا ہے میں نے۔“

اسما نے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔

”تم نے۔“

اس نے غور سے اسے دیکھا اور پھر دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اور بہت دیر بعد جب رونے سے دل پر چھایا غبار کم ہوا تو اس نے اسما کو ساری حقیقت بتادی۔

”عادل بھائی! آخری لمحوں تک جنگ لڑنے کے قائل ہیں اس لئے وہ اپنی جنگ نہیں ہارتے مجھے یقین ہے وہ جیت جائیں گے۔“

اسما نے اسے تسلی دی اگرچہ خود اس کا دل بجھ سا گیا تھا مگر اسے ایسی کوئی خوش فہمی نہیں تھی کہ وہ تو میاں جی کی رگ رگ سے واقف تھی اور اگر میاں جی کو ہاں کرنی ہوتی تو پہلی بار ہی کر دیتے اور اس کا خدشہ بالکل صحیح تھا۔ کوئی دلیل کوئی بات انہیں قائل نہ کر سکیں۔

انہوں نے اسما کے والدین کی بڑی عزت کی۔ خاطر مدارت کی لیکن اپنی بات پر قائم رہے۔

عادل علی بہت پڑمردہ تھے بے حد ٹوٹے ٹوٹے اور بکھرے بکھرے سے لگ رہے تھے۔ وہ چپ چاپ سر جھکائے سلگتی آنکھیں لئے بیٹھی رہی اور وہ برگد کے پیڑ کے نیچے کھڑے اسے دیکھتے رہے۔

”میں یہ تو نہیں کہوں گا کہ تو ما اگر تم مجھے نہ ملیں تو میں مر جاؤں گا یا جوگ لے لوں گا اور جنگلوں میں نکل جاؤں گا۔ لیکن شاید میں پھر کبھی کھل کر نہ ہنس سکوں۔ میری زندگی کی سب سے بڑی خوشی مجھ سے بچھڑ جائے گی۔ میں تین برس سے ایک ہی خواب دیکھ رہا ہوں۔ ان تین برسوں میں تم ہمیشہ میرے سنگ سنگ رہی ہو۔ میں نے

”آپ اپنی بیٹی کی رائے بھی تو پوچھ لیجئے میاں جی وہ کیا چاہتی ہے؟“

”وہ کیا چاہتی ہے؟“

میاں جی کی آنکھیں خون رنگ ہو گئیں۔

”ہو گا وہی جو میں چاہتا ہوں۔“

”یہ تو اس کا قانونی اور شرعی حق ہے میاں جی۔“ اسما کے ڈیڈی نے طنز سے کہا۔

میاں جی بل کھا کر رہ گئے

”پوچھ لوں گا اس سے بھی۔“

”تو ہم پھر حاضر ہوں گے ہمیں یقین ہے آپ اپنی بیٹی کو اس کا حق ضرور دیں گے۔“

وہ چلے گئے اور میاں جی چھوٹی آپا پر برس پڑے۔

”سارا تمہارا قصور ہے امت الحبیب۔ تم نے ہی اسے یہ جرأت دی ہے۔ تم ہی

تھیں جس نے اسے تنہا مثل میں چھوڑ دیا تھا۔ میں اس کے حق میں ہر گز نہیں تھا۔“

”مگر میاں جی ام نے کیا کیا ہے جس گھر میں میری ہو وہاں پتھر تو آتے ہی ہیں۔“

”تمہیں کیا پتا وہاں کیا کرتی پھرتی ہے کن کن لوگوں سے ملتی ہے۔“

”مگر میاں جی۔“

چھوٹی آپا نے کچھ کہنا چاہا۔ لیکن میاں جی نے انہیں بات نہ کرنے دی۔

”وہ لوگ مجھے مشورہ دے گئے ہیں امت الحبیب کہ میں اپنی بیٹی سے بھی پوچھ

لوں۔ بلاؤ اسے پوچھتا ہوں میں اس سے ٹکڑے ٹکڑے کر دوں گا اس کے۔“

چھوٹی آپا ساکت کھڑی رہ گئیں اور میاں جی غصے سے عبد الحفیظ کو آوازیں دیتے

ہوئے باہر کل گئے اور اسی شام عبد الحفیظ ام کلثوم کو لے آئے برقعے میں لپی تھکی تھکی

ام کلثوم نے جب گھر میں قدم رکھا تو میاں جی صحن میں ہی ٹہل رہے تھے۔

”ٹھہر وام کلثوم مجھے تم سے کچھ پوچھنا ہے۔“

ہر خوشی، ہر غم میں تمہیں اپنے آس پاس ہی محسوس کیا ہے ٹو اور اب اگر تم یکا یک مجھ سے پھجڑ جاؤ گی تو۔ نہیں ٹومی اپنی جنگ آخری لمحوں تک لڑنا چاہتا ہوں اس ڈاکٹر کی طرح جو زندگی کی آخری سانس تک امید رکھتا ہے۔ میں ممی کو ایک بار پھر میاں جی کے پاس بھیجوں گا آخری بار لیکن تمہیں ایک وعدہ کرنا ہے مجھ سے کہ اگر میاں جی نے تم سے تمہاری رائے پوچھی تو تم بغیر کسی جھجک کے اپنی مرضی بتا دو گی۔“

”میں!“ اس نے سر اٹھا کر عادل علی کی طرف دیکھا۔

”ہاں تم ٹومی اس لئے کہ یہ زندگی بھر، عمر بھر کی بات ہے۔“

”مگر میاں جی کے سامنے کیسے بات کروں گی۔“

”محبت تو آدمی کو بڑا حوصلہ عطا کرتی ہے کیا تمہاری محبت تم میں کوئی جرأت کوئی

حوصلہ پیدا نہیں کرتی، تمہیں ہمت پیدا کرنی ہو گی ٹومی اپنے لئے میرے لئے۔“

اور وہ چپ چاپ سر جھکائے اس کی باتیں سنتی رہی اور اپنے اندر ہمت پیدا کرتی

رہی کہ یہ عمر بھر کی بات تھی اور عادل علی دل میں ایک نئی جوت جلائے چلا گیا۔



”میاں جی میں ایک بار پھر جھولی پھیلائے آگئی ہوں مجھے آپ کی بچی بہت پسند

ہے میاں جی۔“

میاں جی نے بڑے قخل سے ان کی باتیں سنیں۔

”بہن! آپ بار بار تکلیف نہ کریں مجھے شرمندگی ہوتی ہے نادام ہو جاتا ہوں آپ

کے سامنے۔ لیکن مجبور ہوں۔ ہم اگر برادری سے باہر رشتہ کر دیں تو بڑی بے عزتی،

بدنامی ہوتی ہے برادری میں۔“

”آپ کی بیٹی عیش کرے گی میاں جی ہمارا بیٹا لاکھوں میں ایک ہے۔“

مگر سب کچھ بے فائدہ تھا تب بے حد مایوس ہو کر انہوں نے آخری تیر نکالا۔

”جی میاں جی!“

اس کی رنگت یک دم پیلی پڑ گئی۔ تو یہ اچانک عبد الحفیظ اسے اسی لئے لے کر آیا ہے۔

”توبہ! بچی کو سانس تو لینے دیا ہوتا۔ سفر کر کے آئی ہے۔“

بچن سے باہر آتے ہوئے چھوٹی آپا بڑی آپا کی طرف دیکھ کر بڑبڑائیں۔ میاں جی صحن میں ٹہل رہے تھے۔ شاید بات کرنے کے لئے موزوں الفاظ ڈھونڈ رہے تھے۔

”تمہاری سہیلی اسما کے والدین آئے تھے۔“

انہوں نے رک کر اس کے چہرے کے تاثرات دیکھنا چاہے لیکن اس نے اپنا چہرہ

جھکا لیا تھا۔

”انہوں نے اپنے بیٹے کے لئے تمہارا رشتہ مانگا ہے۔ لیکن چونکہ ان کی ذات

برادری الگ ہے اس لئے ہم نے انکار کر دیا ہے تمہارا کیا خیال ہے۔“

”جی۔ میرا خیال۔“ وہ گھبرا گئی۔

عادل علی نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔

”یہ عمر بھر کی بات ہے ٹومی ہمت نہ ہارنا۔ بس اک ذرا سی ہمت۔ ذرا سی جرات

کر لو ام کلثوم پھر عمر بھر کی خوشیاں یہ سودا مہنگا نہیں ہے۔ صاف صاف کہہ دو میاں جی

سے کہ تمہیں۔“

”ہاں۔ میں تمہاری مرضی پوچھ رہا ہوں۔“ میاں جی نے بات دہرائی۔

”میں!“ اس نے تھوک نگتے ہوئے بات کرنا چاہی۔

لیکن چھوٹی آپا ہاتھ جوڑے اس کے سامنے کھڑی ہوئیں۔

”میرا مان نہ توڑنا تم مجھے میاں جی کے سامنے نام نہ ہونے دینا۔“

”میں آپ کا سر نہیں جھکنے دوں گا چھوٹی آپا اور عادل علی تم مجھے معاف کر دینا۔“

اور اس نے بڑی صاف اور نکھری آواز میں کہا۔

”جو آپ بہتر سمجھیں میاں جی۔“

میاں جی کو اپنے کانوں پر اعتبار نہ آیا۔ تو انہوں نے اپنا سوال دہرایا۔

”آپ زیادہ بہتر سمجھتے ہیں میاں جی جو کچھ کریں گے ٹھیک ہی کریں گے۔“

اور کتنے ہی آنسو اس کے اندر گرتے چلے گئے۔

میاں جی نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا ان کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔

”جاؤ آرام کرو بیٹا۔“

اس نے ان کا مان رکھ لیا تھا۔ وہ اپنی نظر میں سر بلند ہو گئے تھے۔ چھوٹی آپا نے لپک

کر اسے گلے لگایا۔ ”ارے تو، تو پسینے میں شرابور ہو رہی ہے چل برقع اتار اور آرام

کر لے۔ کھانا کھائے گی یا چائے لاؤں؟“

”کچھ بھی نہیں چھوٹی آپا بس آرام کروں گی بہت تھک گئی ہوں۔“

اسے یوں لگ رہا تھا جیسے نہ جانے کتنی دور سے پیدل چلتی ہوئی آرہی ہو۔

چھوٹی آپا بھی اس کے ساتھ ہی کمرے میں آئیں۔

”عادل علی اچھا لڑکا تھا اسما کی آپی کی شادی میں ایک بار دیکھا تھا۔“

انہوں نے جیسے اپنے آپ سے کہا۔

پتا نہیں چھوٹی آپا کیا کہنا چاہتی ہیں۔

اس نے الجھے الجھے ذہن کے ساتھ سوچا اس کی آنکھیں جل رہی تھیں وہ رونا

چاہتی تھی مگر آنسو نہ جانے کہاں چلے گئے تھے۔

”اور عادل علی تم اپنی جنگ ہار گئے اور میں، میں تو ہمیشہ ہی ہارتی رہی ہوں۔“

چھوٹی آپا تاسف سے اسے دیکھ رہی تھیں۔

”کیا ہی اچھا ہوتا جو میاں جی عادل علی کا رشتہ قبول کر لیتے۔ مگر۔“

”چھوٹی آپا میں سوؤں گی اب۔“

اس نے تکتے پر سر رکھتے ہوئے آنکھیں موند لیں اور اذیت کی لہریں اس کی رگوں کو کانٹنے لگیں۔

”مگر کیا فائدہ اسلے۔“

اس نے بیگ بند کرتے ہوئے افسردگی سے کہا۔ صبح اسے گھر جانا تھا واپس پیپر ز ختم ہو چکے تھے اور زندگی کا ایک خوبصورت دور بھی اس کے ساتھ ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا تھا۔

”ایک بار ٹومی صرف ایک بار وہ تم سے ملنا چاہتے ہیں آخری بار۔“

”اذیت کے سوا کیا ملے گا اسلے۔“

”اذیت تو پھر بھی ہو گی مگر کیا تم ان کی خواہش کو رد کر دو گی۔“

”کیسے رد کروں گی۔“

اس نے اپنے آپ سے کہا۔

وہ تو خود اسے دیکھنا چاہتی تھی آخری بار اس کی تصویر کو اپنی آنکھوں میں بسالینا چاہتی تھی۔ لیکن خود پر بھر کر رہی تھی۔

وہ شخص جسے اس نے بے تحاشا، بے حساب چاہا تھا اور جو شاید ہمیشہ اس کے دل میں رہے گا اور جس سے جدائی کے تصور سے اس کا دل کڑتا رہتا تھا اور چند ہی دنوں میں وہ مرجھا کر رہ گئی تھی اور وہ سامان کو ایک طرف رکھ کے چپ چاپ اس کے ساتھ نیچے اتر آئی۔

”شاید یہ میری غلطی تھی ٹومی۔“ اس نے اس کے ساتھ چلتے ہوئے کہا۔

”میں نے اپنی خواہش۔“

”نہیں اسامیامت کہو کسی کا بھلا کیا قصور یہ تو مقدر کے معاملے اور تقدیر کے

کھیل ہوتے ہیں۔“

اس نے اسما کو ٹوک دیا۔

”اور یہ کتنی خوش نصیبی ہے کہ آدمی زندگی میں کسی کو چاہے پوری سچائی اور خلوص کے ساتھ اور کوئی اسے اتنے ہی خلوص سے چاہے۔“

اس نے سوچا۔

”زندگی کے تلخ طویل سفر میں گھنے سایہ دار درخت کی چھاؤں تو ملنی چاہئے تھوڑی دیر کے لئے ہی سہی اور اسی سوچ کے سہارے زندگی کے باقی ماندہ دن گزر جائیں گے۔“

”میرا بھائی بہت کمزور ہو گیا ہے ٹومی تم غور کرنا۔ ان چند ہی دنوں میں وہ کتنے کمزور ہو گئے ہیں تم ان کے لئے کچھ نہیں کر سکتیں ٹومی پلیز مجھے ڈر ہے کہ کہیں۔“

”نہیں اسما اور کچھ مٹ کہنا۔“

”پھر تم کچھ کرو۔“

”کیا کروں میں؟“

اس نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا اور اس کی نگاہیں عادل علی کی نگاہوں سے ٹکرائیں جو انہیں آتے دیکھ کر بے تابانہ آگے بڑھ آئے تھے۔

”تم بہت کچھ کر سکتی ہو ٹومی میرے بھائی کو بچالو۔“

”تم بالغ ہو اپنے فیصلے خود کرنے کا حق رکھتی ہو ٹومی، کورٹ میرج کر لیتے ہیں۔“ عادل نے اسے سمجھایا۔

”نہیں عادل علی پلیز، نہیں مجھے غلط راستوں پر چلنے کی تلقین مت کرو۔“ وہ سسکی۔

”ایسی بات مت کرو عادل علی کہ میں ساری زندگی کسی سے نظر ہی نہ ملا سکوں۔“

”پھر تم ہی بتاؤ میں کیا کروں۔ میں نے تم سے کہا کہ میں تمہارے بغیر مروتوں گا نہیں، جوگ نہیں لوں گا لیکن جھوٹ کہا تھا میں نے غلط کہا تھا میری زندگی کی تصویر سے

سارے رنگ مٹتے جا رہے ہیں ٹومی تمہارے بغیر بالکل بے رنگ اور پھکی ہو گی یہ زندگی۔“
اور وہ سر جھکائے آنسو بہاتی رہی۔

وہ تو میاں جی کو جانتی تھی پھر کیوں اتنا آگے نکل آئی تھی اور اپنے ساتھ اس شخص کو بھی دکھی کیا تھا اور وہ۔ وہ کہتے رہے۔

”میں نے تم سے کبھی وہ باتیں نہیں کی تھیں جو اکثر راتوں کی تاریکی میں تنہائی میں تمہارے لئے سوچا کرتا تھا۔ میں نے سوچا تھا جب ہم ایک بندھن میں بندھ جائیں گے تو میں تم سے وہ ساری باتیں کروں گا جو میں نے تمہارے لئے سوچی تھیں لیکن اب میں کیا کروں میری کچھ سمجھ میں نہیں آتا ٹومی شاید تم ٹھیک کہتی ہو کہ راستے میں مگر اس کچھ سو کوئی چارہ بھی تو نہیں ہے۔“
”نہیں پلیز نہیں۔“

وہ رو پڑی اور وہ چپ چاپ اسے دیکھتے رہے۔
”اچھا۔“

اور پھر انہوں نے جیسے ہار مان لی۔

”تو جہاں بھی رہے یہ ہوا تیرے دامن میں خوشبو، موسموں کے فرشتے، روح کی تیری نگہبانی کریں۔“

ان کی نگاہیں اس کے چہرے کا طواف کر رہی تھیں۔ وہ چہرہ جو ان کی نظر میں شاید دنیا کی ساری عورتوں سے زیادہ حسین تھا۔ اور وہ آنکھیں جو شاید ساری دنیا کی عورتوں سے زیادہ خوبصورت تھیں اور اس کی لابی کڑی ہوئی پلکوں کے کناروں پر موتی نکلے ہوئے تھے جب کہ اس نے ہمیشہ خواہش کی تھی کہ یہ ہونٹ یہ آنکھیں سدا ہنستی رہیں یہ چہرہ ہمیشہ شگفتہ رہے۔

”وقت کا ہاتھ بھی تیری دسترس میں رہے۔“

تو جہاں بھی رہے۔

”میں نادم ہوں کہ آپ کے لئے دکھ کا باعث بنی۔“

”نہیں۔“ عادل علی نے تڑپ کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔

وہ سفید سفید نازک ہاتھ جسے انہوں نے ہاتھوں میں لینے کی تمنا کی تھی۔ مگر اس نے آہستگی سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا اور کھڑی ہو گئی۔ جدائی کی ان کٹھن گھڑیوں میں دونوں کے پاس کہنے کے لئے کچھ نہیں تھا۔ وہ لمحہ بھر ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔

”شاید آج کے بعد میں تمہیں کبھی نہ دیکھ سکوں۔“

عادل علی نے بھر آئی ہوئی آواز میں کہا اور سوچا۔

”مگر۔“

میری سماعت کے بادبانوں کا رخ تمہاری طرف رہے گا۔ ہوا کے ہاتھوں پر اپنے دل کی تمام باتوں کو لکھتی رہنا۔“
”خدا حافظ۔“

ام کلثوم نے آہستگی سے کہا اور بمشکل تمام اپنی پلکیں جو آنسوؤں کے بوجھ سے بھاری ہو رہی تھیں اٹھا کر انہیں دیکھا اور تیزی سے مڑ گئی۔
”سنو۔“

”سنو ٹومی۔“

عادل علی نے اسے بے آواز پکارا۔

”میں اپنے حصے کی ساری صحنیں تمہارے چہرے پر دیکھ چکا ہوں۔“

”اور تم۔ تم میری زندگی میں صرف راتیں چھوڑ کر مت جاؤ پلیز۔“

مگر وہ جا چکی تھی اور لمحہ بہ لمحہ ان کی نگاہوں سے دور ہو رہی تھی۔

”اور بالآخر اس ساری کہانی کا یہ انجام ہونا تھا کہ وہ دونوں الگ الگ راستوں پر

کھڑے ہیں۔“

اسماعیلی نے بڑے دکھ سے سوچا۔

”بالکل الگ سستوں میں کہ پھر ملنے کا کوئی امکان نہیں۔“ اور ام کلثوم نے کمرے

میں آکر سارے رکے ہوئے آنسوؤں کو بہہ جانے دیا۔

بچپن سے لے کر اب تک کتنی بار اس نے بغاوت کی تھی مگر ہر بار اسے بڑی مار کھانا پڑی تھی۔ میاں جی کی بید کی چھڑی نے ہر بار اس کا بدن لہو لہو کیا تھا۔ مگر اب کے اس کا بدن تو سلامت تھا مگر روح اور دل چھلنی چھلنی ہو گئے تھے۔ کیا ملا تھا اسے بغاوت کر کے۔ سوائے لا حاصل تمناؤں کے۔

نایافت

یہ جو ریگ دشتِ فراق ہے یہ رکے اگر

یہ رکے اگر تو نشان ملے

کہ جو فاصلوں کی صلیب ہے

وہ کڑی ہوئی ہے کہاں کہاں

میری آسمان سے کدھر گئی

تیرے التفات کی کہکشاں

یہ رکے اگر تو پتا چلے

میں تھا کس مگر تو رہا کہاں

کہ زماں و مکاں کی یہ دو سعتیں تجھے دیکھنے کو ترس گئیں وہ میرے نصیب کی بارشید

کسی اور چھت پر برس گئیں۔ ”ام۔ ام نماز کا وقت نکلا جا رہا ہے۔“

چھوٹی آپا نے کوئی تیسری بار اسے آواز دی۔ مگر اس نے جیسے سنا ہی نہیں۔

کھڑکی کی جالی سے چہرہ نکائے باہر دیکھ رہی تھی۔ وقت کتنا بیت گیا تھا لیکن ماسی جینا کے تندور پر اب بھی وہی رونقیں تھیں اور بچے اب بھی سامنے کے کھلے میدان میں اندھیرا ہونے تک کھیلتے تھے وہی پرانے کھیل آنکھ بھولی اور پٹھو گرم اور وہ گھنٹوں انہیں کھیلتے ہوئے دیکھا کرتی۔ حتیٰ کہ مغرب کی اذانیں ہو جاتیں۔ اب بھی اس کا دل چاہتا کہ وہ ان بچوں کے ساتھ ایسے ہی شور مچاتے ہوئے کھلے میدان میں بھاگی پھرے۔

برسوں پہلے اسی کمرے میں ایک شام کھڑکی میں سے بچوں کو دیکھتے دیکھتے ایک دم اس کا قد اتنا بڑا ہو گیا تھا کہ چھت سے جا لگا تھا اور اس نے خوف زدہ ہو کر کھڑکی سے باہر دیکھنا چھوڑ دیا تھا اور دن میں کئی کئی بار خود کو دیکھتی اور تسلی دیتی تھی کہ ابھی وہ بڑی نہیں ہوئی۔ ابھی تو وہ چھوٹی ہے اور ابھی تو وہ اتنی چھوٹی ہے کہ چارپائی پر چڑھ کر بھی چھت کو نہیں چھو سکتی اور ابھی تو وہ چھوٹے بچوں کے ساتھ کھیل سکتی ہے۔ مگر میاں جی نے اسے کھیلنے نہ دیا اور اب اسی کمرے میں کھڑکی کی جالی سے رخسار نکائے نکائے اس نے سوچا کہ اس کا قد گھٹے گھٹے اتنا چھوٹا ہو گیا ہے کہ وہ بالشت بھر کی رہ گئی ہے۔ چند دن کے بچے کی طرح چلنے پھرنے اٹھتے بیٹھتے بولنے سے معذور۔

”تم بالغ ہو عاقل ہو تو می اپنے فیصلے خود کر سکتی ہو۔“

لیکن وہ اپنے فیصلے خود نہیں کر سکتی تھی۔ وہ نابالغ تھی نہ عاقل تھی نہ خود مختار تھی جیسے میاں جی کو پتا نہیں چلتا تھا کہ وہ چھوٹی ہے اور بچوں کے ساتھ کھیل سکتی ہے کہ اس کی من چاہی خواہشیں کبھی پوری نہیں ہو سکتیں۔

اور اس نے ایک پڑھے لکھے خوبصورت مرد کو دھوکا دیا تھا جبکہ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ اس کی من چاہی خواہشیں کبھی پوری نہیں ہو سکتیں۔

اور میں اس کے لئے اپنے آپ کو کبھی معاف نہیں کروں گی۔

عادل علی۔

اس نے کھڑکی کی جالی سے رخسار نکائے نکائے آنکھیں موند لیں۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے اچھے لگ رہے تھے وہ یونہی آنکھیں موندے کھڑے رہی اور زندگی بیت جائے مگر زندگی یوں بھی اتنی آسانی سے کبھی گزری ہے عادل علی اور تم نے کہا تھا۔

ہوا کے ہاتھوں پر اپنے دل کی تمام باتوں کو لکھتے رہنا اور میں نے اپنے کمرے کے دروازے کبھی بند ہی نہیں کئے، حالانکہ مجھے پتا ہے کہ تمہیں اب نہیں آنا ہے اور میں نے ہر روز ہواؤں کے ہاتھ تمہیں پیام بھیجے ہیں حالانکہ یہ سب کچھ کتنا بے فائدہ اور بے سود ہے۔ عادل علی، کہ سارے فیصلے کی ذمہ داری تو میرے اختیار میں تھی مگر میں نے یہ اختیار استعمال نہیں کیا تھا تب مجھے پتا نہیں تھا کہ محبت اتنی ظالم شے ہوتی ہے اور بھول جانا اور بھلا دینا اتنا مشکل ہوتا ہے یہ تو مجھے اب پتا چلا ہے عادل علی۔ تم سے بچھڑ کر تم سے الگ ہو کر۔

”ام۔ ام کہاں ہو؟“

چھوٹی آپا سے ڈھونڈتی ہوئی اندر آ گئیں۔

”جی چھوٹی آپا۔“

وہ کھڑکی کے پاس سے ہٹ کر چارپائی پر بیٹھ گئی۔ چھوٹی آپا نے کھڑکی بند کر دی۔

”میاں جی دیکھیں گے تو ناراض ہوں گے۔ کل بھی کہہ رہے تھے کہ یہ کھڑکی ہر

وقت کیوں کھلی رہتی ہے۔“

اس کے چہرے پر ناگوار سا تاثر ابھر کر غائب ہو گیا۔

”نماز کا وقت نکلا جا رہا ہے۔ میاں جی کہتے ہیں مغرب کی نماز پڑھنے میں دیر مت

کیا کرو۔“

”اچھا۔“

اس نے تھکے تھکے انداز میں چھوٹی آپا کی طرف دیکھا اور پھر سوچا۔

”وقت تو سچ مجھ ہاتھوں سے نکل گیا چھوٹی آپا۔ اگر وہ اس وقت عادل علی کی بات مان لیتی تو بس اک ذرا سی ہمت ذرا سے حوصلے ہی کی تو بات تھی۔ کیا کر لیتے میاں جی، مگر شاید لوگوں کے سامنے ان کا سر جھک جاتا، ان کا بھروسہ، ان کا اعتماد ٹوٹ جاتا اور اگر یہ ممکن نہیں تھا تو اس نے ایک بار تو میاں جی سے اپنا حق مانگا ہوتا۔ مگر وہ تو میاں جی نے جب اس کی رائے پوچھی تھی تب اپنی رائے بھی نہ دے سکی تھی اور یہ تھی ان کی محبت۔ اس کا عشق، کمزور، کچا بودا لوگ تو محبت کی خاطر بڑی بڑی قربانیاں دیتے ہیں لیکن وہ تو اتنا بھی نہ کر سکی تھی اس شخص کے لئے جسے اس نے بے حد بے حساب چاہا تھا اور اس کی محبت جیسے اس کی رگوں میں خون بن کر گھل گئی تھی۔

اور وہ کتنا بڑا کتنا فراخ دل تھا اس نے کہا تھا۔

”شاید تم ٹھیک ہی کہتی ہو ٹومی۔ آدمی اپنے رشتوں سے کٹ کر نامعتبر ہو جاتا ہے۔ بے وقعت ہو جاتا ہے۔

ہر لڑکی کو شاید یہی فیصلہ کرنا چاہئے ٹومی جو تم نے کیا ہے مگر اس دل کا کیا کروں جو خود غرض ہے۔“

اور وہ بھی سوچتی اس دل کا کیا کرے جس کی ہر دھڑکن میں عادل علی بس گیا تھا۔

”کیا بات ہے ام طبیعت تو ٹھیک ہے؟“

چھوٹی آپا نے غور سے اسے دیکھا۔

”جی بس یونہی دل نہیں چاہ رہا ٹھننے کو۔“



کبھی کبھی اس پر یونہی قنوطیت طاری ہو جاتی تھی۔ ہر چیز سے دل اچاٹ ہو جاتا۔ نہ نماز پڑھنے کو دل چاہتا۔ کیا ملا ہے نمازیں پڑھ پڑھ کر ٹکریں مار مار کر خدا جو بہت قریب ہے مگر جو بہت دور ہے۔ دور ہو گیا ہے اپنے بندے کے دل سے وہ سوچتی اور کبھی کبھی

یوں ہو تاکہ وہ سارا وقت جانماز بچھائے بیٹھی رہتی اور چھل چھل آنسو اس کی آنکھوں سے بہتے رہتے اور سجدے کی جگہ اس کے آنسوؤں سے بھیگ جاتی اور چھوٹی آپا اس کی یوں بے وقت کی نمازوں سے بولا جاتیں۔

”زوال کا وقت ہے ام۔“

وہ اسے ٹوکتیں مگر وہ یونہی جانماز بچھائے پتا نہیں اپنے رب سے کیا کیا مانگتی رہتی۔ چھوٹی آپا غور سے اسے دیکھ رہی تھیں انہوں نے پھر نماز پڑھنے پر اصرار نہیں کیا تھا۔

”کیا شکور کی دلہن نے تم سے کچھ کہا؟“

”نہیں تو۔“

وہ ہولے سے ہنسی۔

”آپ میرے لئے پریشان نہ ہوا کریں چھوٹی آپا۔ اور پھر بھلا وہ کیا کہے گی۔“

اور سچ تو یہ تھا کہ ان کی ہر بات اس کے حق میں جاتی تھی اگر وہ ہر آنے جانے والے سے یہ نہ کہتی پھر تیں کہ اسے کوئی سایہ ہے کوئی بلا چٹ گئی ہے تو شاید اب تک وہ اس گھر سے رخصت ہو چکی ہوتی اور عادل علی کی یادوں سے انصاف نہ کر پاتی اس نے سوچا۔

”ام!“ چھوٹی آپا اس کے قریب ہی بیٹھ گئیں۔

”تمہارے معاملے میں کبھی کبھی میں خود کو مجرم سمجھنے لگتی ہوں۔ اگر میں میاں جی سے ضد کر کے تمہیں اسکول اور پھر کالج نہ بھیجتی تو شاید تمہیں۔“

”نہیں چھوٹی آپا پلیز ایسا مت سوچیں علم نے مجھے شعور دیا ہے آگئی دی ہے۔“

”مگر تم خود ہی تو کہتی ہو کہ آگئی کرب بخشتی ہے لا علمی اچھی چیز ہے۔“

”چھوٹی آپا۔“

اس نے بے بسی سے انہیں دیکھا۔

”ہاں کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ شعور کی منزلوں کی آگئی دل کو اذیت دیتی ہے

کرب بخشی ہے مگر اسے تو بہت، اس نے بات ختم کر کے انہیں دیکھا اور سوچا۔

”بے حساب ایسی چاہت جو میرا نصیب نہ تھی اتنی محبت میری طرف سے زیادہ تھی۔“

اور یہ خزانہ محبت کی یہ متاع سارے دکھوں سارے غموں سے زیادہ قیمتی ہے

چھوٹی آپا آپ کو کیا پتہ درد محبت کا یہ دکھ کتنا بے بہا ہے۔ کتنا قیمتی ہے۔“

”پھر بھی ام میں کبھی کبھی ایسا سوچتی ہوں۔“

”نہیں چھوٹی آپا آپ ایسا مت سوچا کریں پلیز۔“ اس نے التجا کی۔

چھوٹی آپا نے تاسف سے اسے دیکھا۔

وہ کتنی کمزور کتنی لاغر ہو گئی تھی۔ تین سالوں میں اس کے گالوں کے گلاب مکلا کر

رہ گئے تھے۔ آنکھوں کے گرد حلقے سے پڑ گئے تھے۔

”تم نے جب سے پڑھائی چھوڑی ہے بہت کمزور ہو گئی ہو خوش رہا کرو ام۔“

انہوں نے سمجھایا۔

”خوش تو ہوں چھوٹی آپا!“

”ایسے خوش ہوتے ہیں۔“

چھوٹی آپا نے خفگی سے کہا اور پھر جیسے اپنے آپ سے بولیں۔

”کبھی کبھی سوچتی ہوں میاں جی نے غلطی کی عادل بہت اچھا لڑکا تھا۔“

”عادل۔ عادل علی۔“

اس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔

”یہ آپ نے کس کا نام لے دیا۔ وہ ایک شخص جو روح میں سما گیا ہے بھلائے

نہیں بھولتا۔“

”تم پڑھی لکھی تھیں، سمجھ دار تھیں پھر تم نے میاں جی سے یہ کیوں نہ کہہ دیا کہ

وہ لوگ اچھے ہیں اور۔“

چھوٹی آپا نے کچھ سوچتے ہوئے پوچھا۔

اس نے زخمی نظروں سے انہیں دیکھا۔

”میں نے آپ سے وعدہ کیا تھا چھوٹی آپا کہ میں آپ کو کبھی میاں جی کے سامنے نام

نہیں ہونے دوں گی اور میں نے آپ کو میاں جی کے سامنے نام نہیں ہونے دیا بس۔“

اور اس کا کرب جیسے ان کے دل میں اتر آیا۔ انہوں نے اس سے کبھی کچھ نہیں

پوچھا تھا نہ اس نے کبھی کچھ بتایا تھا اور آج یکا یک تین سالوں بعد اچانک خود بخود ہی

چھوٹی آپا کو ادراک ہو گیا تھا کہ کون سا دکھ اسے اندر ہی اندر کھائے جا رہا ہے اور کس

غم نے اس کو مر جھا کر رکھ دیا ہے وہ کیوں سارا دن چپ بیٹھی خلاؤں میں ٹکا کرتی ہے۔

کمرے میں اندھیرا ہو گیا تھا چھوٹی آپا نے اٹھ کر لائٹ جلائی۔ تب ہی عبد الماجد

نے اندر جھانک کر دیکھا۔

”آپ یہاں ہیں چھوٹی آپا۔“

”ارے ماجد بیٹا تم۔“

چھوٹی آپا نے اس کے ہاتھ سے بیگ لے لیا۔

”کیسے آگئے اچانک۔“

”بس چھوٹی آپا مجھے نوکری مل گئی ہے۔ قریب ہی گاؤں کے ہسپتال میں۔ میں نے

سوچا وہاں جانے سے پہلے مل آؤں۔“

”خدا تیرا شکر ہے۔“

چھوٹی آپا کی آنکھیں خوشی سے چھلک پڑیں۔

یہی تو چاہا تھا انہوں نے عبد الماجد کے لئے اور عبد الماجد نے ان کے خوابوں کو

پورا کیا تھا۔ ام کلثوم نے محبت پاش نظروں سے اسے دیکھا۔ اونچا لمبا گورا چٹا۔ عبد الماجد

جو ڈاکٹر بن گیا تھا اس کے مزاج میں بڑی حلیمی تھی نگاہ جھکا کر بات کرتا تھا لہجے میں

نرم تھی، پانچوں وقت پابندی سے نماز پڑھتا اس کے گول چہرے پر چھوٹی سی داڑھی

بڑی جرج رہی تھی شاید یہ چھوٹی آپا کی تربیت تھی یا پھر ان کی وہ دعائیں بارگاہ ایزدی میں

قبول ہوئی تھیں جو راتوں کو جاگ جاگ کر انہوں نے اس کے لئے کی تھیں۔ روز و کر

سجدوں میں گر کر کہ۔

وہ میاں جی کے سامنے شرمسار نہیں ہونا چاہتی تھیں۔ اور میاں جی نے بھی اپنا

وعدہ نبھایا تھا۔ کبھی عبد الماجد کے معاملے میں دخل نہیں دیا تھا۔ میاں جی اولاد میں

سب سے زیادہ بامراد کامیاب اور مطمئن شاید وہی تھا۔ خدا اسے ہمیشہ خوش رکھے۔

ام کلثوم نے دعا کی۔

اور ہاں چھوٹی آپا عبد الحفیظ ملا تھا ایک دن۔“

عبد الماجد نے بیٹھتے ہوئے بتایا۔

”عبد الحفیظ ملا تھا تجھے کہاں کیسا تھا؟“

ام کلثوم نے بے قراری سے پوچھا۔ پتا نہیں کیوں اسے بھائیوں میں عبد الحفیظ سے

سب سے زیادہ پیار تھا وہ تھا بھی تو اس سے دو برس چھوٹا کئی بار وہ اور عبد الحفیظ میاں جی

سے چوری چھپ کر چھت پر چلے جاتے تھے اور اوٹ پٹانگ کھیل کھیلتے۔ عبد الحفیظ نے

کئی بار اس کے ساتھ گڑیوں کا بیاہر چاتا تھا اور وہ کئی بار اس کے ساتھ گلی ڈنڈا اور کچے

کھیلے تھے۔

”عبد الحفیظ نے بچپن میں میاں جی سے بہت مار کھائی تھی مگر جب وہ ہاسٹل سے

واپس آئی تھی تو اس نے دیکھا تھا وہ سدھر گیا تھا اس نے داڑھی رکھ لی تھی۔ شرعی

طریقے سے شلوار باندھتا، مسجد جاتا مگر پھر ایک دن اسے پتا چلا کہ میاں جی سے چھپ

کر وہ اب بھی فلم دیکھنے چلا جاتا ہے پھر ایک دن دینودھوبی کی بیٹی گھر سے بھاگ گئی۔

اس رات عبد الحفیظ بھی گھر پر نہیں تھا دینو نے عبد الحفیظ کا پوچھا، عبد الحفیظ گھر پر نہ تھا۔

”وہ ہی لے بھاگا ہے میاں جی میری بیٹی کو میں نے ایک دو بار خود اسے میزاں سے باتیں کرتے دیکھا تھا۔“

اور میاں جی زمین میں گڑ گئے۔

ولی کے گھر بھی تو شیطان پیدا ہو جاتا ہے۔

اور میاں جی زخمی شیر کی طرح دھاڑنے لگے۔ اور ہمیشہ کی طرح عبدالحفیظ فلم دیکھ کر ایک دوست کے گھر گیا اور صبح سویرے مسجد میں عبدالحفیظ کو دیکھ کر میاں جی آپے سے باہر ہو گئے۔

”کہاں ہے دینو کی بیٹی؟“

اور عبدالحفیظ مسجد سے میاں جی کی مار کھا کر ایسا گیا کہ پھر مڑ کر گھر نہ آیا۔ وہ کتنا کتنا روتی تھی اس کے لئے اور جس روز دینو کی بیٹی نور و قصائی کے ساتھ بیاہر چا کر گھر لوٹ آئی تو اس روز اس کا دل چاہا تھا کہ میاں جی سے جا کر کہے انہیں بتائے کہ دینو کی بیٹی تو خود نور و قصائی کے ساتھ چلی گئی تھی میاں جی اور آپ نے عبدالحفیظ کو کس جرم کی پاداش میں گھر سے نکال دیا۔ مگر اس روز میاں جی خود شرمندہ سے عبدالمتمین سے پوچھ رہے تھے۔

”تم نے کبھی عبدالحفیظ کے دوستوں سے اس کا پتا پوچھا اور وہ میاں جی سے کچھ بھی نہ کہہ سکی تھی۔“

”تم نے اسے گھر آنے کے لئے نہیں کہا تھا۔“

چھوٹی آپا نے پوچھا۔

”وہ گھر آنے کے لئے تیار نہ تھا چھوٹی آپا۔“

”وہ ٹھیک تو تھا نا ماجد پلیر بتاؤ اس نے میرا پوچھا تھا۔“

”وہ ٹھیک نہیں تھا کلثوم آپا بہت کمزور اور بیمار تھا۔“ عبدالماجد نے افسردگی سے کہا۔

”اسے کچھ لوگ نشے کی حالت میں ہسپتال میں لائے تھے میں نے اس سے کہا تھا کہ وہ گھر نہیں جانا چاہتا تو میرے پاس رہے۔ رات کو اسے میں ہاسپٹل میں چھوڑ کر گیا تھا مگر جب صبح میں آیا تو وہ وہاں نہیں تھا۔ اور پھر وہ مجھے نہیں ملا میرے دوست نے اور میں نے اسے بہت ڈھونڈا۔ اسے صرف آپ کا پوچھا تھا کلثوم آپا اور آپ کے لئے دعائیں بھیجی تھیں۔“

اور آنسو بے اختیار ام کلثوم کی آنکھوں سے بہہ نکلے۔

پتا نہیں میاں جی نے کہاں غلطی کی تھی اس نے دکھ سے سوچا۔ مگر غلطی کہیں ہوئی ضرور تھی۔ ابتداء میں شروع میں کہیں۔

”اب اگر وہ ملا تو میں اسے بھاگنے نہیں دوں گا ویسے اگر میاں جی اسے خود ڈھونڈتے اسے گھر لے آتے تو شاید وہ آجاتا اب تک۔ مگر میاں جی تو ٹوٹ ٹوٹ کر اور بھی سخت ہو گئے تھے عبدالحفیظ چلا گیا تھا بس عبد الشکور تھا جو ان کے نقش قدم پر چل رہا تھا وہ بیمار ہوتے تو وہ امامت بھی کرتا، میاں جی صرف اس سے خوش تھے بس عبدالماجد کے معاملے میں خاموش رہتے۔ البتہ عبدالحفیظ کا نام آتے ہی جلال میں آجاتے تھے پھر۔ پھر بھلا وہ اسے کیسے منا کر لاتے۔“

”غلطی تو میاں جی کی ہی تھی نا۔“

عبدالماجد نے آہستگی سے کہا۔

”وہ کہہ رہا تھا کہ دینو کی بیٹی سے دو ایک بار اس نے ہنسی مذاق ضرور کیا تھا لیکن اسے ساتھ لے کر کہیں نہیں گیا تھا اور چھوٹی آپا میں نے اسے نہیں بتایا تھا کہ دینو کی بیٹی تو اس کے جانے کے دو دن بعد ہی آگئی تھی۔ پتا نہیں کیوں چھوٹی آپا میری ہمت ہی نہیں ہوئی۔“

اور اس کے آنسو تو اتر سے بہتے رہے۔

عبدالماجد نے اٹھ کر بڑی نرمی سے اس کے آنسو پونچھے اور اسے تسلی دی۔

چھوٹی آپا اس کے لئے چائے بنا کر لے آئیں اور چائے پیتے ہوئے وہ ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا اور اس کے دل پر چھایا تکدر کسی حد تک دور ہو گیا تھا اور وہ بڑے دھیان سے اس کی باتیں سن رہی تھی کہ باتیں کرتے کرتے اچانک اس نے بیک اپنی طرف کھینچا۔

”ارے ہاں کلثوم آپا وہ آپ کی سہیلی تھیں نا اسماباجی وہ مجھے ایک روز ملی تھیں یہی کوئی تین چار روز پہلے کی بات ہے وہیں ساہیوال میں اور ان کے ساتھ ان کے بھائی بھی تھے۔

وہ کیا نام تھا ان کا؟

”عادل۔ عادل علی۔“ اس کا رواں رواں بول اٹھا مگر لب خاموش تھے۔ اس کا دل چاہا وہ یونہی کہتی رہے عادل، عادل اور اس نام کی مٹھاس اس کی رگوں میں پھیلتی جائے۔

”عادل علی۔“ چھوٹی آپا نے بتایا۔

”ہاں وہی عادل بھائی۔ بڑی اچھی طرح ملے۔ اسماباجی نے گھر آنے کے لئے کہا تھا لیکن میں نے جانا مناسب نہیں سمجھا۔ اسماباجی آپ کا پوچھ رہی تھیں میں نے بتایا تھا کہ آپ گھر پر ہی ہوتی ہیں اور بہت کمزور ہو گئی ہیں۔ کافی گپ شپ رہی وہیں ایک کیفے میں بیٹھے رہے۔ میں نے بتایا تھا کہ میں دو تین روز میں جا رہا ہوں تو کل شام وہ پھر ہاسپٹل آگئے اسماباجی نے آپ کے لئے خط دیا تھا۔

اس نے بیک سے بند لفافہ نکال کر کلثوم کو دیا۔

”اسماباجی کی شادی ہے۔ غالباً آپ کو انوائٹ کیا ہو گا۔“

ام کلثوم نے خط لے لیا اور اس کے ہاتھوں میں ہلکی سی لرزش تھی اور اس کی نگاہیں عبدالماجد کے چہرے پر ٹکی تھیں ان آنکھوں نے اسے دیکھا ہو گا پتا نہیں وہ کیسا تھا۔

کیسا ہو گیا ہو گا۔

”کیا دیکھ رہی ہیں کلثوم آپا۔“

”کچھ نہیں۔“

اس نے جھینپ کر نگاہیں جھکا لیں اور خط کھولنے لگی۔

عبدالماجد اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

”میں ذرا میاں جی کے پاس جا رہا ہوں شاید وہ آگئے ہیں۔“

اور خط پڑھتے پڑھتے ام کلثوم کا چہرہ سفید پڑ گیا یوں جیسے کسی نے جسم سے سارا خون نچوڑ لیا ہو اور چہرے پر ایسی اذیت تھی جیسے کوئی روح کھینچے لے جا رہا ہو۔

”ام۔“

”ام۔ کیا ہوا؟“

چھوٹی آپا نے اس کے چہرے کے بدلتے رنگوں کو دیکھ کر پوچھا۔

”اسما کے گھر تو سب خیریت ہے۔“

”جی۔“

اس نے سر ہلایا اور افسردگی سے چھوٹی آپا کی طرف دیکھا اب وہ انہیں کیا بتاتی کہ اسما کے گھر تو سب خیریت سے ہے البتہ وہ میرے نصیب کی بارشیں کسی اور چھت پر برس گئیں۔ خط اس نے اپنی مٹھی میں دبا رکھا تھا اور دل میں طوفان سے اٹھ رہے تھے پھر یکایک وہ اٹھی اور تیزی سے باہر نکل گئی۔ چھوٹی آپا حیرت سے اسے یوں جاتے اسے دیکھتی رہیں۔

”یہ یکایک اسے کیا ہو گیا ہے پتا نہیں اسما نے کیا لکھا ہے۔“ انہوں نے سوچا اور اس کے پیچھے ہی باہر آگئیں مگر پھر اس کے کمرے کے دروازے پر ہی ٹھنک کر رک گئیں۔ وہ دونوں ہاتھوں میں منہ چھپائے بلک بلک کر رو رہی تھیں۔ چھوٹی آپا یونہی لمحہ بھر دروازے پر کھڑی سوچتی رہیں پھر واپس لوٹ آئیں۔

”اچھا ہے وہ جی بھر کر رو لے۔ دل پر چھایا غبار دھل جائے گا وہ نہ جانے کتنی دیر تک یونہی روتی رہی پھر اس نے پسینے میں بھیکے ہوئے خط کو کھولا۔ ایک بار دو تین بار نہ جانے کتنی بار اس نے اسے پڑھ ڈالا یہ اسی دشمن جاں کا خط تھا اس کی تحریر تھی جو اس کے دل میں چھپا بیٹھا تھا اور رگ رگ میں لہو بن کر دوڑ رہا تھا۔ اس نے لکھا تھا۔

”ٹومی اگر تم وعدہ کرو کہ تم میرا انتظار کرتی رہو گی تو میں زندگی کے آخری لمحے تک تمہارا انتظار کروں گا۔ کبھی تو وقت ہمارے اختیار میں ہو گا تو ماخواہ وہ عمر کے آخری چند سال ہی کیوں نہ ہوں۔ اگر مجھے کوئی ایسی امید ہو ٹومی تو۔“

اس نے بہت کچھ لکھا تھا اپنی بے قراریاں اپنی بے تائیاں اور یہ سب پڑھ کر اس کا دل انجانی سی مسرت سے بھر گیا تھا۔

تو وہ اب بھی میرے لئے سوچتا ہے اور میرے لئے زندگی اور موت کی بازی کھیل سکتا ہے۔

لیکن اسما کے خط نے یہ طمانیت چھین کر اس کے اندر مزید بے چینیاں بھر دی تھی اسما نے لکھا تھا۔

”ٹومی کل بڑے عرصہ بعد ماجد ملا، کاش وہ نہ ملتا زندگی کے ٹھہرے ہوئے سمندر میں ایک بار پھر طوفان آگیا ہے۔ عادل کو سنبھلنے میں بڑے دن لگے تھے مگر اب وہ سنبھل رہا تھا۔ سنبھل گیا تھا اور وہ جس نے صرف تمہاری تمنا کی تھی اب چند دنوں بعد کسی اور کو دلہن بنا کر لا رہا ہے محض دوسروں کے لئے کہ وہ چار گھروں کی امید ہے اور اس خاندان کا اکلوتا چراغ ہے، تمہیں پتا ہے کہ میرے تینوں بچوں میں سے کسی کے ہاں اولاد نہیں ہے۔ لیکن ماجد نے اسے پھر بکھیر دیا ہے یہ جان کر کہ ابھی تمہاری شادی نہیں ہوئی تم بیمار ہو کمزور ہو۔ اس نے پھر سے خواب بننے شروع کر دیئے ہیں اور تم جانتی ہو یہ خواب پورے نہیں ہوں گے۔ وہ تمہیں خط لکھ رہا ہے مگر میں تمہاری

منت کرتی ہوں ٹومی میرے بھائی کو اپنی محبت کے حصار سے آزاد کر دو، پلیز ٹومی اس کے خط کا جواب مت دینا۔

میں تمہیں قصور وار نہیں ٹھہراتی ٹومی یہ مقدر کے کھیل ہیں لیکن خدا اب اس کی زندگی میں مت آنا۔“

اور اس نے لکھا تھا۔

”ٹومی میں تمہارے خط کا انتظار کروں گا اور اگر تم نے مجھے دس دن تک خط نہ لکھا تو۔“

تو وہ اجنبی لڑکی جسے میں نے آج تک نہیں دیکھا میری زندگی میں شامل ہو جائے گی مجھے مایوس نہ کرنا ٹومی۔

کیا کرے۔ کیا کرے وہ۔

اس نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا اور آنسو ایک بار پھر اس کی آنکھوں میں جمع ہونے لگے۔ اور جب چھوٹی آپا کام سے فارغ ہو کر آئیں تو وہ آنکھیں موندے بے سدھ پڑی ہوئی تھی۔

”تم نے کھانا نہیں کھایا ام۔“

چھوٹی آپا نے اس کی پیشانی کو چھوا اور چونک پڑیں۔

”ارے تمہیں بخار لگتا ہے ام۔“

اس نے اپنی جلتی ہوئی آنکھیں کھول کر ذرا کی ذرا چھوٹی آپا کو دیکھا اور سوچا۔

”میرا تو سارا وجود ہل رہا ہے چھوٹی آپا۔“

ایسا دکھ ایسا ایسا کرب تو اس نے تب بھی محسوس نہیں کیا تھا جب وہ آخری بار اس سے مل رہی تھی پھر یہ آج کیوں دل کٹ کر گر رہا تھا۔

”ماجد کو بلاتی ہوں۔“

”نہیں چھوٹی آپا میں ٹھیک ہوں۔“

”ارے کہاں ٹھیک ہے تو دیکھ تو چہرہ کیسا ہو رہا ہے بخار بہت تیز ہے۔ میں بلائی ہوں عبد الماجد کو۔“

وہ پھر باہر کی طرف بھاگیں۔

اس نے اپنی دہکتی ہوئی آنکھوں کو کھولا بند کیا۔

”اور میں نے تمہیں اپنی محبت کے حصار سے آزاد کر دیا۔ عادل علی۔“

اس نے زور سے آنکھیں بھیجن لیں تاکہ اب آنسو نہ نکل سکیں لیکن دل جیسے اندر

ہی اندر روتے ہوئے ڈوبتا چلا گیا۔



نماز پڑھ کر ام کلثوم نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے مگر ہونٹ تھر تھرا کر رہ گئے کیا مانگے۔ یہ سب کچھ کتابے کار اور بے فائدہ ہے۔ دعاؤں کی قبولیت پر اس کا یقین نہیں رہا تھا مگر پھر بھی وہ دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے ہوئے تھی۔ مگر مانگنے کے لئے کہنے کے لئے کچھ نہیں، لفظ منجد سے تھے اور حرف گو نگے ہو گئے تھے۔ کیا دعا مانگے وہ کس کے لئے مانگے میاں جی کے لئے جو بیمار تھے۔ عبد الحفیظ کے لئے جو لاپتا تھا۔ عادل علی کے لئے اس کے سکون کے لئے یا پھر۔ یا پھر اپنے لئے۔ مگر اپنے لئے تو ایک بار پہلے بھی اس نے مانگ کر دیکھا تھا کیا ملا تھا اسے کچھ نہیں وہ تو خالی ہاتھ تھی۔ کتنے یقین کتنے مان سے اس نے ہاتھ اٹھائے تھے لیکن کیسے کرچی کرچی ہو گیا تھا اس کا یقین۔

”اے خدارب کعبہ ایک بار پہلے بھی۔“

اک دعا نے اٹھ اٹھ کر کتنی بے قراری سے۔

تجھ کو یوں پکارا تھا۔

آج پھر دعالب پہ

آ کے تھر تھراتی ہے۔

وہ یو نہی ہاتھ اٹھائے بیٹھی رہی۔

اے خدارب کعبہ

اور تجھ سے کیا مانگوں۔

اس نے بے بسی سے ہاتھ نیچے گرا دیا اور مڑ کر چھوٹی آپا کی طرف دیکھا۔

”ہم دعائیں کیوں مانگتے ہیں چھوٹی آپا جب وہ قبول نہیں ہوتی ہیں۔“

”ایسے نہیں کہتے۔“

چھوٹی آپا نے اسے تنبیہ کی۔ اس کا جی چاہا وہ ان سے احتجاج کرے بحث کرے اور

ان سے کہے وہ صحیح کہتی ہے ان کی دعائیں قبول نہیں ہوتیں انہیں وہ اسم اعظم نہیں آتا کہ۔

”میاں جی زیادہ ہی بیمار ہیں۔“

چھوٹی آپا نے جیسے ہی اطلاع دی۔ اس نے چونک کر چھوٹی آپا کی طرف دیکھا اور جا

نماز تہہ کر کے ہو لے ہو لے چلتی ہوئی اپنے بستر پر آکر بیٹھ گئی۔ ٹانگیں آہستہ آہستہ

کانپ رہی تھیں۔ شاید ابھی کمزوری باقی تھی۔ چند دن کے بخار نے جیسے اس کا لہو نچوڑ

لیا تھا۔ میاں جی بھی اچانک بیمار پڑ گئے تھے اور عبد الماجد بھی چھٹی لے کر آ گیا تھا۔

”کیا میاں جی کی طبیعت زیادہ خراب ہے۔“

”ہاں۔ مجھے وہ کچھ ٹھیک نہیں لگتے۔“

چھوٹی آپا نے افسردگی سے کہا۔

”تم تو اپنے حواسوں میں نہیں تھیں میاں جی کی حالت بہت خراب ہو گئی تھی۔“

حواسوں میں تو وہ اب بھی نہیں تھی۔ لگتا تھا جیسے سارا وجود خالی خالی ہو گیا ہو۔

عجیب بے کلی سی تھی۔ حالانکہ اس نے عادل علی کو خط نہیں لکھا تھا اور اپنی محبت کے

حصار سے آزاد کر دیا تھا لیکن خود اس کی محبت کا حصار اس کے گرد جنگ ہو تا جا رہا تھا اور

”قصور ہے بڑی آپا قصور ہے۔“

ام کلثوم نے دل ہی دل میں احتجاج کیا۔ اگر میاں جی نور الامین کو مجبور نہ کرتے کہ وہ چھوٹی آپا کو باہر لے کر نہ جائے یہ نہ کرے وہ نہ کرے تو آج چھوٹی آپا اپنے گھر ہوتیں اور۔

”لوگ آکر واپس کیوں چلے جاتے ہیں امت الرشید۔ میری ام کلثوم میں کیا عیب ہے۔“

ان کی آواز میں شکستگی تھی اور تھکن۔ ”کوئی عیب نہیں میاں جی بس وہ۔“
”وہ کیا بتاؤ نابالو۔“

”وہ میاں جی عبدالشکور کی دلہن ہے ناہر آنے والے سے یہی کہتی ہے کہ کلثوم کو سایہ ہے۔ پہلے دورے پڑا کرتے تھے اور اب وہ چپ چپ رہتی ہے۔“

”کوئی سایہ نہیں بیماری تھی تم تو جانتی ہو امت الرشید ڈاکٹر کے کہنے پر باہر بھیجا تو ٹھیک ہو گئی اب اتنے سالوں سے تو کوئی دورہ نہیں پڑا پھر۔“

”کیا کہوں میاں جی۔“

بڑی آپا چپ ہو رہیں۔

”کچھ لوگ آئیں گے دو تین دنوں تک اسے دیکھنے دھیان رکھنا۔“

”اسما کے گھر والے بھی تو اچھے لوگ تھے میاں جی اور خواہش مند بھی تھے۔“ بڑی آپا نے آہستگی سے کہا۔

”ذات برادری الگ تھی کیا کرتا۔“

امت الرشید اب زیادہ دیر نہیں ہونی چاہئے پہلے ہی کافی دیر ہو گئی ہے۔ مجھے ڈر

ہے کہ یہ مرض، مرض الموت ہی نہ ہو اور میں۔“

ام کلثوم نے آہستگی سے دروازہ کھولا اور باہر نکل آئی۔

وہ خود ہی اس دائرے سے باہر نہیں نکلنا چاہتی تھی۔

”میاں جی اس وقت سو رہے ہوں گے۔“

”نہیں جاگ رہے تھے ابھی وہاں سے ہی آئی ہوں۔“ انہوں نے بتایا۔

”میں میاں جی کو دیکھ آؤں۔“

”تم ابھی زیادہ چلو پھرو نہیں کمزور ہو۔“

”آپ کو کیا پتا میں کتنی مضبوط ہوں ورنہ اتنا بڑا غم کیسے سہار پاتی۔“

میاں جی ہولے ہولے کراہ رہے تھے بڑی آپا ان کے سر ہانے بیٹھی ان کا سر دبا رہی تھیں۔ وہ خاموشی سے ان کے پانکتی جا کر بیٹھ گئی۔

”کون ام کلثوم؟“

”جی میاں جی کیسی طبیعت ہے آپ کی۔“

”جس حال میں وہ رکھے ٹھیک ہے، تمہاری طبیعت اب ٹھیک ہے۔“

”جی میاں جی۔“

میاں جی ہولے ہولے کراہتے رہے اور وہ خاموشی سے بیٹھی رہی۔

”جاؤ آرام کرو۔“

کچھ دیر بعد میاں جی نے کہا تو وہ اسی خاموشی سے اٹھ کھڑی ہوئی مگر پھر دروازے

کے پاس ہی ٹھٹھک کر رک گئی میاں جی کہہ رہے تھے۔

”مجھے ام کلثوم کی بڑی فکر ہے امت الرشید۔“

”کیسی فکر میاں جی۔“

”کوئی رشتہ نہیں مل رہا۔ لوگ کیا کہتے ہوں گے امت الرشید کہ بڑا مذہبی بنتا ہے

لیکن جوان بیٹی کو گھر بٹھار کھا ہے پہلے بہنیں ہمیشہ کے لئے گھر بیٹھ گئیں پھر۔“

”اس میں آپ کا کیا قصور میاں جی۔“ یہ تو مقدر کی بات ہوتی ہے۔“

”کیا خبر میاں جی اس مرض میں چل بسیں۔“

بس لمحہ بھر کے لئے اس کے ذہن میں خیال آیا تو پھر تو کوئی رکاوٹ نہیں ہوگی اور ابھی دس دن نہیں ہوئے تھے ابھی عادل علی کو اس کے خط کا انتظار ہو گا وہ اسے لکھ دے مگر پھر دوسرے ہی لمحے اسے اپنی سوچ کی کمینگی پر دکھ ہوا۔ اور وہ کتنی ہی دیر تک دل میں میاں جی کی زندگی اور سلامتی کی دعا مانگتی رہی۔



یہ جو فاصلوں کی صلیب ہے۔

یہ گڑی ہوئی ہے کہاں کہاں۔

ام کلثوم نے کاپی پر آڑی ترچھی لکیریں مارتے ہوئے سوچا۔

تو دس دن کب کے گزر گئے اور تم بالآخر میرے خط کا انتظار کر کے مایوس ہو گئے

عادل علی۔

”میرے آسمان سے کدھر گئی۔

تیرے التفات کی کہکشاں۔“

اس نے زیر لب کہا۔

”تو اب شاید تم اس اجنبی لڑکی کو اپنی زندگی میں داخل کر لو گے جس کے بارے

میں تم نے کبھی نہیں سوچا تھا اور وہ کتنی خوش قسمت ہوگی۔“

اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ باہر گلی میں بچے شور مچا رہے تھے۔ ہم تم کو لینے آئیں

گے آئیں گے۔“

”نہیں اب تم کبھی نہیں آؤ گے۔ عادل علی کبھی نہیں انتظار کی جوت تو میں نے

خود بھائی ہے۔“

اس نے اٹھ کر کھڑکی بند کر دی۔

اور اب شاید میری قسمت کا بھی فیصلہ ہو جائے گا۔ میاں جی نقاہت اور بیماری کے باوجود دوسرے کمرے میں مہمانوں سے بات کر رہے تھے اور انہیں یقین تھا کہ بات بن جائے گی مگر بات بنی نہیں تھی۔

اور وہ بند کھڑکی کی چوکھٹ پر سر رکھے ان آوازوں کو سننے کی کوشش کر رہی تھی جو کھڑکی سے ٹکرا کر واپس لوٹ جاتی تھیں۔

بات نہیں بنی تھی اور میاں جی پریشان سے چھوٹی آپا کو دیکھ رہے تھے۔

”حامد بھائی نے بھی رشتہ بھجوایا ہے امت الحبیب مگر وہ ادلے بدلے کی شادی کرنا

چاہتے ہیں۔“

”پھر؟“

چھوٹی آپا نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا۔

”میرا خیال ہے عبدالماجد اور ام کلثوم۔ دونوں کے لئے ہاں کر دوں۔“

”مگر ماجد کی مرضی کے بغیر، وہ نہ مانا تو۔“

”کیسے نہیں مانے گا۔“

میاں جی جلال میں آگئے۔

”نہیں میاں جی اس کی مرضی کے خلاف میں اسے مجبور نہیں کروں گی۔“

اور میاں جی کا تناہوا چہرہ ڈھیلا ہو گیا۔

وہ عبدالماجد کے حق میں دستبردار ہو گئے تھے انہوں نے کبھی دخل نہیں دیا تھا پھر۔

”اچھا بات کر لینا تم۔“

انہوں نے نرمی سے کہا اور چھوٹی آپا نے عبدالماجد سے بات کر لی۔

”تم کسی کو پسند تو نہیں کرتے ماجد۔“

”نہیں چھوٹی آپا۔“

وہ پڑھی لکھی نہیں ہے لیکن اچھی لڑکی ہے ایک آدھ بار میں نے اسے دیکھا ہے پھر عورت کا کیا ہے۔ موم سے بنی ہوتی ہے جس سانچے میں مرد چاہے اسے ڈھال سکتا ہے۔
”ٹھیک ہے چھوٹی آپا۔ مگر لڑکا۔“

”لڑکا اچھا ہے میاں جی کو پسند ہے نمازی پر بیزگار ہے۔“ اور بات بھی طے ہو گئی اتنے سارے سالوں اور انتظار کے بعد بالکل اچانک۔

اور کھڑکی کی چوکھٹ پر سر رکھے رکھے کلثوم کو یوں لگا جیسے اس کا وجود یکایک پتھر کا ہو گیا ہو بے جان اور بے حس۔

اور وہ یونہی بے حسی سے سب کچھ دیکھتی رہی۔ پرانے بکسوں سے چھوٹی آپا اور بڑی آپا کے جہیز کی ریشمی رضائیاں اور چادریں نکل آئیں۔ مگر اس نے کسی چیز میں حصہ نہیں لیا بس چپ چاپ دیکھتی رہی کئی بار اس کا جی چاہا وہ چھوٹی آپا کے قدموں سے لپٹ جائے اور کہے۔

”مجھے اپنے قدموں سے جدا نہ کیجئے چھوٹی آپا۔ لیکن وہ کچھ بھی نہ کہہ سکی شاید جاننتی تھی کہ اس کا ردنا بیکار ہے رخصتی سے ایک شام پہلے اس نے عادل علی کا پہلا اور آخری خط نکالا پڑھا آنکھوں سے لگایا اور پھر اس کی راکھ پانی میں بہادی مگر محبت کی ہنگامی دل کے اندر کہیں سلگ رہی تھی۔ تپش تھی مگر آگ نظر نہیں آرہی تھی۔ عجیب سی مدہوشی طاری تھی اس پر، کب بارات آئی، کب رخصتی ہوئی ایجاب و قبول ہوئے۔ اسے کچھ خبر نہیں تھی۔ البتہ جب چھوٹی آپا نے اسے کمرے میں بٹھا کر اس کا مونگھٹ صحیح کیا تو وہ چونکی۔ چھوٹی آپا کی آنکھیں نم تھیں اور آواز گلو گلو گئی۔“

”اچھا ام خدا حافظ۔“

اس نے سر اٹھا کر دیکھا یہ کمرہ اس کا نہیں تھا پھر اور اس کی آنکھوں میں وحشت سی ز آئی اس کا جی چاہا وہ چیخیں مار مار کر روئے اور کمرے سے باہر نکل جائے۔ چھوٹی آپا

نے اس کی پیشانی چومی اور اس بو سے کی ٹھنڈک جیسے اس کے سارے وجود میں اتر آئی اور اسے بڑی طمانیت اور سکون محسوس ہوا۔

”اب یہی تمہارا گھر ہے ام اس کی عزت اور وقار تمہاری عزت ہے۔“
بڑی آپا نے سمجھایا۔

”تم میرا مان رکھنا میرا سر نہ بھٹکنے دینا۔“

چھوٹی آپا نے جیسے خاموش وعدہ لیا اور اس نے سر جھکا لیا سب چلے گئے اور وہ تقی محمد کا انتظار کرنے لگی وہ شخص جو شرعی اور قانونی طور پر اس کا مالک تھا اور اب اسے صرف اسی کے بارے میں سوچنا تھا۔

”خدا حافظ۔ میری محبت۔“ اس کے لب ہلے۔ ”خدا حافظ۔“

پھر نہ جانے کتنی دیر گزر گئی تو وہ صرف تقی محمد کے بارے میں سوچتی رہی۔ دروازے پر آہٹ ہوئی۔ وہ سمٹ کر بیٹھ گئی۔ اور پھر دروازے میں کھڑے کھڑے کوئی زور سے دہاڑا۔

”جیبیہ! کہاں بھاگتی پھر رہی ہو ننگے سر کہاں ہے تمہارا دوپٹہ۔“

”جی باہر سے سہمی سہمی آواز آئی۔“

اس نے گھونگھٹ کی اوٹ سے دیکھا تقی محمد دروازے کے بیچوں بیچ کھڑا غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔

اور ام کلثوم کو لگا جیسے وہ صحرا میں کھڑی ہے ننگے سر، ننگے پاؤں اور تپتی ہوئی ریت اور جلتا ہوا سورج اسے جھلسائے دے رہے ہیں۔ اور اسے دیکھو باسط کو شلوار کے پانچے زمین پر جھاڑو دے رہے ہیں۔ ہزار دفعہ کہا ہے شرعی طریقے سے شلوار باندھا کرو ٹخنوں سے اوپر۔“

اور ام کلثوم نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری یہ کیسا صحرا ہے میرے خدا

جہاں کوئی چشمہ نہیں۔

”چٹاخ!“ وہ لرز گئی۔

جیسے میاں جی کی چھڑی عبدالحفیظ کے بدن پر پڑی ہو۔

”بچے ہیں تقی محمد۔“

”بچے نہیں ہیں اب ماں جی یہ اور حبیہ گیارہ سال کی ہو گئی ہے اب برقعہ پہنائیں

اے۔“

لہجہ میں وہی تندہی وہی تیزی۔

ام کلثوم کی ٹانگوں سے جیسے جان نکل گئی اور جسم سینے میں ڈوب گیا اور اسے یوں لگا جیسے اسے ایک ایسے زنداں میں ڈال دیا گیا ہے جس کی دیواریں لمحہ بہ لمحہ اوپچی ہوتی جا رہی ہیں۔

تقی محمد جانے کب اس کے قریب آیا اسے پتا ہی نہ چلا پھر اس نے ہولے سے اس کا گھونگھٹ الٹا اور ام کلثوم کو یوں لگا جیسے زمین اس کے پاؤں کے نیچے سے نکلتی جا رہی ہو۔ اس نے بمشکل پلکیں اٹھا کر تقی محمد کی آنکھوں میں دیکھا۔ وہ اشتیاق سے اسے دیکھ

رہا تھا۔

”ام کلثوم۔“

اس نے سرگوشی کی۔

اور پھر زمین اس کے پاؤں کے نیچے سے نکل گئی اور وہ ہوا میں معلق ہو گئی۔ اسے

لگا جیسے کوئی ان دیکھے ہاتھ اس کا گلا دبا رہے ہوں اور ہولے ہولے ان انجانے، ان

دیکھے ہاتھوں کی گرفت اس کی گردن پر سخت ہوتی جا رہی ہو۔

وہ دونوں ہاتھ گردن پر رکھ کر چلا اٹھی اور پھر چیختی چلی گئی تھی۔